U82067. Date 29.11.69

Title - INSAAN

Author - Kanshi Ram Chawla.

Publisher - Malaveeee Printing Press (Kapoor Thala)

Date - 1947.

Pages - 256.

Subjects - Akhlaqiyaat.

انسان

کانشی رام چاولہ



The Author

پریم سیریز نمبر ۳

ओ३म्

ੴ एको ब्रह्म

[illegible]

GOD—IS—ONE

انسان

مصنفہ

لالہ کانشی رام چاولہ پنشنر سپرنٹنڈنٹ

دفتر صاحب ڈپٹی کمشنر لدھیانہ

مصنف

پریم ترنگ، اناداتیاں، چشمۂ روحانیت، لطفِ زندگی، گیتا مہک، آبِ حیات وغیرہ

سنہ ۱۹۴۷ء

قیمت [illegible]

تعداد کتب مطبوعہ

نمبر شمار	نام کتاب	تعداد مطبوعہ	نمبر شمار	نام کتاب	تعداد مطبوعہ
۱	پریم ترنگ حصہ اوّل	۸۵۰۰	۱۸	گیتا ٹیک	۱۰۰۰
۲	پریم ترنگ ،، دوم	۶۵۰۰	۱۹	گیتا چیک	۱۰۰۰
۳	انسان	۸۵۰۰	۲۰	آب حیات	۱۰۰۰
۴	لطف زندگی	۵۰۰۰	۲۱	مفصّل سوانح عمری بھگوان مہاویر	۱۰۰۰
۵	چشمۂ روحانیت	۱۰۰۰			
۶	آدرش گرہست	۲۰۰۰	۲۲	شانتی منتر (ہندی)	۱۰۰۰
۷	آدرش تہذیب	۱۰۰۰	۲۳	شانتی منتر (گورمکھی)	۱۰۰۰
۸	منظوم سوانحعمری بھگوان مہاویر	۱۰۰۰	۲۴	الوسیشن آف لائف (انگریزی)	۲۰۰۰
۹	سپھل جیون	۱۰۰۰	۲۵	آپ بیتی	۱۰۰۰
۱۰	نادانیاں	۱۰۰۰	۲۶	PEACE OF MIND	۱۰۰۰
۱۱	آدرش پریوار ہندی	۱۰۰۰	۲۷	گیان گودڑی (گورمکھی)	۱۰۰۰
۱۲	اندرکا سبندر	۲۰۰۰	۲۸	سوانحعمری سوامی نرانجندجی	۱۰۰۰
۱۳	نعرۂ حق	۲۰۰۰	۲۹	سرسوتی اور لکشمی (ہندی)	۱۰۰۰
۱۴	اقوالِ شمع	۱۰۰۰	۳۰	WAY TO SUCCESS	۱۰۰۰
۱۵	گھر کا بہشت	۱۰۰۰			
۱۶	گیتا چیک	۱۰۰۰	۳۱	اسے سلجھائی	۱۰۰۰
۱۷	گیتا ٹیک	۱۰۰۰	۳۲	جین سادھو (ہندی)	۱۰۰۰

انسان

فہرست مضامین

نذر

آنکه دارد در دلش خوف خدا
آنکه هست از غم انسان دل ریش
آنکه باشد غم مردم شود
آنکه در ضمیرش غبار شر نبود
تحفهٔ ناچیز این نذرش بود

جس کے دل میں درد ہے انسان کا
جس کے دل میں خوف ہے یزدان کا
ہو برائی بھی نہ جس میں اور شر
تحفہ ناچیز ہے اس کی نذر!

(بہاول)

دیگر تصانیفِ مُصنّف

۱۔ پریم ترنگ عرف ترانۂ الفت حصہ اول۔ قیمت ایک روپیہ۔
اس میں ہندو دھرم کی تشریح، اتحاد کی برکت، اور میل ملاپ کی ضرورت بتلائی گئی ہے۔

۲۔ پریم ترنگ حصہ دوم۔ قیمت ایک روپیہ
جملہ مذہبی کتابوں کی تعلیم کا نچوڑ، سب مذاہب محبت اور خدمت کی تلقین کرتے ہیں۔

۳۔ لطفِ زندگی۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ
اس میں زندگی کو کامیاب اور پرلطف بنانے کے یقینی اور لاجواب نسخے بتائے گئے ہیں۔

۴۔ نادانیاں۔ قیمت ایک روپیہ۔
والدین، بچے، پتی پتنی اور عام آدمی اپنی زندگی میں کیا کیا نادانیاں کرتے ہیں وہ تمام مع علاج کے بتائی گئی ہیں۔

۵۔ چشمۂ روحانیت۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ
اس میں بتلایا گیا ہے روحانیت کیا ہے، اسکے فوائد کیا ہیں اور وہ کیسے حاصل کی جا سکتی ہے۔

۶۔ اتحادی شمع۔ قیمت ایک روپیہ۔
اس میں بتلایا گیا ہے کہ آجکل ہمیں کتنی ضرورت ہے اصلاح کی۔ فسادی ہندو ہیں یا مسلمان۔ فساد کیسے رک سکتے ہیں۔ اس کا ایک ایک لفظ قابل مطالعہ ہے۔

۷۔ نعرۂ حق۔ قیمت دس آنہ۔
میل ملاپ، اتحاد، پریم، حقیقی مذہب اور سچی رفاقت کے موضوعات پر ایک مہاتما کے دل کو ہلا دینے والے لیکچر۔

۸۔ اندر کا بندر۔ قیمت دس آنہ۔
من کی خاصیت اور اس کو قابو میں لانے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔

۹۔ گھر کا بہشت۔ قیمت سوا روپیہ۔
اس میں گھر کو حقیقی بہشت بنانے کے آزمودہ اور بے خطا گر بیان کئے گئے ہیں۔ ہر ایک گرہستی کو پڑھنا چاہیئے۔

۱۰۔ آدرش گرہست منظوم۔ قیمت ایک روپیہ۔
آدرش پتی پتنی کیسے ہوتے ہیں۔ والدین اور اولاد کے کیا فرائض ہیں۔ مرد بڑا ہے یا عورت۔ یہ مضمون بڑا دلچسپ اور پُر معنی ہے۔

۱۱۔ آدرش تہذیب منظوم قیمت ۸؍
اس میں بتایا گیا ہے کہ مغربی تعلیم کس طرح ہماری تباہی کر رہی ہے۔ ہماری اپنی تہذیب کتنی اونچی ہے۔ دونوں کا پر معنی مقابلہ۔

۱۲۔ آدرش پریوار (ہندی) قیمت ڈیڑھ روپیہ۔
پریوار کے ہر ایک آدمی کو کیسے رہنا چاہیئے۔ جہیز کیوں ایک لعنت ہے۔ آدرش استری پرش کے کیا اوصاف ہوتے ہیں۔ یہ کتاب ہر ایک بہن کے پڑھنے کے قابل ہے۔

۱۳۔ الومینشن آف لالف (انگریزی) قیمت دو روپیہ۔
جملہ مذاہب کی تعلیم کی لغت۔ اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف۔ انگریزی دان پبلک کے لئے بہترین کتاب ہے۔

۱۴۔ شانتی منتر (گورمکھی مجلد) قیمت آٹھ آنہ
من کی شانتی اور دنیا میں رہتے ہوئے سکھ حاصل کرنے کے سہل ترین طریقے بتائے گئے ہیں

۱۵۔ شانتی منتر (ہندی بلا جلد) قیمت چار آنہ

۱۶۔ گیتا موہک
۱۷۔ گیتا لہک
۱۸۔ گیتا چہک
۱۹۔ گیتا ٹہک

ان میں یہ بتایا گیا ہے کہ گیتا کی تعلیم کے مطابق جیون کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ گیتا کی اصلی تعلیم کیا ہے اور اس سے دونو لوک کیسے سدھر سکتے ہیں۔ قیمت فی حصہ ایک روپیہ۔

۲۰۔ آبِ حیات۔ قیمت ایک روپیہ۔ زندگی کو اونچا بنانے کیلئے لاثانی نصائح اور ہدایات کا مجموعہ۔ واقعی اسکا مضمون امرت کا گھونٹ ہے جسکو پی کر انسان مقصدِ حیات پا لیتا ہے۔

۲۱۔ آپ بیتی عرف نورانی کہانیاں۔ قیمت سوا روپیہ۔ زندگی میں چمک اور نکھار پیدا کرکے اس میں ہلچل دینے والی لاجواب کہانیاں۔ کئی سادھوؤں کی آتم کتھا۔

۲۲۔ سوانح عمری مہاویر سوامی۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ۔
بھگوان مہاویر کے مفصل سوانح حیات نیز اس میں پریم۔ اہنسا اور ستیہ کے اصولوں کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ چار صد صفحات کی کتاب ہے۔

۲۳۔ گیان گودڑی (گورمکھی) قیمت ایک روپیہ۔
دنیا میں رہتے ہوئے انسان کس طرح بے لوث رہ کر اپنے جیون میں ابھار اور نکھار پیدا کر سکتا ہے۔ اس کا مطالعہ وجد کا عالم پیدا کر دیتا ہے۔

۲۴۔ سوانح عمری سوامی نرنجن چند جی۔ قیمت پونے دو روپے
انسانیت کے ایک سچے خیر خواہ کی زندگی کے دلچسپ حالات۔

چھپنے والی کتابیں!

۱- WAY TO PEACE OF MIND یعنی سکونِ قلب بزبان انگریزی قیمت
۲- WAY TO SUCCESS یعنی کامیابی کی کنجی بزبان انگریزی قیمت دس آنہ
۳- آتم جھانکی (ہندی) قیمت ایک روپیہ
۴- سرسوتی اور لکشمی منظوم (پنجابی بحروف ہندی) قیمت ۸ر
۵- گیان دھارا (منظوم) اردو قیمت دس آنہ (۸) جین سادھو (ہندی) قیمت ۱۲ر
۶- گیان مالا۔ منظوم (ہندی) قیمت دس آنہ۔ (۹) اے مسلم بھائی قیمت ۱۲ر
۷- عورت۔ قیمت سوا روپیہ۔ (۱۰) سرسوتی اور لکشمی (ہندی) قیمت ۱۲ر

یہ تمام کتابیں مصنف سے براہِ راست یا دیگر شہروں کے ہر ایک تاجر کتب سے مل سکتی ہیں۔

چند رائیں

ان تصانیف کے متعلق قدردانی اور حوصلہ افزائی کے جن خیالات کا اظہار رہبران اور ہر طبقہ کے پریس اور پبلک نے کیا ہے۔ اُن سب کا تو یہاں قلم کرنا ممکن نہیں۔ کیونکہ اُن کی بجائے خود ایک کتاب طیار ہو سکتی ہے لیکن ان میں سے چند آرا اور تبصرات مختصر طور پر بطور نمونہ مشتے از خروارے ناظرین کی آگاہی کیلئے یہاں درج کئے جاتے ہیں جس طرح پر متحدہ طور سے یکزبان ہو کر ہر مذہب و ملت کی بزرگ ہستیوں اور اخبارات و رسائل نے ان تصانیف کی تعریف کی ہے شاید ہی کسی اور کتاب کی ہوئی ہو۔ ذرا ملاحظہ فرمایئے:۔

۱ - شری ۱۰۸ سوامی گوبند آنند جی مہاراج۔ فرقہ وارانہ کشیدگی دور کرنے اور روحانی ترقی حاصل کرنے کے لئے نادر تصانیف ہیں۔

۲ - ہز ایکسیلنسی رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر پریذیڈنٹ اگزیکٹو کونسل حیدرآباد دکن۔ ان جیسی تصانیف کے ذریعہ ہندو مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کیلئے مصنف کی کوشش قابل ستائش ہے۔

۳ - خواجہ حسن نظامی صاحب دہلی۔ "پریم ترنگ" کے حرف حرف سے اتفاق ہے ایسی کتابیں نہ ہندو لکھتے ہیں نہ مسلمان۔ باہمی اتحاد اور اعتماد بڑھانے والی بہت اچھی کتاب ہے۔

۴ - ہز ہولی نس ستگورو صاحب جی مہاراج دیال باغ آگرہ۔ بلاشبہ "پریم ترنگ" محبت اتفاق اور صلح کی موثر ہدایات سے پر ہے۔

۵ - امین الملک مرزا اسمٰعیل وزیراعظم میسور۔ میں مصنف کو "پریم ترنگ" کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

۶ - دیوان بہادر راجہ نریندرناتھ ایم۔ ایل۔ اے لاہور۔ بانیان مذاہب کی تعلیم کی یکسانیت و یگانگت کا اظہار کرنے کے لئے مصنف مستحق تحسین ہے۔

۷ - آنریبل میجر سر سکندر حیات خاں صاحب وزیراعظم پنجاب۔ مصنف نے راہ راست دکھانے

کی کوشش کی ہے۔ جو کہ باہمی فرقہ وارانہ موافقت پیدا کرنے میں ممد ہوگی۔

۸۔ آنریبل سردار بہادر سر سندر سنگھ صاحب مجیٹھیہ وزیر مال پنجاب۔ مصنف کا کام قابل تحسین ہے۔ اس تصنیف سے مختلف فرقوں میں باہمی موافقت پیدا ہوگی۔

۹۔ آنریبل میاں عبدالحی صاحب وزیر تعلیم پنجاب۔ ایسے مفید اور قابل تحسین لٹریچر کی اشاعت پر مصنف مبارکباد کا مستحق ہے اس قسم کے لٹریچر کی حقیقتاً ضرورت ہے۔

۱۰۔ رائے بہادر مسٹر منوہر صاحب اسسٹنٹ ڈائرکٹر تعلیم پنجاب۔ میں اور میری بہن آپ کی تصنیف کے مطالعہ سے بہت محظوظ اور مستفید ہوئے ہیں۔

۱۱۔ سید محمد حسین صاحب جعفری ڈائرکٹر تعلیم ریاست حیدرآباد (دکن) موجودہ خلفشار کے دور میں اس قسم کی مصلح اخلاق اور امن آفرین تالیفات کی سخت ضرورت ہے۔ پڑھے لکھے آدمی کو خود پڑھنی چاہئیں اور دوسروں کو پڑھانی چاہئیں۔ ہر ایک کالج اور سکول میں رکھی جانی چاہئیں ریاست حیدرآباد کے ہر ایک سکول اور کالج میں چاروں کتابیں رکھی جائیں گی۔

۱۲۔ سردار بہادر سردار بھگوان سنگھ صاحب ڈائرکٹر تعلیم ریاست پٹیالہ۔ بہت مفید کتب ہیں۔ ریاست پٹیالہ کے لئے منظور کر لی گئی ہیں۔

۱۳۔ لالہ دیوی چند صاحب ایم۔ اے ہوشیارپور۔ یہ تصانیف صلح کل محبت اور پریم کے اسباق سے پُر ہیں۔

۱۴۔ ٹریبیون لاہور۔ "پریم ترنگ" باہمی محبت اور توقیر کا سبق سکھاتی ہے۔

"انسان" پاکیزہ خیالات کا مجموعہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے انسانی زندگی بہتر بن سکتی ہے۔ "لطف زندگی" واقعی زندگی کو پُرلطف بنانے والی ہے۔

۱۵۔ ہندوستان ٹائمز دہلی۔ "پریم ترنگ" باہمی یگانگت اور محبت کی تلقین کرتی ہے موجودہ فرقہ وارانہ خلفشار کے دور میں اس سے بہتر موضوع کوئی نہیں ہو سکتا۔

۱۶۔ انقلاب لاہور۔ "پریم ترنگ" فرقہ پرستی کی بجائے صحیح انسانیت کا سبق سکھاتی ہے

"انسان" عبادت الہٰی، اخلاقِ عالیہ، انسانی ہمدردی، بلند خیالی اور وسیع المشربی پر ایک نہایت مؤثر اور دلآویز وعظ ہے۔

۱۷۔ ملاپ لاہور: "پریم ترنگ" واقعی پیامِ الفت ہے "انسان" میں انسانیت کے صحیح مفہوم کے دریا بہتے نظر آتے ہیں۔

۱۸۔ زمیندار لاہور: باہمی رواداری اور اتفاق پیدا کرنے کیلئے "پریم ترنگ" بہت مفید ثابت ہوگی۔ اہلِ وطن کو اس کا شوق سے خیر مقدم کرنا چاہیئے۔

۱۹۔ پرتاپ لاہور: "پریم ترنگ" اتحاد، آشتی، برداری اور رواداری کا سبق سکھاتی ہے۔ ہر امن پسند اور امن جو شہری کو پڑھنی چاہیئے۔ "انسان" میں امن پسندی کی راہ دکھائی گئی ہے۔ "لطفِ زندگی" واقعی اسم بامسمےٰ ہے۔ اس میں زندگی کو پر از لطف بنانے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔

۲۰۔ احسان لاہور: موجودہ مکدّر فضا کو صاف کرنے کیلئے "پریم ترنگ" نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے انسان محسوس کرتا ہے کہ اس کے دل سے مذہبی تعصب کے کئی پردے دور ہو گئے ہیں۔

۲۱۔ ویر بھارت لاہور: پریم ترنگ لکھ کر مصنف نے وہ کام کیا ہے جو ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈر نہ کر سکے۔ "انسان" میں انسان کو صحیح معنوں میں انسان بننے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ "لطفِ زندگی" کے مضامین نہایت سبق آموز، پرلطف اور مفید ہیں۔

۲۲۔ ریفارمر لاہور: "پریم ترنگ" میں بتایا گیا ہے کہ کوئی مذہب کینہ، بغض، نفرت یا تعصب کی تعلیم نہیں دیتا۔

۲۳۔ الفضل قادیان: "پریم ترنگ" اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ موجودہ فرقہ وارانہ کشمکش کے زمانہ میں اس کا مطالعہ ازبس مفید ثابت ہوگا۔

۲۴۔ تیج دہلی: موجودہ فرقہ وارانہ کش مکش کے زمانہ میں "پریم ترنگ" بہت مفید

ثابت ہوگی۔ بلا لحاظ مذہب و ملت ہر ہندوستانی کو پڑھنی چاہیئے۔

۲۵۔ ادبی دنیا لاہور۔ آئے دن کی فرقہ وارانہ کشمکش اور کشیدگی کو دور کرنے کیلئے "پریم ترنگ" جیسی کتابوں کی ضرورت ہے۔

۲۶۔ اوم لاہور۔ "پریم ترنگ" کا مقصد فرقہ وارانہ کشمکش اور مذہبی تعصبات و تنازعات کو صاف کرکے باہمی محبت اور رواداری کے خیالات کو پھیلانا ہے "انسان" کے مضامین انسانی زندگی کے مکمل پروگرام کا پورا پورا نوٹو ہیں۔ "لطفِ زندگی" کا مطالعہ آج انسان کو اپنی زندگی پُرلطف بنانے کی راہ بتاتا ہے۔

۲۷۔ ہمالیہ لاہور۔ ہندوستان میں آئے دن کی خانہ جنگیوں کو ختم کرنے کے لئے "پریم ترنگ" کی اشاعت بہت مفید ثابت ہوگی۔

۲۸۔ کرانتی لاہور۔ عوام الناس کو نیک انسان اور باامن شہری بننے کیلئے "انسان" کا مطالعہ بڑا مفید ثابت ہوگا۔ "لطفِ زندگی" میں زندگی کو پُرلطف بنانے کیلئے طریقے بتائے ہیں جن سے واقعی زندگی پُرلطف اور شیریں بن سکتی ہے۔

۲۹۔ مستانہ جوگی لاہور۔ "پریم ترنگ" بلا مبالغہ محبت، آشتی اور یگانگت کی موثر صدا آیات سے پر ہے۔ "انسان" کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے سے تمام انسان سچے انسان بن سکتے ہیں۔

۳۰۔ دین و دنیا دہلی۔ "پریم ترنگ" بنی نوع انسان میں باہمی محبت اور زندگی کا نہایت اعلیٰ اور بلند نصب العین پیش کرنے والی اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ "انسان" کا مطالعہ انسانیت کا سبق دیتا ہے

دیگر اخبارات و رسائل۔ (۳۱) ریاست دہلی (۳۲) وطن دہلی (۳۳) نیرنگ خیال لاہور (۳۴) گورو گھنٹال لاہور (۳۵) شیرازہ لاہور (۳۶) منادی لاہور (۳۷) ست سنگ امرتسر (۳۸) پارس لاہور (۳۹) وحدت دہلی (۴۰) ساقی دہلی (۴۱) الامان دہلی (۴۲) پریت لڑی پریت نگر وغیرہ۔

تمہید طبع پنجم

موجودہ زمانہ کے حالات کو دیکھ کر دل تڑپ اٹھتا ہے۔ جو کچھ اس وقت بیت رہی ہے۔ اسکا دھیان کرکے یقین نہیں ہوتا کہ اس دنیا میں انسان بستے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ درندے ہیں۔ درندے بھی اپنی نسل کو نہیں کھاتے تھے لیکن اس وقت کے انسان درندوں سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو کھا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی بوٹیاں نوچ رہے ہیں۔ دنیا معلوم ہوتا ہے کہ نہ یہاں انسانیت رہی ہے نہ انسان مجلسی اور شہری زندگی نہایت خطرناک بن چکی ہے۔ بد اعتقادی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ بد خیالی زوروں پر ہے۔ کبھی دفعتاً خیال آتا ہے کہ ان کتابوں کے لکھنے کا کیا فائدہ۔ یہ بات تو ایسی ہو رہی ہے جیسے

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

لیکن پھر خیال آتا ہے کہ آخر اس قسم کے حالات ہمیشہ تک نہیں رہ سکتے ہیں۔ یہ ایک عارضی دور ہے اور یہ جلد ہی ختم ہو جائیگا۔ تو ہم روحانی زندگی کی تعمیر [illegible] کرتے ہیں کام کرنیوالوں کو چاہیے کہ حالات کو دیکھ کر مایوس نہ ہو جائیں [illegible] وہ اطمینان سے کام لیتے جائیں۔ اسلئے یہ پانچواں ایڈیشن [illegible] کی ضرورت ہے۔ [illegible] صاحب فہم انسان ہیں جن کو ملک کی بہبودی اور ترقی کا خیال ہے وہ [illegible] اسی کو پسند کرتے ہیں۔ زمانے کی یہ عارضی تبدیلیاں [illegible] جہالت [illegible] کی کار روائیاں ان کے حوصلوں کو پست نہیں کر سکتے۔ وہ ایشور کا بھروسہ رکھ کر انسانیت کی وہ باتیں جن کا ذکر ساری مذہبی کتابوں میں ہے اور جو بابا دیوسنگھ وقتاً فوقتاً کہتے رہتے ہیں۔ ان کو اپنے بھائیوں کے سامنے پیش کرتے ہی رہتے ہیں۔

کاغذ، لکھائی اور چھپائی کے ریٹ بڑھ جانے کی وجہ سے قیمت میں کچھ اضافہ کرنا پڑا ہے۔

جنوری ۱۹۴۸ء

چاولہ

تمہید طبع چہارم

گزشتہ سال کاغذ وغیرہ کی گرانی میں اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن چھپوایا گیا تھا۔ یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی ہے اور پبلک نے اس کی ایسی قدردانی فرمائی ہے۔ کہ جلدی ہی اس کا اگلا ایڈیشن نکالنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پچھلا ایڈیشن جب ختم ہو چکا تھا تو میں ایک دن لاہور گیا۔ وہاں ایک کتب فروش نے مجھ سے دریافت کیا۔ کہ کیا انسان ختم ہو چکا ہے؟ اس کی مراد اس کتاب سے تھی میرے ایک ظریف دوست جو ہمراہ تھے۔ کہنے لگے بلاشبہ انسان ختم ہو گیا ہے۔ لیکن چاولہ جی اسے دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ بات چیت ہوئی تو حسنِ اتفاق اور مذاق سے لیکن میں کافی دیر تک اس پر غور کرتا رہا۔ روز کے ہونے والے واقعات موجودہ جنگ اور اس میں مختلف قوموں کی چالیں۔ ان کے نظریے اور ارادے۔ مذہب و ملت کی حالت۔ مذہب والوں کا رویہ۔ مذہبی جنونیوں کی ریشہ دوانیاں۔ گھرانوں میں اہل خانہ کی باہمی رقابت۔ تعلیمی معلم و متعلم، حاکم و محکوم، افسر و ماتحت، آقا و خادم کے تعلقات میں کشیدگی۔ اخلاق، شرافت، حیا، رواداری، اخوت وغیرہ انسانی صفات کا عدم یہ سب کچھ ظاہر کرتا ہے کہ انسان واقعی ختم ہو چکا ہے۔ اگر انسان سچ مچ انسان ہوں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ آج جو بدامنی۔ بے چینی۔ بے اعتمادی ہر جگہ پھیل رہی ہے دکھائی دے اور آج جو خود غرضی کا دور دورہ ہے یہ [illegible] بلاشبہ موجودہ حالات نہایت دلشکن اور مایوس کن ہیں تاہم ایک سمجھ اور درد دل رکھنے والے انسان کا فرض ہے۔ کہ ملکی، مذہبی، مجلسی اور دیگر ہر قسم کے جنون اور تعصب سے بالاتر ہو کر خود انسان بن کر اپنے بھائیوں کو انسانیت کی راہ دکھائے۔ کچھ عرصہ سے اس قدر ناپاک لٹریچر، اخلاق سوز ناول، قصے اور کہانیاں چھپنے شروع ہو گئے ہیں [illegible] لڑکے اور لڑکیاں ضلالت کے چاہ عمیق میں جا رہے ہیں [illegible] کہ کچھ حد تک تو ان

نے رکاوٹ ڈالی۔ اب ہر ایک بہی خواہ ملک کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کے غلیظ لٹریچر کی اشاعت کو بند کرنے میں حصہ لے۔ ادیب صاحبان کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ اس قسم کا ادب پیدا کریں۔ جو اخلاق کو بلند کرنے والا۔ رواداری اور اخوت کو بڑھانے والا وطن کی محبت پیدا کرنے والا ہو۔ پبلشر صاحبان چھاپہ خانجات کے مالکان و منتظمان سے بھی التماس ہے کہ وہ کوئی مخرب اخلاق یا ہیچ قسم کی چیز محض اپنے ذرا سے مالی فائدہ کے خیال سے چھاپنے سے گریز کریں۔ مالکِ دو جہاں نے بہر کیف شکم پروری کا انتظام تو کر ہی دیا ہے۔ لیکن اپنے ملک اور قوم کا اخلاق اور ایمان بگاڑ کر پیسے کمانا وہ گناہ ہے۔ جو ناقابلِ معافی ہے اس بات کا خاص طور پر دھیان رکھنا لازمی ہے۔

مغربی تہذیب ہی کیا پہلے کم خرابیاں لا رہی ہے۔ اس نے ہی پہلے کافی تباہی مچا رکھی ہے۔ اگر ہم اور بھی ایسے سامان پیدا کریں۔ جو ہماری قوم کے افراد کو پستی کی غاروں میں لے جانے والے ہوں۔ تو ہمارا یہ رویہ نہایت شرمناک ہوگا۔ اس لئے سب صاحبان سے میں دست بستہ معافی کا طالب ہوتا ہوا التجا کرتا ہوں۔ کہ خدارا اس ملک پر اور اس کے بندوں پر رحم کرو۔ اس پر تو پہلے ہی کالی کالی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ مفلسی قحط۔ بیماری غلامی کبھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ للٰہ اس کی مصیبتوں میں مزید اضافہ نہ کیجئے انسانوں کو انسان بنانے کی کوشش کیجئے۔ اگر یہ بھی نہیں کر سکتے۔ تو کم از کم حیوانیت کا پرچار کر کے انہیں درندے اور کتے بننے میں تو ممد نہ ہوئیے۔ ورنہ روزِ ازل جوابدہ ہونا پڑیگا۔ اور اس گناہِ عظیم کا بڑا سخت عذاب بھگتنا پڑیگا۔ اور اسکا کفارہ نہ ہو سکیگا۔

نوٹ:۔ راقم اب ملازمت سے پنشن پا چکا ہے۔ خیال ہے کہ ان خیالات کا پرچار زبانی طور پر بھی کیا جائے سفر کی بڑی دقتیں ہیں۔ مالک کو اگر منظور ہے تو یہ خدمت بھی اپنے اس بندے سے لے لیگا۔

چاولہ

جون ۱۹۴۵ء

تمہید طبع سوئم

اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن جنگ شروع ہونے کے بعد چھپوایا گیا تھا لیکن اس وقت کاغذ کی قلت نہ تھی۔ دوسرا ایڈیشن بھی پہلے ایڈیشن کی طرح بڑی جلدی ہاتھوں ہاتھ بک گیا پھر کاغذ کی از حد قلت ہوگئی۔ لیکن اس کتاب کی مانگ از حد زیادہ ہوگئی۔ جگہ جگہ سے خطوط آئے اور احباب اور دیگر اصحاب نے تقاضا کیا۔ کہ زیادہ تعداد میں نہ سہی تو تھوڑی ہی تعداد میں ہی اس کتاب کا ایک اور ایڈیشن جلد نکالنا چاہیئے۔ لہذا بڑی کوشش سے کاغذ حاصل کر کے یہ تیسرا ایڈیشن پبلک کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

راقم کے لئے اس سے زیادہ کیا خوشی ہوسکتی ہے کہ اس ناچیز تصنیف کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی چند ایک اصحاب اس کتاب کو پڑھنے کے بعد دور دراز مقامات سے احقر کو ملنے کیلئے آئے اور ان میں سے بعض نے فرمایا کہ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ان کی زندگی نے ایک عجیب پلٹا کھایا۔ گویا وہ اندھیرے سے یکدم روشنی میں آگئے اور انہیں اپنا بھلا برا سب کچھ سوجھنے لگا۔ اُن کے یہ کلمات سنکر احقر اس ربِّ کریم دیالو تیا کا دو زانو ہو کر شکریہ ادا کیا۔ کہ جس نے اس ناچیز بندہ کو اس خدمت کا موقع دیا۔ جو اسکی نگاہ میں پسند آئی۔ گویا خالق نے ہی پسند فرمائی کیونکہ خالق خلقت میں ہی ہے۔ اس سے جدا نہیں۔ آوازۂ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو کی کہاوت درست ہے۔

یہ سچ کہا گیا ہے کہ خالق برتر چاہے تو چیونٹی سے کام ہاتھی کا لے سکتا ہے اس حقیر ہستی سے ان تالیفات کے نکلوانے کی مثال بالکل ویسی ہی ہے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔ یہ سب اسی مالک برتر کا فضل و کرم ہے۔

چاولہ

جنوری ۱۹۴۴ء

تمہید طبع دوئم

اس مالک کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں نے مجھ جیسی ناچیز ہستی سے اپنے بندوں کی خدمت بذریعہ قلم کرائی ہے۔ مجھے خواب و خیال بھی نہ تھا کہ یہ تصانیف اس قدر پسند کی جائیں گی۔ "انسان" میری تیسری تصنیف تھی۔ اس کے متعلق بے شمار خطوط حوصلہ افزائی اور قدردانی کے موصول ہوئے۔ بہت سے بھائیوں نے تو تحریر فرمایا کہ "انسان" کا مطالعہ حقیقتاً انسان کو انسان بنا دیتا ہے۔ پہلا ایڈیشن "انسان" کا ۱۹۳۸ء میں نکالا گیا تھا۔ اور وہ ختم ہو چکا ہے۔ یہ دوسرا ایڈیشن ہے۔ اس میں کوئی خاص کمی بیشی مضمون کی نہیں کی گئی۔ کہیں کہیں ادبی درستیاں کر دی گئی ہیں اور کچھ عبارت جو طلبا کے لئے قدرے ناموزوں سمجھی گئی ہے وہ نکال دی گئی ہے۔ نیز پہلے ایڈیشن میں بزرگ ہستیوں و نیز جرائد اور رسائل کی آراء ان تصانیف کے متعلق مختصراً درج کی گئی تھیں وہ بھی غیر ضروری سمجھ کر نکال دی گئی ہیں۔

ان کتابوں کی قیمت پہلے ہی بہت کم رکھی گئی تھی۔ کیونکہ یہ سلسلہ مالی منافع کے خیال سے نہیں بلکہ اپنے بھائیوں کی خدمت کو مدنظر رکھ کر چلایا گیا ہے۔ بوجہ جنگ کاغذ کا نرخ قدرے گراں ہو گیا ہے۔ تاہم قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔ اس قدر ضخامت کی ایسے اعلیٰ کاغذ پر ایسی نفیس طبع شدہ کتابیں جن میں اس قسم کا پاکیزہ مواد ہو۔ ان داموں پر شاید ہی کہیں سے دستیاب ہو سکیں۔ اس میں بھی مالک کا ہی فضل شامل حال سمجھنا چاہیئے۔

چاولہ

۱۶ اگست سنہ ۱۹۴۴ء

ادوم

تمہید

رنگِ دنیا دیکھ کر گھبرا گیا اپنا تو جی!
بھائی کو بھائی سے بھی اس دور میں اُلفت نہیں

کتبِ مقدسہ کے اندر لکھا ہے کہ خالقِ ارض و سما نے جب اس کائنات کو پیدا کیا۔ تو تقریباً سب کچھ بنا چکنے پر بھی دنیا ابھی تشنۂ تکمیل معلوم ہوتی تھی۔ گویا "بے دولھا کی برات" تھی۔ آخر اُس نے آدم کا پُتلا بنایا۔ اور اسے دیکھکر اسکی پوری پوری تسلی ہو گئی۔ اس کے بعد اُسے کسی اور شئے کے بنانے کی خواہش نہ رہی۔ کیونکہ اس کے اندر اس مالک نے اپنی صناعی ختم کر دی۔ غرضیکہ جو کچھ ساری کائنات میں دکھائی دیتا ہے۔ وہ سب کچھ چھوٹے پیمانہ پر انسان کے اندر موجود ہے۔ سنسکرت میں ایک کہاوت ہے۔ "یا برہمانڈے سا پنڈے"۔ یعنی جو کچھ زمین و آسمان کے طبقوں یعنی چودہ لوک میں موجود ہے وہ سب انسان کے جسم کے اندر دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح سے جب ہم اپنے ملک ہندوستان پر نظر ڈالتے ہیں تو بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب قادرِ مطلق باقی سارے ممالک کو عالمِ وجود میں لا چکا۔ تو اس کو تشفی نہ ہوئی۔ پھر اس نے اپنی خواہش کی تکمیل کیلئے ملک ہندوستان کو بنایا۔ اور اسکے بعد کسی اور مقام کو بنانے کی ضرورت نہ رہی۔ دوسرے ملکوں میں جو کچھ بھی فرداً فرداً پایا جاتا ہے وہ سب کچھ اس ایک ہی عجیب و غریب ملک کے اندر موجود ہے۔ کونسی آب و ہوا ہے جو یہاں نہیں ملتی۔ یہاں کے پہاڑ سب سے اونچے۔ یہاں کے دریا سب سے صاف۔ یہاں کے آبشار کرشمۂ قدرت۔ یہاں کی جھیلیں آبدار۔ ہر قسم کی زمین موجود۔ ہر قسم کی پیداوار حاضر۔ ہر قسم کے پھل پھول اور میوے میسر۔ غرضیکہ کوئی ایسی چیز نہیں جو کہیں اور جگہ ملتی ہو۔ اور یہاں دستیاب نہ ہو۔ بلکہ بعض چیزیں تو ایسی

ملک میں ایسی پیدا ہوتی ہیں کہ جو اور کہیں مل ہی نہیں سکتیں۔ اس ملک کے شمالی حصہ یعنی کشمیر بے نظیر کو دیکھ کر واقعی سچ کہا گیا ہے کہ ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

ترجمہ:۔ اگر اس تختۂ زمین پر کہیں بہشت ہے تو بس وہ یہی کشمیر ہے۔

یہاں کی پرانی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ لگتا ہے کہ یہ ملک جب اوج عروج پر تھا۔ تو یہاں کی پراچین تہذیب انسان کو کمالاتِ انسانی سے بہرہ ور کرنے میں جادو کا اثر رکھتی تھی۔ یہ ملک منطق و فلسفہ، ریاضی و ہندسہ، ہیئت و نجوم، ادب و حکمت اور موسیقی کا گہوارہ تھا۔ علم ہندسہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے خاص ہندوستان کی ایجاد ہے اور اکائی کا درجہ قائم کرنا اہلِ ہند کی ذہانت کا ثبوت ہے۔ یہاں کے لوگ بلا کے ذہین تھے۔ ان کے اخلاق و اطوار بہت بلند اور پسندیدہ تھے۔ دوسرے تمام ملکوں کے لوگ اہلِ ہند کی ذہانت اور ہندوستان کی عظمت کے قائل تھے۔ عبادت اور ریاضت کی طرف اہلِ ہند کا خاص رجحان تھا۔ یہ لوگ ہر بات اور ہر حال میں دھرم اور ایمان کو فوقیت دیتے تھے اپنے مذہب کی پابندی کو سب خواہشات پر مقدم رکھتے تھے۔ رحم اور محبت ان کا شیوہ تھا۔ تواضع اور مہمان نوازی ان کا وطیرہ تھا۔ ہمدردی اور غمخواری ان کے دلوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ بنی نوع انسان کیلئے اپنا سب کچھ قربان کر دینا بلکہ جان تک پر کھیل جانا ان کی عادت میں داخل تھا۔

چھاندوگیہ اپنشد میں لکھا ہے کہ جب راجہ اشوپتی سے چند عالم لوگ دین و مذہب کے متعلق کچھ بات چیت کرنے گئے تو سب سے پہلے راجہ نے ان سے کچھ تناول کرنے کی درخواست کی۔ ان لوگوں نے تامل کیا۔ راجہ سمجھ گیا۔ اور بول اٹھا۔ کہ اے بزرگو! آپ میرا اَن کھانے سے کیوں ہچکچا رہے ہیں؟ میں آپ پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرے ملک کے اندر کوئی چور ہے نہ بخیل۔ میری رعایا کا ہر فرد فرائض مذہبی کی بجا آوری میں رات دن کوشاں

رہنما ہے۔ یہاں تو نہ کوئی جاہل ہے نہ بے علم۔ بدچلنی کہیں نام کو بھی نہیں۔ فاحشہ اور فواحشات کا تو ذکر ہی کیا۔"

رامائن میں راجہ دشرتھ کے دارالخلافہ کا ذکر کرتے ہوئے بالمیک منی بال کانڈ کے اندر یوں رقمطراز ہیں"۔ اس اچھے شہر میں دھرماتما لوگ خوشی سے رہتے تھے۔ اور اپنی حالت پر قانع تھے۔ لالچ سے دور۔ طمع سے نفور۔ خدا کی یاد میں مگن تھے۔ نفس پرست بخیل اور بدخلق آدمی وہاں ڈھونڈے سے بھی نہ ملتے تھے۔ وہاں کے تمام مرد وزن نفس کش اور دھرماتما۔ نیک چلن اور خوش اخلاق تھے۔ تنگ خیالی سے یہ لوگ کوسوں دور تھے۔ چوری چکاری نام کو نہ تھی۔ جھوٹ بولنے بغض و حسد کرنے کو ننگِ انسانیت سمجھتے تھے۔ دہریت والحاد کو کوئی جانتا بھی نہ تھا۔"

یہ بہت پرانے زمانے کی باتیں عرض ہوئیں۔ اس سے ذرا آگے چلیے۔ تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کی عظمت سے متاثر ہو کر باہر کے لوگ یہاں علوم و فنون سیکھنے آتے تھے اور فیضیاب ہو کر واپس لوٹتے تھے۔ مثلاً:۔

۱۔ نویں صدی میں سلیمان نامی تاجر بصرہ سے یہاں آیا۔ یہاں کی صنعت و تجارت کے جو حیرت انگیز حالات اس نے شرح و بسط سے قلمبند کئے ہیں وہ آج بھی ہمارے لئے باعث فخر ہو سکتے ہیں۔

۲۔ خلیفہ ہارون الرشید نے کئی آدمی یہاں علم اور حکمت سیکھنے کے لئے بھیجے اور کئی پنڈتوں اور ویدوں کو بلا کر اپنے ہاں کے شفاخانوں کا انتظام ان کے سپرد کیا۔ نجوم و حکمت کے ان جواہر ریزوں سے جو سنسکرت کی کتابوں سے رولے جا سکتے تھے۔ ترجموں کے ذریعے عربی زبان کو مالا مال کر لیا۔ اور وہاں کے عالموں کو سنسکرت سکھائی۔ اس سے عربی ادب میں بڑا اضافہ ہوا۔

۳۔ ایران کے مختلف بادشاہوں نے ایران کے عالموں کو بلا کر علم ہیئت اور

علم جوتش (نجوم) کی کتابوں کا ترجمہ فارسی زبان میں کرایا۔
۴۔ یونانیوں نے بھی ہندوستان سے حکمت حاصل کی۔ ان کتابوں میں ہندوستان کے مشہور وئید دھونتر کا ذکر پایا جاتا ہے۔
۵۔ ۱۰۱۶ء میں البیرونی ہندوستان آیا۔ تیرہ برس یہاں رہ کر سنسکرت زبان میں مہارت تامہ حاصل کی اور پھر سنسکرت کی تقریباً سو کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں کیا اس نے یہاں کے لوگوں کی نسبت اعلیٰ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جابجا ان کو روحانیت کے قائل، شریف، نیک نہاد اور با اخلاق لکھا ہے۔
۶۔ ۱۱۵۰ء میں صالح نے سنسکرت کی ایک راج نیتی (POLITICAL SCIENCE) کی کتاب کا ترجمہ کیا جو دیگر ممالک میں بڑا مقبول ہوا۔
۷۔ مغل بادشاہوں نے اس ملک کو ایسا پسند کیا۔ کہ ایران و توران کو بھول گئے اور یہیں کے ہو گئے۔ اسی ملک کو اپنا گھر بنا لیا۔ خصوصاً شہنشاہ اکبر نے تو اس بارہ میں ایک ایسا پسندیدہ قدم اٹھایا۔ کہ سارے ہندوستان کو اپنا لیا۔
یہ سب کچھ اس بات کے ثابت کرنے کے لئے عرض کیا گیا ہے۔ کہ یہ ملک تختۂ دنیا پر ایک خاص درجہ رکھتا ہے۔ اس لئے ایسے ملک کے اندر عالم وجود میں آنا اور ہندوستانی کہلانا خوش نصیبی کی علامت سمجھنی چاہیئے۔ یہ رشیوں کی سرزمین اوتاروں کا گہوارہ اور روحانیت کا مرکز تھا۔ اسکی زرخیزی بے نظیر ہے۔ اسکی زرریزی بے مثال ہے۔ اسکی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہی بیساختہ زبان سے نکل جاتا ہے۔ ع

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

لیکن آہ! رضا و تسلیم کا قائل ہونے کے باوجود میں سمجھتا ہوں۔ کہ فی زمانہ اس ملک کے اندر پیدا ہونا بہت بڑی بدقسمتی ہے۔ یہاں جس قسم کے لوگ پہلے بستے تھے اس کا اندازہ آپ ان حالات سے لگا سکتے ہیں جو اوپر درج ہو چکے ہیں۔

اس زمانہ کا نقشہ حالی مرحوم نے اپنے الفاظ میں یوں کھینچا ہے ؎

مال و دولت کی ہوس میں نہ گرفتار تھے ہم — نہ بلندی کے نہ رفعت کے طلبگار تھے ہم
اس قدر عمرِ دو روزہ پہ نہ مغرور تھے ہم — عیش و عشرت کے طلسموں سے بہت دور تھے ہم
حاجتیں لے کے کسی در پہ گئے تھے نہ کبھو
نہ زمیں بوسی کی عادت تھی نہ تسلیم کی خُو

اکبر الہ آبادی نے ایک جگہ یوں لکھا ہے ؎

نہ یہ آپس کے جھگڑے تھے نہ بیجا حق پرستی تھی — طبیعت پر نہ دیوِ نفس کی یہ چیرہ دستی تھی
نہ دل میں بدگمانی تھی نہ ہمت میں یہ پستی تھی — نظر میں مظہرِ نورِ حقیقت ساری ہستی تھی
تمہاری وضع دلکش تھی تمہاری شان عالی تھی — خوش اخلاقی تمہاری مظہرِ شانِ جمالی تھے

لیکن اس وقت کی حالت ناگفتہ بہ ہے اس زمانہ میں تو جس طرف بھی نگاہ پڑتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایسا گرا ہوا اور ذلیل دوسرا کوئی ملک ہی نہیں۔ کسی بھی صیغے کی طرف دیکھو یہی مثال صادق آتی ہے۔

"اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی"

۱۔ تحصیلِ علم کی طرف دیکھیں۔ تو جملہ تہذیب یافتہ ممالک سے یہاں کی پڑھی لکھی جماعت کا تناسب بہت کم ہے۔ یعنی دیگر ممالک میں جہاں تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد بہت جگہ ۹۵ فیصدی سے بھی زیادہ یعنی ۹۸ فیصدی تک ہے۔ وہاں اس ملک میں ۸ فی صدی سے بھی کم ہے اور اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو صرف اپنا نام ہی لکھ سکتے ہیں۔

۲۔ صنعت و حرفت کی طرف دھیان کریں تو ہر ایک چیز کے محتاج دکھائی دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ روزانہ زندگی کی ضروریات کی چیزیں بھی باہر کے ممالک سے منگوانی پڑتی ہیں سوئی تک کے لئے غیروں کے محتاج ہیں۔

۳۔ علم سائنس و علم جراحی وغیرہ میں تو ہم طفلِ مکتب بھی نہیں۔ حالانکہ اہلِ مغرب نے

اس میں کمال کر دکھایا ہے۔ غنڈہ و اور بھیڑیئے تک بدل دینا ایک معمولی بات بن گئی ہے بچہ دانیاں اور انتڑیاں باہر نکال کر ٹھیک کر کے پھر ڈال دی جاتی ہیں۔

۴۔ علم ادب کے اندر دیگر ممالک کے ادبا اعلےٰ پایہ کا لٹریچر پیدا کر رہے ہیں لیکن یہاں اس کا عشر عشیر بھی دیکھنے میں نہیں آتا۔ یہاں سوائے ناولوں اور قصوں کے کچھ نہیں لکھا جاتا۔ جسکو پڑھکر ہمارا اخلاق اور بھی پست ہو رہا ہے۔

۵۔ اخلاق کی طرف آئیں تو شرم کے مارے گردن زمین میں جا گڑتی ہے جو بداخلاقی بداعتمادی۔ بدگمانی اور بدخیالی اس ملک میں آگئی ہے اس کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ کوئی بہن اکیلی باہر تک نہیں نکل سکتی۔

۶۔ دین و مذہب کے متعلق تو حالت اور بھی زبوں ہے جو مذہب ہمکو تمام قسم کی بُرائیوں سے بچا کر نیک کرداری کی طرف لگانے کے لئے ہے۔ اسی مذہب کے نام پر جو آفتیں ہم ڈھا رہے ہیں۔ ان کے کہنے اور لکھنے سے زبان اور قلم کانپتے ہیں۔ مذہب ایک پاکیزہ اور لطیف ترین روحانی ہدایات کا نصاب ہے۔ جسکو آج ہمنے ایک شرارت اور باہمی عداوت کا مسالا بنا یا ہے۔ جہاں لوگوں کا ذات باری کے متعلق یہ اعتقاد ہوتا تھا۔ کہ راجہ لوگ فخریہ کہتے تھے۔ کہ میرے ملک میں کوئی دہریہ یا ناستک نہیں۔ وہاں اب جگہ جگہ پر ایسے فرقے اور سوسائٹیاں قائم ہوگئی ہیں۔ کہ جو نہ صرف مذہب اور پروردگار عالم کو تلانجلی دے بیٹھے ہیں۔ بلکہ اہل مذہب اور نیک لوگوں کو صلواتیں بھی سناتے ہیں۔ اور کھلے بندوں اس بات کی تلقین کرتے ہیں۔ کہ دنیا میں اگر آرام ہو سکتا ہے تو مذہب اور خدا کے خیال کو چھوڑ کر ہو سکتا ہے۔ سینکڑوں رسالے ان خیالات کی اشاعت کے لئے نکل رہے ہیں اور لوگ شوق سے ان کو پڑھتے ہیں اور ان خیالات کی داد دیتے ہیں۔ بلکہ تائید پر تائید کرتے ہوئے ان خیالات کو ORIGINAL IDEAS یعنی خیالات نو کہتے ہیں۔

ٹ اس سال تو کلکتہ۔ مشرقی بنگال اور بمبئی وغیرہ کے واقعات نے پچھلے سارے ریکارڈ مات کر دئے ہیں۔

میں محسوس کرتا ہوں۔ کہ اس قسم کے خیالات کے لوگ بالکل صدق دل سے ایسا کہتے ہیں کیونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ فی زمانہ جو لوگ مذاہب کو ماننے والے ہیں ان میں سے اکثر راستی سے کوسوں دور ہیں اور باہمی نزاع و تکرار میں لگے رہتے ہیں۔ محبت انسانی کا ان کے اندر نام و نشان تک نہیں۔ مذہب کی آڑ میں اپنا اُلّو سیدھا کر رہے ہیں۔ بگلے بھگت بنکر ڈھونگ رچا کر ٹھگی کی دکانیں قائم کر کے جاہل اور سیدھے سادے لوگوں کو لوٹ رہے ہیں۔ اور ان کی آپس میں سر پھٹول کرا رہے ہیں۔ جناب مسیح نے سچ فرمایا ہے کہ درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے۔ لیکن افسوس جب کسی مذہب کی خوبی کو اس کے پیروؤں کے اخلاق و اعمال سے جانچتے ہیں۔ تو سخت مایوسی کا سامنا ہوتا ہے اور طبیعت مجبوراً دہریت کی طرف جاتی ہے۔ اور دل مذہب اور خدا کا خیال چھوڑنے کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ کہاں ہمارے بزرگ کہ جنہوں نے اپنے اخلاقِ حسنہ اور نیک چلن سے دنیا میں مذہب کے نام کو بلند کیا اور کہاں ہم بدبخت کہ جو نہ صرف اسکو بدنام کر رہے ہیں۔ اور اس کا خاکہ اُڑا رہے ہیں۔ بلکہ اس کا نام و نشان تک مٹانے میں اہلِ غرض کا ساتھ دے رہے ہیں۔ وائے ہم! مذہب کو بجائے بلندی پر لے جانے کے پستی میں لے جا رہے ہیں۔

سوائے معدودے چند مبارک ہستیوں کے آج جدھر دیکھو لوگوں نے مذہب کے نام پر دکانداری چلا رکھی ہے۔ مذہب صرف ان باتوں کے لئے رہ گیا ہے۔ جو کہ ذیل میں عرض کی جاتی ہیں۔ اصلی غرض فراموش ہو چکی ہے۔

ا۔ دوسرے مذہب اور مذہب والوں کی ہجو کی جائے۔

ب۔ دوسروں کا حق چھین کر ان پر جبر و تشدد روا رکھا جائے۔ ظلم ڈھایا جائے۔

ج۔ مذہب کے نام پر فساد کیا جائے اور خون بہایا جائے۔

د۔ مذہب کی آڑ میں اپنی روٹی کا سلسلہ چلایا جائے۔

تاکہ مذہب کے نام پر بداخلاقی اور بدچلنی پھیلائی جائے۔

مذہب کے پیشوا جو مذہب کی تفسیریں سُنا کر لوگوں میں دینی جذبات اور روشن ضمیری پیدا کرتے تھے۔ مذہب کی گوناگوں خوبیوں اور برکتوں سے مستفیض ہونے کی ترغیب دیتے تھے مذہب کا حقیقی رنگ دکھا کر اپنے پیروؤں کو خوش اخلاقی اور نیک چلنی کا نمونہ بناتے تھے محبت ہمدردی، خدمت خلق کو انسانی زندگی کا معیار بنا کر اپنے چیلوں کو انسانیت کے جوہر سے مزین کرتے تھے آج وہ خود ہی خودغرضیوں میں پھنس کر جہالت میں گر رہے ہیں اور ہم کو بھی ساتھ ہی کھینچ رہے ہیں اور زبان حال سے کہہ رہے ہیں ع

ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے

کا مصداق ہو رہے ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے کیا اچھا کہا ہے ؎

جب ملیں گرو جی خود لبیبے — خوب رچائیں میلے ٹھیلے
راہ پہ آئیں کیوں کر چیلے — سند رہیں کیوں جائیں اکیلے
آگرا خود حب حق سے ہو غافل — دنیا ہی دنیا دل میں ہو داخل
ساتھی کیوں نہ بنیں پھر باطل — کیوں کر دین ہو ان کو حاصل
مُلا خود نہ ہو حقانی — پھر تو مکتب ہے شیطانی

کم از کم اس ملک میں تو موجودہ ناگفتہ بہ حالات کے ذمہ دار زیادہ تر مذہبی پیشوا ہیں۔ کیونکہ ان کا مقصد ہی اب صرف یہ رہ گیا ہے ؎

زر تو ہم سے لے اپنے سامان کرو — جس سے تمہاری بزم بن جائے بہشت
طوطے ماشہ سے کام رکھو حیاتی — مر کے دوزخ میں جائے یا پائے بہشت

جب ان مذہبی پیشواؤں کے لمبے لمبے تلک اور لمبی لمبی چوٹیاں، وضعدار دھوتیاں، گھنی ڈاڑھی، ماتھے پر لمبی محراب اور لمبے لمبے کیس اور دیگر علامات دیکھو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بڑے پہنچے ہوئے ہیں اور پاک دامنی کے پتلے ہیں لیکن ؎

دل میں ہے یادِ حُور زباں پہ ہے یا غفور ظاہر درست شیخ کا باطن خراب ہے

جب یہ لوگ پُوجا اور نماز میں بیٹھتے ہیں۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ سیدھی عرش معلےٰ کے ساتھ تار بندھ گئی اور براہ راست خالق برتر سے ناطہ جُڑ گیا لیکن حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔ ان کی دلی حالت حضرت اکبر سے سنیئے ؎

بیٹھے تو بہت ہی سر جھکا کر ہیں حضور کیا جانے مراقبہ ہے یا بیٹھک ہے

جب یہ اپدیش یا وعظ کرنے کھڑے ہوتے ہیں۔ تو مذہبی مسائل کی وہ باریکیاں دکھاتے ہیں۔ کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایسی ایسی موشگافیاں کرتے ہیں۔ کہ دماغ چکرا جاتا ہے۔ لیکن اگر ان کے اعمال کی طرف جاؤ۔ تو خدا کی پناہ!

اس مضمون کے متعلق دوسری تصنیف "پریم ترنگ" عرف "ترانۂ الفت" میں بہت وضاحت سے لکھا جا چکا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اگر پنڈوا۔ رہبر۔ اگوا۔ پیر اور گورو اس قماش کے ہوں تو مریدوں اور چیلوں کا کیا ٹھکانا ہے۔ پنجابی میں ایک مثل ہے۔ "گورو جنہاں دے ٹپنے چیلے جان چھڑپ" یعنی جنکے گورو ٹپنے کودنے والے ہوں اُن کے مرید تو چھلانگیں لگانے والے ہی ہونگے۔ عوام جو کہ ان پنڈواؤں سے ہر طرح کی اخلاقی باطنی اور روحانی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان کا آج یہ حال ہے کہ ؎

کہاں کی پُوجا نماز کیسی کہاں کی گنگا کہاں کا زمزم

ڈٹا ہے ہوٹل کے در پہ ہر اک اِدھر بھی دو ایک جام صاحب

اب پتلون پہن کر بھلا آسن لگا کر سندھیا یا پوجا کیسے ہو سکتی ہے؟ یا روزانو ہو کر سجدہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ پتلون کی اگر کریز (کیل) خراب ہو جائے تو وہ پہننے کے لائق ہی نہ رہے۔ اس لئے اب یادِ خدا یا مذہب کی پیروی زمانہ ماضی کی بات ہو گئی ہے آج کل نوجوان یہ کہتے ہوئے سُنے جاتے ہیں ؎

فرمائیں میرا قصور حضرت جو معاف جو امر ہے واقعی گذارش کروں صاف

انکار نہیں نماز و روزے سے مجھے　　　لیکن یہ طریق اب ہے فیشن کے خلاف

یہی نہیں کہ ہم دین و دنیا کو تجلانجلی دے بیٹھے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی بہت آگے نکل گئے ہیں۔ اور ایسا ہونا لازمی امر تھا۔ کیونکہ دھرم اور ایمان ہی ایک ایسی چیز ہے۔ کہ جو انسان کو حدود کے اندر باندھ کر رکھتی ہے۔ ورنہ ؎

طالب خیر نہ ہونگے کبھی انسان سے ہم　　　نام اسکا ہے بشر اس میں ہے شر آخر کو

اور حقیقتاً دھرم اور ایمان کی گرفت سے نکل کر اب وہ حالت ہوئی ہے کہ بیان کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ کیسی حالت ہے ؎

اب وہی ہم ہیں کہ مجبور بھی نادار بھی ہیں　　　شرع سے دور بھی قرآن سے بیزار بھی ہیں
سب سے جھوٹے بھی ریاکار بھی مکار بھی ہیں　　　بدعمل بھی ہیں رباخوار[1] بھی مے خوار[2] بھی ہیں

اب دین اور مذہب کی باتیں یا دھرم اور ایمان سے پیار کرنے والے لوگ عنقا[3] ہو گئے ہیں۔ ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے۔ گویا اس عالم میں کبھی ان کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ ایسے لوگوں کے خیالات محض ایک نیا ورثی قصے معلوم ہوتے ہیں ؎

دین و ایمان ڈھونڈتا ہی ذوق کیا اس وقت میں　　　اب نہ کچھ دین ہی رہا باقی نہ ایمان ہی رہا

لوگ اس ملک میں بھوک، قحط، مفلسی، بیماری اور بے روزگاری کا شکار ہو رہے ہیں کوئی اسے ہندوؤں کی خود غرضی پر محمول کرتا ہے۔ کوئی مسلمانوں کے تعصب پر کوئی اسے غیر ملکی شرارت کہتا ہے۔ کوئی مغربی تہذیب کے بُرے اثرات کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس بُری حالت کا سب سے بڑا سبب ہماری دھرم اور ایمان سے لاپروائی ہے اور دھرم اور ایمان کو دنیاوی اغراض کے پورا کرنے کا ذریعہ بنا لیا ہے اسکی وجہ سے ہمارے اندر تنگ نظری آگئی ہے۔ نااتفاقی حسد اور نفرت زوروں پر ہے باہمی میل جول کا نام و نشان نہیں۔ حالانکہ اتحاد اور اتفاق ہی سب کچھ بنا سکتا ہے لیکن جب ایک ہی خدا کو ماننے والے اسکے ناموں پر ہی جھگڑتے ہیں۔ اور گوشت کھانے والے لوگ جاتو رہاں

[1] سودخوار [2] شرابی [3] غائب۔

کے طریقِ قتل کے اختلاف پر ہی اپنے ہمسایوں کے قتل کو مباح سمجھ رہے ہیں۔ ایک ہی خدا کی عبادتگاہوں کو مختلف نام دیکر اپنے سے دوسری عبادتگاہوں میں جانے والوں کو بیدریغ تہ تیغ کر رہے ہوں، وہاں فارغ البالی، خوش حالی، صحت و طاقت کیسے آسکتی ہے۔

یہ تو رہی مذہب کی بات۔ اب اگر اخلاق کی طرف نگاہ ڈالیں تو گراوٹ کی گہرائی کا اندازہ لگانے سے نگاہِ خیال قاصر معلوم ہوتی ہے۔ اول تو دنیا میں ہر ایک انسان قابلِ قدر۔ قابلِ عزت اور قابلِ محبت ہے۔ لیکن تین ہستیاں تو خصوصاً بزرگ مانی گئی ہیں یعنی ماں۔ باپ اور استاد یا گورو۔ ان کے متعلق ہماری مذہبی کتابوں میں یہاں تک لکھا گیا ہے۔ کہ جو ان تینوں کی دل و جان سے خدمت اور عزت کرتا ہے اس کو نہ حج کرنے کی ضرورت ہے نہ تیرتھ کی۔ گھر کے اندر ہی وہ جیتے جاگتے تیرتھ اور دیوتا ہیں۔ لیکن حالاتِ حاضرہ پر نظر ڈالنے سے پتہ لگتا ہے۔ کہ نوجوانوں کے اندر اور لوگوں کیلئے تو کیا ان تین قابلِ تعظیم ہستیوں کیلئے بھی وقار، تعظیم اور ادب کا جذبہ کافور ہو چکا ہے۔ کوئی ہی خوش قسمت کالج یا سکول ہوگا۔ کہ جس میں ہڑتال نہ ہوئی ہو۔ یا استادوں کی پگڑی نہ اچھالی گئی ہو۔ ہم صرف ہڑتال کنندگان کو ہی ذمہ نہیں ٹھہرا سکتے۔ قصور طرفین کا ہوتا ہے لیکن اخلاق کی گراوٹ بہرصورت عیاں ہے قصور خواہ کسی جانب کا ہو۔ معلموں میں ہمدردی نہیں رہی۔ متعلموں کے دل عزت و احترام سے خالی ہو چکے ہیں۔ وہی مثال صادق آتی ہے ؎

نہ اب تادیب میں شفقت نہ شوخی میں ادب باقی
بزرگوں کی کشش بگڑی عزیزوں کا چلن بگڑا

والدین اور بچوں کے تعلقات اس سے بھی زیادہ بگڑ چکے ہیں۔ ماں باپ کو بھی بچوں کیلئے وہ محبت اور شفقت نہیں جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ بچے بھی پاسِ ادب کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔ یہاں تک ہی بس نہیں کہ ادب و آداب باقی نہیں رہا۔ بلکہ معمولی معمولی باتوں پر دل کو پاش پاش کرنے والی وارداتیں رونما ہوتی ہیں۔ جنکو سنکر اور پڑھ کر دانتوں تلے انگلی دبانی پڑتی ہے۔

ایسے واقعات ایک دو نہیں بلکہ بےشمار ہو رہے ہیں۔ اخبار "ٹربیون" میں لائل پور کے ایک گاؤں کا ایک مقدمہ چھپا جس میں ایک لڑکے نے اپنے والد کو اس وجہ سے قتل کر دیا کہ وہ تقسیم جائیداد لڑکے کی خواہش کے مطابق نہ کرتا تھا۔ ایسے واقعات جگہ جگہ ہو رہے ہیں ؎

کیا زمانہ ہے یہ کہ ہے دشمن باپ بیٹے کا بھائی بھائی کا

زن و شوہر کے تعلقات کس قدر محبت خیز اور پاکیزہ ہونے چاہئیں لیکن اسی اخبار میں ایک واقعہ چھپا ہے کہ ایک عورت جو اپنے خاوند کو چھوڑ کر چلی گئی۔ عدالت میں مقدمہ پیش ہوئی۔ جب خاوند نے اسکو شناخت کرنے کیلئے اسکا برقعہ اتروایا۔ تو عورت نے عدالت کے اندر ہی اپنے خاوند کے منہ پر تھوک دیا۔ عدالت نے اس پر ہتک عدالت کے جرم میں جرمانہ کیا۔ میرے ایک دوست نے یہ خبر مجھکو سنائی اور ہنس پڑا۔ لیکن میں نے کہا یہ ہنسنے کا مقام نہیں۔ ہمارے ملک کیلئے رونے، ماتم کرنے اور شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ یہ واقعہ خاص اس زن و شوہر کا نہیں بلکہ ایک ہندوستانی زن و مرد کا ہے یعنی ہم سب کی اخلاقی اور مجلسی حالت کا ترجمان ہے۔ اس واقعہ کو پڑھ کر ہندوستان کی موجودہ تہذیب اور اس کی موجودہ اخلاقی حالت کا موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر موجودہ حالات کو سدھارنے کی کوشش نہ کی گئی۔ تو اس قسم کے واقعات سب گھروں میں ہونے لگیں گے۔

موجودہ زمانہ کچھ عجیب واقع ہوا ہے۔ لوگ اس قسم کے جانکاہ واقعات کو دیکھتے پڑھتے اور سنتے ہیں لیکن بجائے اظہار تاسف کرنے اور اپنی ملکی حالت پر شرمسار ہونے کے خوش ہوتے اور مذاق اڑاتے ہیں ؎

نیا کے ملت بگڑ رہی ہے، لبوں پہ ہے جان مر رہے ہیں
مگر طلسمی اثر ہے ایسا کہ خوش ہیں گویا ابھر رہے ہیں
یہ طفل ناداں غریق غفلت بجائے ذلت ہی ناز ہے ہیں

سمجھ نہیں ہے نظر نہیں ہے نیائے جاتے ہیں بن رہے ہیں

خاص کر اس موجودہ زمانہ میں اہلِ حق کی قلّت ہے اور اہلِ باطل کی کثرت۔ مذہب رُو بہ زوال ہے۔ خواہشاتِ نفسانی نے ایک طلاطم برپا کر رکھا ہے۔ نفسانی اور شیطانی عملیات کے کمال کا زمانہ ہے۔ کہیں عالمانِ بے عمل کا زور ہے۔ کہیں صوفیانِ دغل کا شور۔ نہ سوز نہ گداز۔ نہ سچّا عشق۔ نہ راز و نیاز۔ نہ محبّت نہ اخلاص۔ نہ وہ داد۔ نہ وہ حُسنِ طلب۔ کہیں فلسفہ اور منطق کا نکما جھگڑا جاری ہے۔ کہیں تحقیق مذاہب کی آڑ میں جنگ و جدال ہے۔ کہیں وجود باری تعالیٰ کی نسبت بیہودہ قیل و قال ہے۔ دل ہمہ تن محبتِ دنیا میں مُردہ اور عاقبت کی طرف سے افسردہ ہے ؎

بدلی ہوئی دنیا کی ہوا دیکھ رہا ہوں — ہر رنگ میں اک رنگ نیا دیکھ رہا ہوں
جس بزم میں چلتا تھا کبھی جامِ محبت — آج اسکی ہی مسموم فضا دیکھ رہا ہوں

کیا یہاں کے طبعی حالات میں کچھ تبدیلی واقع ہوگئی ہے۔ یا یہاں کی آب و ہوا میں فرق آگیا ہے۔ یا یہاں کے زمین و آسمان بدل گئے ہیں۔ نہیں یہ سارے حالات تو ویسے ہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ؎

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں — کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں — پستی سی آگئی ہے پر دل کے ولولوں میں

گل شمعِ انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حُبِّ وطن نہیں ہے خاکِ وطن وہی ہے

ہمارے جسم بھی ویسے ہی ہیں۔ جسم کی رگوں میں خون بھی اسی طرح سے چکر لگا رہا ہے ہمارے رگ و ریشہ بھی ویسے ہی موجود ہیں۔ ہماری نسیں اور ناڑیاں بھی اسی طرح کام کر رہی ہیں۔ جسم کی بناوٹ میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ دماغ پہلے سے کچھ زیادہ ہی کام کر رہے ہیں۔ تو پھر موجودہ حالت کی ذمہ وار کیا چیز ہے؟ اسکا جواب اکبر نے ان اشعار میں دیا ہے

خلقت جو کہیں ذلیل ہو جاتی ہے — بے غیرت و بے دلیل ہو جاتی ہے
گو جسم میں ظاہرا توانائی ہو — اخلاق میں وہ علیل ہو جاتی ہے

جو فرق آیا ہے وہ ہمارے اخلاق میں آیا ہے جو کمی واقع ہوئی ہے۔ وہ ہمارے دل کے اندر واقع ہوئی ہے۔ یہ دل زمانہ گزشتہ میں دوسروں کے درد سے پگھل جایا کرتا تھا۔ اب اپنے سگے بھائیوں کے دکھ میں بھی اس پر رقت طاری نہیں ہوتی۔ پہلے تو غیروں سے بھی ہمدردی کرکے مسرور ہوتے تھے۔ اب اپنوں پر ہی ظلم ڈھا کر خوش ہوتے ہیں، بلکہ غیروں کی نسبت اپنوں کو مصیبت میں پھنسا کر زیادہ خوشی مناتے ہیں ؎

اب یہ حالت ہے کہ ٹوٹا بھی آنسو کی نہیں
ہم نے جن آنکھوں سے بہتے ہوئے دریا دیکھا

اب اگر خیال ہے تو اپنا ہے۔ فکر ہے تو اپنی۔ دھن ہے تو اپنی۔ الفت و محبت ہمدردی و ایثار کا نام تک موجود نہیں۔ زر و مال کی ہوس اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اس کے مقابلے پر نہ باپ کی عزت ہے نہ ماں کا پاس ادب۔ نہ بھائیوں کے لئے الفت ہے۔ نہ دوستوں کے لئے محبت۔ جیسے کیسے دمڑوں کے حاصل کرنے کے لئے مذموم سے مذموم کارروائی جاری رکھی جاتی ہے۔ زر کے مقابلے میں سب رشتے اور اصول خاک میں مل جاتے ہیں۔ جہاں روپے کا سوال آیا۔ وہاں اخلاق و خلوص، اصول و شعار سب پس پشت ڈال دئے جاتے ہیں ؎

نہ بھائی سے رہی الفت نہ یاروں میں رہی ملت
جو الفت ہے تو زر سے ہے یہی بس سب سے پیارا ہے

لوگ موجودہ زمانے کو ترقی کا زمانہ کہتے ہیں۔ اسکو تہذیب کے زمانے کا نام دیتے ہیں لیکن خدا ایسی ترقی سے بچائے۔ اور اس تہذیب کے موذی چنگل سے چھڑائے جس نے یاروں میں بے وفائی اور اپنوں میں کج ادائی پیدا کر دی ہے۔

رسم اُلفت کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ اپنے دیکھتے دیکھتے اخلاق کا خرمن جل کر خاک سیاہ ہو گیا ہے۔ سارے زمانے کے ڈھنگ ہی بدل گئے ہیں۔ وہ طور ہی نہیں رہے ہے

کیا دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بدل گئی   واللہ وہ زمیں نہیں وہ آسماں نہیں

اپنی آنکھوں دیکھی بات ہے کہ گاؤں کا بنیا زمیندار کو قرض دے کر حسب قلم سے قرض کی رقم اپنے ہی کھاتے میں درج کرتا تھا۔ اسکو قرضدار کے ہاتھ سے چھوا دیتا تھا بس اس کیلئے وہی سوگند ہو جاتی تھی۔ اور اس قرض کی ادائگی سے وہ کبھی منکر نہ ہوتا تھا۔ عدالتوں میں جانے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ خود بخود سب جھگڑے نپٹا لئے جاتے تھے۔ اب کہیں انگوٹھے لگوائے جاتے ہیں۔ کہیں سارے کا سارا پنجہ لگوایا جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی مقروض منکر ہو جاتا ہے۔ اور عدالتوں میں جھوٹ کے پلندے اور دغابازی کی مسلیں مرتب ہوتی ہیں۔ بے شک زمانہ گذشتہ میں تعلیم کی کمی تھی لیکن اخلاق اونچا تھا۔ جہالت ضرور تھی۔ مگر صداقت زیادہ تھی۔ لوگ پڑھ لکھ نہ سکتے تھے۔ لیکن اُن کے دل زیادہ پاکیزہ تھے۔ لوگ بے شک زیادہ قانون دان اور موشگاف نہیں تھے۔ لیکن وہ مقدمے کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے تھے۔ لوگ زیادہ ہوشیار نہیں تھے۔ لیکن سادگی اور صدق دلی ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ عام لوگ مذہب کی باریکیوں سے بھی بہت آگاہ نہیں تھے۔ لیکن وہ نہایت ہمدردی و اُلفت سے سرشار رہتے تھے۔ اور یہی مذہب کا منشا اور اعمال کی غایت ہے لیکن آج اس قسم کا ہمدرد، خوف خدا سے معمور، صادق القول، سادہ مزاج اور پاک باز انسان ایک بھی دکھائی نہیں دیتا ہے

جھگڑے دیکھے ہیں جن لوگوں کے ان آنکھوں نے
آج دنیا کوئی دے ہم کو دکھا ایک ہی شخص!

تعلیم کو ہم نے بڑھایا۔ ہوشیاری ہم نے زیادہ حاصل کی عقل و دماغ کو بھی

فروغ دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ خود غرضی، مکاری، الفت وحسد کی بھی فراوانی ہو گئی تعلیم کی ترقی قابلِ تحسین ہے۔ دماغ کی تیزی بھی مبارک علامت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اچھے اخلاق کا ہونا بھی لازمی ہے۔ فیشن پرستی ضرور بڑھ گئی ہے۔ لوگ خوش پوش زیادہ ہو گئے ہیں۔ زن و مرد اب جسم کی آرائش نہایت اچھی طرح کرتے ہیں۔ لیکن جو انسانیت کا جوہر تھا۔ وہ ہوا ہو چکا ہے ؎

سیر کا اس باغِ عالم میں مزا کچھ بھی نہیں خوشنما ہیں گل مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں
رہ گئی ہے اب زمانے میں محبت نام کی دل ٹٹولیں تو بجز مکر و دغا کچھ بھی نہیں

جیسا اوپر عرض ہوا ہے۔ علمی لیاقت ضرور بڑھ گئی ہے۔ لیکن یہ کس کام کی۔ اگر اس کا ماحصل بغض و عناد۔ کبر و کینہ ہی ہو ؎

قابلیت تو بہت بڑھ گئی ماشاء اللہ مگر افسوس یہی ہے کہ مسلماں نہ رہے

اکبر نے زمانے کی رَو کو دیکھ کر اپنی عین حیات میں ہی موجودہ حالتِ زبوں کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اس نے ٹھیک طور پر یہ پیشینگوئی کی تھی ؎

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہونگے نئی تہذیب ہو گی اور نئے ساماں بہم ہونگے
بدل جائیگا اندازِ طبائع دورِ گردوں سے نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسبابِ غم ہونگے
خبر دیتی ہے تحریکِ ہوا تبدیلِ موسم کی کھلیں گے اور ہی گل زمزمے بلبل کے کم ہونگے
عقائد پر قیامت آئیگی ترمیمِ ملت سے نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہونگے
گذشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائینگے کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہونگے!
کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہونگے

تمہیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہیں وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

قصہ مختصر یہ ہے کہ [illegible] انسانوں کی کمی ہو گئی ہے اور [illegible]

کہ انہی لوگوں سے جو انسانیت کا حقیقی مفہوم ہیں کسی ملک اور سوسائٹی کی عزت ہو سکتی ہے وہی خود دنیا میں اونچے اٹھ سکتے ہیں۔ اور دل کیلئے روشنی کے مینار LIGHT HOUSE کا کام دے سکتے ہیں۔ آنے والی نسلیں ان کے نام پر فخر کرتی ہیں اور ان کے کارہائے نمایاں کو یاد کرکے ان کے نقشِ قدم پر چل کر راحت و مسرت حاصل کرتی ہیں۔ اس لئے اب بھائیوں سے مودبانہ التماس ہے کہ یہ ملک جو کہ ایسے سچے انسانوں کا مخزن و مرکز تھا اب اُن سے خالی ہو چکا ہے۔ وقت اس بات کا مقتضی ہے کہ اس میں ایسے سچّے انسان پیدا ہوں کہ جو اس ملک کی ڈوبتی نیا کو سہارا دیں۔ اس کے گرے ہوئے اخلاق کو پھر سے اُبھاریں۔ اسکی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ واپس لائیں اسکے بگڑے ہوئے چلن کو درست کریں۔ اور اس کے اندر سے لا مذہبی تعصّب بغض۔ عناد۔ فساد۔ غیریت۔ کدورت، خودغرضی، نفاق، بداطواری اور اس قسم کی دیگر تمام خرابیوں کو دُور کرکے اس کے اندر مذہب پیار۔ باہمی اُلفت۔ آشتی۔ اُخوت۔ رواداری ایمانداری، خوش اخلاقی اور صدق دلی کے نیک جذبات کو پیدا کرکے اس کے نام کو اونچا کریں۔ جنابِ اقبال کی یہ تنبیہہ یاد رکھئے ؎

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھکو — کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
نہ سمجھو گے تو مِٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو — تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اگلے صفحوں میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ایسے سچے انسانوں کے کیا اوصاف ہوتے ہیں کہ جن کو حاصل کرکے وہ دنیا کے تختے کو بدل دیتے ہیں۔ زبردست ملکوں کو زیر کر لیتے ہیں۔ قوموں کو سمندر کی عمیق گہرائیوں سے نکال کر اوجِ کمال پر جا بٹھاتے ہیں۔ یہ دعوےٰ نہیں ہو سکتا۔ کہ جو کچھ عرض کرنا چاہیئے تھا وہ سب مکمل طور پر عرض کیا جا چکا ہے۔ لیکن جو کچھ بھی پیشِ نظر کیا جا رہا ہے۔ وہ دل کے سچے جذبات ہیں کئی اور بھی ضروری موضوع قابلِ عرض تھے۔ لیکن کتاب کے زیادہ ضخیم ہونے کے

خوف سے ان کو نہیں چھیڑا گیا۔ ان کیلئے مصنف کی دیگر تصانیف ملاحظہ فرمایئے۔

احقر جیسے کم فہم اور کمزور انسان کیلئے سچے انسان کے اوصاف بیان کرنا ایک بڑی مہم ہے۔ لیکن موجودہ حالات کے مشاہدے سے جو ولولے اور اُبال دل میں اُٹھتے ہیں۔ ان کو دبانا بھی ممکن نہیں۔ اپنی قدرت اور طاقت پر تو مصنف کو کوئی ناز نہیں اور زبان دانی سے تو وہ بالکل بے بہرہ ہے۔ لیکن اُس مالک برتر کی بارگاہ عالی میں دوزانو ہو کر اس مشکل کام کی تکمیل کے لئے طاقت عطا کرنے کی دعا کرتا ہوا اس کام کو ہاتھ میں لیتا ہے ؎

کمر کستا ہوں تیرے نام پر تو مجھکو ہمت دے
سہارے پر تیرے اُٹھا ہوں تیرا مدح خواں ہو کر

جہاں بھولوں بتا جس جا بہک جاؤں ہدایت کر
جو ہو لغزش تو مجھ کو تھام میرا مہرباں ہو کر

بھروسے پر تیری امداد کے بیڑا اُٹھایا ہے
میں اک کوہ کو اُٹھانے پر تُلا ہوں ناتواں ہو کر

کانشی رام چاولہ

۱۵ ستمبر ۱۹۳۸ء

اِنسان کیا ہے؟

گو بظاہر خاک کے پُتلے ہیں یکساں سب مگر
کوئی ہے اکسیر اِن میں اور کوئی خاک ہے

ویسے تو مالکِ کُل کی کائنات کا سارا کارخانہ ہی ایک عجوبہ ہے۔ انسان کی عقل اسکے سمجھنے سے قاصر ہے۔ یہ حقیر مٹی جسے ہم جسم اور لباس پر لگتے ہی پونچھ ڈالتے ہیں کس طرح سے رنگا رنگ کے پھل، پھول قسم قسم کے بیل بُوٹے طرح طرح کی خوردنی اشیاء ہزاروں قسم کی معدنیات اور قیمتی پتھر پیدا کرتی ہے۔ پھولوں کے اندر رنگ، دلکشی، اور خوشبو کیسے آجاتی ہے۔ پھلوں کے اندر خوبصورتی، مٹھاس اور لذّت کہاں سے پیدا ہوتی ہے۔ کس طرح سے ایک مقررہ اصول کے مطابق دن رات بڑھتے اور گھٹتے ہیں۔ مختلف موسم اپنا جوبن دکھاتے ہیں۔ سورج اور چاند وقت معینہ پر طلوع اور غروب ہوتے ہیں۔ آسمان کے اندر بجلی کس طرح چمکتی اور کڑکتی ہے اور پھر کس طرح سے لاکھوں من پانی کہیں سیّال شکل میں، کہیں دُھنی ہوئی روئی کی طرح برف کی شکل میں۔ کہیں فینائل کی گولیوں جیسے اولوں کی شکل میں زمین پر آتا ہے۔ کس طرح سے ایک چھوٹا سا بیج زمین میں دبکر اور گل سڑ کر دو ننھی ننھی پتّیوں کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور کیسے وہی بڑھ کر ایک بڑا بھاری درخت بن جاتا ہے۔ غرضیکہ قدرت کے یہ سارے کارخانے اِنسانی عقل کو دنگ کرنے والے ہیں ؎

یہ جتنے جلوے دکھا رہی ہے خدا کی صنعت، خدا کی حکمت
جو چاہے کھولے یہ بھید اُسکے کسی کو اتنی نہیں ہے قدرت

انسان نے بہتیری عقل دوڑائی ہے۔ بڑی چھان بین کی ہے۔ تلاش و تجسس میں حیران و سرگرداں مارا مارا پھرا ہے۔ بڑے بڑے عاقل و عالم سائینسدان قدرت کے ان رازوں کو سمجھنے کیلئے کوشاں رہے ہیں۔ اور اب بھی سعی کر رہے ہیں۔ لیکن ساری کوششوں کا نتیجہ وہ ہے جو نظیر نے بیان کیا ہے ؎

ارسطو لقمان اور فلاطوں ہر ایک سر کو پٹک چکا ہے!

یہ وہ طلسمات ہے کہ جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا ہے

اس میں کچھ شک نہیں کہ بعض انسان قدرت کے کرشموں کی جھلک سے یہ اندازہ لگا لیتے ہیں۔ کہ انہوں نے انتہا کو پا لیا ہے۔ لیکن وہ خود ہی کچھ عرصہ کے بعد محسوس کرتے ہیں۔ کہ جو کچھ انہوں نے معلوم کیا تھا۔ یا تو وہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ یا قصورِ فہم کے باعث ان کا اندازہ ہی غلط تھا۔ علمِ طب اور علم سائنس کے ہزاروں نئے نظریئے قائم کئے جاتے ہیں۔ اور اُن پر سینکڑوں عالم طبع آزمائی اور دماغ سوزی کر کے بڑی بڑی کتابیں لکھتے ہیں۔ لوگ ان کو تہنیت اور مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ لیکن چند سالوں کے بعد پتہ لگتا ہے کہ وہ نظریہ تو صرف فریبِ نظر اور قصورِ فہم کا نتیجہ تھا۔ یا جمالِ فطرت کی ایک نامکمل سی جھلک تھی۔ جس نے چشمِ دماغ کو خیرہ کر رکھا تھا۔ صدہا کاوشوں کے بعد پھر ایک اور نظریہ قائم کیا جاتا ہے۔ جسکو مکمل اور بے خطا سمجھ لیا جاتا ہے۔ لیکن کچھ مدت کے بعد اس کا حشر بھی ویسا ہی یاس انگیز اور ندامت خیز ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلی تحقیقات کا ہوا تھا۔ غرض کہنا پڑتا ہے ؎

قدرت کے جو ہیں بھید تصور سے دور ہیں ۔۔۔ فہم و خرد کو ان میں مداخلت نہیں!

انسان اس کائنات کے اندر کیا حقیقت رکھتا ہے۔ اس بات کا اندازہ سائینس دانوں کے تجربات اور مشاہدات سے کیا جا سکتا ہے۔ باوجودیکہ جو آلات اسوقت تک ان تجربات کے لئے تیار ہوئے ہیں وہ بجائے خود نامکمل اور کمزور ہیں۔ تاہم ان سے

بھی جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ انسانی ہستی کی حقیقت پر کافی روشنی ڈالتا ہے انسان کا قد پانچ فٹ سے سات فٹ تک ہوتا ہے۔ ہماری زمین جس پر ہم رہتے ہیں اس کا قطر آٹھ ہزار مربع میل ہے۔ اس زمین کے مقابلہ میں انسان کیا چیز ہے۔ وہ اس زمین کا رقبہ نکال کر اس کے فٹ بنا کر اس رقم کو سات سے تقسیم کرنے سے جو نتیجہ نکلیگا وہ انسان کی حقیقت کو بمقابلہ اس کی زمین کے بتائے گا۔ لیکن یہ زمین بجائے خود اس کائنات میں کیا حقیقت رکھتی ہے۔ اسکا تھوڑا سا حساب ایک نگاہ سے دیا جاتا ہے روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکینڈ ہے۔ چاند زمین سے دو لاکھ چالیس ہزار میل کی دوری پر واقع ہے۔ سورج سے روشنی کو زمین پر پہنچنے میں آٹھ منٹ لگتے ہیں۔ اب اس کی دوری کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ اب سورج کے ساتھ ساتھ اور اسکے گرداگرد جتنے سیارے ہیں انکو ہمارے سورج کا SOLAR SYSTEM یا نظام شمسی کہتے ہیں۔ اس کرہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک روشنی کو گذرنے میں دس گھنٹے لگتے ہیں۔ اس کرہ کے نزدیک ترین جو دوسرا سیارہ ہے وہاں سے روشنی کو زمین تک پہنچنے میں چار سال لگتے ہیں۔ سائنس والوں کی بنائی ہوئی مضبوط سے مضبوط اور طاقتور سے طاقتور دوربینیں اور خوردبینیں جس دور ترین سیارے کو اس وقت تک دیکھ سکی ہیں۔ وہاں سے روشنی زمین تک آنے کے لئے ایک ہزار سال کا عرصہ لگتا ہے بعض ایسے سیارے بیان کئے جاتے ہیں۔ کہ ان کی روشنی آجتک زمین پر پہنچی ہی نہیں۔ ان کی دوری کا اندازہ اب آپ خود لگا لیجئے!

یہ ہمارا سورج ہماری زمین سے کئی لاکھ گنا بڑا ہے۔ اور اس کے ارد گرد کتنے ہی سیارے اور ستارے ہیں۔ یہ سب کرہ مل کر ہماری زمین سے کروڑوں گنا بڑا ہے۔ لیکن اس کرے کی طرح کے اور ان گنت کرے ہیں۔ یعنی ایسے ہی لاحساب سورج ہیں۔ بلکہ ہمارا سورج ان کے مقابلہ میں وسعت اور روشنی کے لحاظ سے

متوسط درجے کا مانا گیا ہے۔ اب اس ساری کائنات کی وسعت کا حساب لگا کر جو کہ قریب قریب ناممکن ہے۔ دیکھو اور پھر انسان کی ہستی کا اندازہ لگاؤ۔ اگر انسان اس حساب کو لگا کر ہر روز اپنی ہستی کے متعلق غور کرے تو اس کا سارا غرور گھمنڈ بڑائی اور خودی دُور ہو جائے۔

انسان کی بے بسی اور بے بضاعتی میں بھی کوئی شک نہیں۔ ایک بڑے سے بڑے طاقتور جوان کی مسہری میں اگر ایک مچھر داخل ہو جائے تو اس کی نیند حرام کر دیتا ہے کان میں ایک چیونٹی چلی جائے تو آرام کا نام و نشان نہیں رہتا۔ آنکھ میں ایک تنکا یا ذرا سا کوئلہ پڑ جائے۔ تو بے چینی کی حد نہیں رہتی۔ سب سے بڑھ کر پھر موت کا بھوت اس پر ہر وقت سوار رہتا ہے۔ اور یہ ایسا زبردست ہے۔ کہ انسان کو اتنی بھی خبر نہیں کہ اگلا دم آئے گا بھی یا نہیں بے شک انسان ایسا ہی بے بس ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ قدرت کے ان سارے بھیدوں میں عقل لڑانے والا۔ ان رموز کی تہ میں غوطہ زنی کرنے والا۔ ان بعید از فہم مسائل کی گہرائی میں جانے والا بھی انسان ہی ہے۔ باوجودیکہ یہ مخلوق ہے۔ اس کی طاقتیں محدود ہیں۔ اور اپنے خالق کے مقابلہ میں اسکی کوئی حقیقت نہیں ؎

سمجھ کیا ہے اور کیا سمجھ کی بساط سمندر سے نطرے کا کیا ارتباط

تاہم انسان کو اس کے خالق نے بے اندازہ قدرت دی ہے بعض بعض کام جو انسان کرتا ہے درطۂ حیرت میں ڈالنے والے معجزنما ہوتے ہیں۔ مثلاً:۔

(الف) لنفو ینیا کے بڑے سردار گاؤن علیجاہ کی نسبت لکھا ہے۔ کہ جو کتاب وہ پڑھ لیتا تھا کبھی نہ بھولتا تھا۔ اس نے پچیس ہزار کتابیں حفظ کی ہوئی تھیں۔ انجیل مقدس۔ مدارش میکلتا۔ سفر توصیفتہ۔ سیدر اولام۔ تالمدس۔ زدہار۔ کوڈ سداشی رمم بم سب اسکو زبانی یاد تھیں۔

(ب) لے کر دنیا کے بارہ سطور نظم کی بارہ مختلف نا آشنا زبانوں میں بیک وقت سن کر اُن کو زبانی سنا دیتا تھا - اس میں ذرّہ بھر غلطی نہ ہوتی تھی -

(ج) گیمبٹیا کی قوت حافظہ ایسی تیز تھی کہ وہ ایک کتاب کو پڑھ کر شروع سے آخیر تک اور آخیر سے شروع تک اُلٹا سیدھا دونو طرف سے زبانی پڑھ کر سنا سکتا تھا اس میں کوئی دِقّت محسوس نہ کرتا تھا -

(د) کئی آدمی آگ پر چلنا - آگ کھانا - سانپ کھانا - کانچ کھانا - زہر پینا - اور ہیچ قسم کے دیگر کئی اور متعجب انگیز کام کرتے ہیں -

(ہ) روحانیت کے معجزات تو بیان کی طاقت سے ہی باہر ہیں -

علاوہ ازیں یہی خاک کا پُتلا ہے - کہ جو قدرت کے چھپے ہوئے بھیدوں کو کھولتا ہے - ایک چھوٹی سی ہستی رکھتا ہوا شیروں اور ہاتھیوں پر قابو پاتا ہے - ان کو بھرے مجمعوں میں ناچ نچاتا ہے - بجلی کی ایک چمک سے خاک سیاہ ہو جانے والا یہی خاک کا پُتلا اپنی تحقیق اور عقل کے زور سے اُس کو اپنی داسی بنا کر اس سے اپنے سارے کام کرواتا ہے - دریا اور سمندر کے سینے پر سوار ہوتا ہے - پر نہیں رکھتا لیکن آسمان میں تھگلی لگاتا ہے - غرضیکہ قدرت کی ساری چیزوں پر اپنی حکومت کا سکّہ بٹھانے کی کوشش کرتا ہے - بلکہ اس خالق کی بھی کہ جو نہ شکل رکھتا ہے - نہ رنگ - جو بیچوں و بے نمو ہے - بلکہ علم و ادراک کی زد سے بھی پرے ہے - ذات کو پہچانتا ہے سے

جدا ہے فہم سے اور وہم سے وہ سمجھ لے جسکو بندہ وہ خدا کیا ہے

غرضیکہ اس وراء الورا ہر طرح نہاں اور ہر جگہ آشکارا ہستی کے اسرار اس قدر پوشیدہ ہیں کہ اُن کی تہ کو پانا تو درکنار اُن کا فہم میں لانا ہی دشوار ہے اور ان کا بیان کرنا تو زبان و قلم کی طاقت سے ہر طرح باہر ہے - وہاں مدعیانِ علم و عقل جس قدر شور مچا رہے ہیں اسی قدر اپنی بے خبری اور بے صبری کا ثبوت بہم پہنچا رہے ہیں - اس

بارے میں تو انسان یہی کہہ سکتا ہے کہ ؎

کچھ نہ سمجھے ہو تو پوچھو کہ وہ کیا چیز ہے — نام تم نے سُن لیا ہے زاہدو اللہ کا!

ایسا ہوتے ہوئے بھی یہ مٹی کا پتلا بلا کی چیز ہے کہ اس بے پتہ کا بھی پتہ لگا لیتا ہے۔ وہ ہزار پردوں میں چھپ کر رہتا ہے۔ لطیف ترین ہے۔ لیکن اس کی نظر بھی سارے پردوں کو ایکس ریز (X.RAYS) کی طرح سے چیرتی ہوئی اس کی جھانکی لگا لیتی ہے۔ اس کا جلال اتنا ہے کہ فرشتوں کے پر جلتے ہیں، پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ اس جلال کی کوہ طور پر موسیٰ تاب نہ لا سکے۔ لیکن یہ ساڑھے تین ہاتھ کا پتلا اس جلوے کی روشنی میں جا پہنچتا ہے۔ قلقاریاں مارتا ہے قلابازیاں لگاتا ہے۔ بلکہ بعض حالتوں میں تو یہاں تک غضب کرتا ہے کہ اسے دیکھ کر وہ ساری قدرت اور حکمت کا مالک اتنا خوش ہوتا ہے کہ اس کے پاس آکر اس کی معصوم حرکتیں دیکھ کر اتنا محظوظ ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ خود بھی کھیلنے لگ جاتا ہے۔ اور اگر اس کھیل کود کے دوران میں انسان گر پڑے تو اسے وہ خود ہی اٹھاتا ہے۔ اس سے پیار کرتا ہے۔ کبھی اس کو پھیر بیٹھے تو عرش سے اتر کر اس کے دکھ دور کرتا ہے اسے خود اپنے ہاتھوں سے کھلا پلا کر خوشی محسوس کرتا ہے۔ یہ کوئی مبالغہ آمیزی یا قصہ گوئی یا افسانہ نویسی نہیں۔ بلکہ ایک وجدانی حقیقت ہے۔ کہ ع "محبت کے بس میں ہیں بھگوان"

وہ قادر مطلق اپنے پیاروں کے ساتھ بلا شبہ اسی طرح سے برتاؤ کرتا ہے جو بھائی ان باتوں کے قائل نہیں۔ ان کو یقین دلانا مشکل ہے کیونکہ کوئی دلیل ان باتوں کی تصدیق نہیں کرسکتی۔ یہ وجدان و عرفان کی باتیں ہیں۔ اس لئے جو انسان اپنے اندر اس روشنی کا سامان مہیا کر لیتا ہے وہی ان اعجازوں کا لطف اٹھا سکتا ہے جیسے آپ نے دیکھا ہوگا دیہات میں اور بعض دفعہ شہروں میں بھی بعض غریب عورتیں ایک بکس کے اندر کچھ تصاویر اور اسکے ایک طرف خوردبین کے والا شیشے لگا کر

بچوں کو تصویریں دکھانے آتی ہیں۔ جو بچہ دونوں ہاتھوں سے باہر کی روشنی کو روک کر نگاہ کو شیشے پر لگا کر اندر کی طرف دیکھتا ہے وہ کہنے لگ جاتا ہے آہاہا! کتنے بڑے مکان کیسے خوبصورت گھوڑے! ہَودے والے ہاتھی! اونچے اونچے پہاڑ وغیرہ وغیرہ پاس کھڑے بچے جنہوں نے یہ تصویریں ابھی نہیں دیکھی ہیں۔ کہتے ہیں "بیوقوف! اس ذرا سی جگہ کے اندر یہ ساری چیزیں کیسے سما سکتی ہیں۔" حالانکہ وہ ان ساری چیزوں کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہے اُن سے محظوظ ہو رہا ہے تاہم وہ اُن دوسرے لڑکوں کو کس طرح یقین دلائے۔ کیا اس کی کوئی بھی دلیل ان کو منوا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ اس کو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ کہے کہ بھئی آؤ! تم بھی باہر کی روشنی کو پرے ہٹا دو نگاہ لگاؤ۔ اور خوب دھیان لگا کر اندر کو جھانکو تو تم کو بھی وہ سب نظارے دکھائی دینگے۔ ان لڑکوں میں سے جو بھی ایسا کرتا ہے وہ بھی پہلے لڑکے کی طرح خوشی سے اُچھلنے کودنے لگ جاتا ہے۔ لیکن جو باہر ہی کھڑا رہ کر اس ضد پر قائم رہے۔ کہ دلیل سے ثابت کرو۔ کہ تم سچ کہہ رہے ہو۔ اس کا کوئی علاج نہیں جس طرح اس لڑکے کو دلیل سے قائل کرانا ممکن نہیں۔ ایسے ہی اُن بھائیوں کو ان نظاروں کی نسبت دلیل سے نہیں سمجھایا جا سکتا۔ اگر وہ حقیقتاً اُن سے لطف اُٹھانا چاہتے ہیں۔ تو انہیں بھی دنیا کی چمک سے پرے ہٹ کر اپنے دل کو قائم کر کے اپنے اندر نگاہ ڈالنی ہوگی۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ غرض یہ ہے کہ جہاں اس صانع مطلق کی صنعت کے کارخانے عجیب ہیں۔ ان کو عجیب کہنے والا انسان خود سب سے بڑا عجوبۂ روزگار ہے۔

اس صانع حقیقی کی باقی قدرت بھی حیرت خیز ہے۔ لیکن یہ خاکی پتلا اُن سب سے بڑھ کر حیرت میں ڈالنے والا ہے۔ اس کی بناوٹ میں اس کاریگر نے اپنی صناعی کا کمال دکھلایا ہے۔ اول تو انسانی جسم کی سی کل کیا بناوٹ کی خوبی کے لحاظ سے اور کیا مشینری کی لطافت اور باریکی کے خیال سے اپنا جواب آپ ہے۔ اسکی چھوٹی سی آنکھ کے اندر

نور کا موجود ہونا۔ اور اُس آنکھ کی پتلی میں بڑے بڑے مکانات، پہاڑ حتی کہ آسمان تک کا سما جانا ایک بے نظیر کرشمہ ہے۔ انسان کا دماغ اس سے بھی بڑھکر عجوبہ ہے۔ ایک آدمی جو کئی زبانیں جانتا ہے۔ وہ جس زبان میں بھی تقریر یا تحریر کرنے لگتا ہے۔ اسی زبان کے الفاظ کا ذخیرہ جھٹ اِس دماغ کے پٹارے میں سے نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔ اور الفاظ کی ایک رَو جاری ہو جاتی ہے۔ اور وہ اس طرح سے نکلتی چلی آتی ہے۔ کہ جس طرح سے بھگوان نے دروپدی کو کورو سبھا میں بے حرمتی سے بچانے کے لئے اس کی دھوتی کا سلسلہ اٹوٹ کر دیا تھا۔ پھر اگر پڑھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ تو جس پڑھی ہوئی زبان کی کتاب لیکر بیٹھو۔ دماغ اس کے حروف و الفاظ کو ایسی سرعت سے سمجھتا چلا جاتا ہے۔ جیسے بجلی کی لہریں اپنی مسافت طے کرتی ہیں۔ جیسے ہوا کے اندر ہوائی جہاز اُڑتا ہے یا جیسے مچھلی پانی میں تیرتی ہے ؎

حکمت سے ہے یہ خاک کا پُتلا بنا ہُوا — نُور آنکھ میں ہے اُسکا تو مغز استخواں میں ہے

خود انسان ایک یا دو من سے زیادہ بوجھ نہیں اُٹھا سکتا۔ لیکن اس کے دماغ نے وہ کلیں ایجاد کی ہیں کہ جو ہزاروں من بوجھ ایک دم اُٹھا سکتی ہیں۔ باریک سے باریک اشیاء کو دیکھنے کے لئے آلات تیار کئے ہیں۔ اپنے اندر تک کی حالت کو جانچ لینے کے لئے سامان مہیا کر لیا ہے۔ دور سے دور چیزوں کی ماہیت کو جاننے کے لئے اسباب طیار کئے ہیں۔ غرضیکہ انسان اس کائنات کے اندر عجیب ترین مخلوق ہے۔ ذرا غور کیجئے تو بے اختیار کہنا پڑتا ہے ؎

ہے آدمی بجائے خود اک منبعِ کمال — گر سعی ہو تو دیکھ لے تو شانِ ذوالجلال

کیفیتیں بھری ہیں خاکی میں تو نے کیا کیا
کیا کیا چھلک رہا ہے جامِ سفال تیرا (اکبر)

ایک فارسی شاعر نے اسی موضوع کو اس طرح سے لکھا ہے ؎

اگر بہ نسخہ تشریح جسم درنگری — شرح صنع دہی جلد مختصر یابی

ترجمہ:- اگر تو انسانی جسم کی شرح کی کتاب میں نگاہ ڈالے۔ تو اس مختصر سی کتاب میں قدرت کی ساری تشریحات کو دیکھ پائے گا۔

حقیقت میں اُس صانع ازلی نے اس خاک کے پتلے کو وہ شرف بخشا ہے اور اس میں اپنی حکمت اور صناعی کا وہ کمال دکھایا ہے کہ اسکی کوئی دوسری مثال نہیں ہے

بنایا آدمی کو ذوق اِک جزوِ لطیف سے — اور اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کے لئے

اُس دربارِ عالی میں انسان کا شرفِ قبولیت دیکھ کر فرشتے بھی رشک کرتے ہیں۔ جس مقام پر یہ جا پہنچا ہے وہاں دیگر ملائک و دیگر خلائق کی رسائی نہیں ہے جو قدر و منزلت اسکو حاصل ہوتی ہے۔ اس کو دیوتا تک ترستے ہیں سے

آمیز اسکی ہے لامکاں تک رسائی — فرشتے سے بھی کچھ سوا آدمی ہے

دیوتا- گندھرب ، اچھرا- کینر اور فرشتے ہر وقت خدا کی حمد و ثنا میں لگے رہتے ہیں۔ ان کا ہر گھڑی کام ہی یہی ہے۔ ان کو بارگاہِ عالی کا قرب بھی حاصل ہے لیکن جب انسان بلند پروازی کرتا ہے تو وہاں پہنچتا ہے جہاں مقربین سماوی کو بھی باریابی نہیں۔ آسمان کے رہنے والے فرشتے اس مقام تک کی رسائی کو ترستے ہیں سے

باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے — پہنچا اُس جا کہ فرشتوں کا بھی مقدور نہ تھا

لیکن ایک سوال ہوتا ہے کیا ہر ایک انسان کو ایسا شرف اور عزت حاصل ہوتی ہے؟ کیا ہر ایک انسان کی نسبت یہ کہہ سکتے ہیں کہ سے

فرشتے بھی دیکھیں تو تکتے جائیں آنکھیں — بشر کو وہ جلوے دکھائے گئے ہیں

نہیں ایسی بات نہیں۔ یہ توقیر اُسی کو حاصل ہوتی ہے۔ جو انسان خلعتِ انسانیت سے مزین ہے اگر اس جوہر سے بے بہرہ ہے تو اس کی گراوٹ کی، اس کی ضلالت کی۔ اس کی خواری کی کوئی حد نہیں ہوتی سے

شیطان بھی اماں مانگتا ہے اُنکے عمل سے — کیا حضرت آدم کی بھی اولاد غضب ہے

یہ عجوبۂ روزگار مخلوق جس طرف جھک جائے اسی طرف ہی غضب ڈھاتا ہے بھلائی اور خوبی کی طرف جھکے تو فرشتے اس پر رشک کھائیں۔ بدی اور بداعمالی کی طرف راغب ہو تو شیطان پناہ مانگے۔

مخلوقِ الٰہی میں عمل پر جو نظر کر — انسان سے بدتر ہے نہ انسان سے بہتر

انسان کی اس مختلف الحالی کو دیکھ کر اور اس کی طبع اور اعمال میں بُعد المشرقین پر نظر کرکے ہی تو کسی نے کہا ہے ؎

شیطان کا شیطان فرشتہ کا فرشتہ — انسان کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی !!

جب یہ شیطنت کی طرف مائل ہوتا ہے تو پھر نہ یہ گورو کا نہ پیر کا۔ اگر موت کی تلوار اس کے سلسلۂ حیات کو منقطع نہ کرے۔ تو شیطنت کے رستہ پر جاتا ہوا انسان نہ جانے کیا غضب ڈھائے اور کیا آفت برپا کرے ؎

بس اک موت سے ابنِ آدم ہے عاجز — وگرنہ نہ تھا یہ کسی کے بھی بس کا

غرضیکہ انسان عجیب جوں چوں کا مُربہ ہے اسکی عقل اور ہوش کے کارناموں کو دیکھیں تب بھی حیرانی ہوتی ہے اور اگر اس کی جہالت اور گراوٹ کے کارناموں پر نگاہ ڈالیں تو بھی ع "بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است" کہنا پڑتا ہے ؎

سچ پوچھئے تو ملنا ممکن نہیں جہاں میں
دانا بھی آدمی سا، نادان بھی بشر سا (بیدل)

وہ بھی انسان ہے جو دوسرے کے آرام کے لئے، دوسرے کی تکلیف رفع کرنے کے لئے اپنا گھر بار تک قربان کر دیتا ہے۔ دوسرے کی حفاظت اور جان بچانے کے لئے اپنی جان پر کھیل جاتا ہے لیکن وہ بھی انسان ہے کہ چند پیسوں کے لالچ سے دوسرے انسان کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ اپنے انتقام کے جذبہ کو

تسکین دینے کے لئے دوسرے کی جان کا لاگو ہو جاتا ہے۔ اپنے پیٹ کیلئے یا اپنی زبان کے چسکے کیلئے دوسروں پر چھری چلاتا ہے۔ یا مذہب کے فرض کو غلط طور پر سمجھ کر اپنے بھائیوں کو تہِ تیغ کرتا ہے۔ اور اس سے ثواب حاصل کرنے یا سورگ یا بہشت میں جانے کی توقع رکھتا ہے ؎

کوئی ہے کافر کوئی مسلماں، جُدا ہر اک کی ہے راہِ ایماں
جو اس کے نزدیک رہبری ہے وہ اسکے نزدیک رہزنی ہے

غرضیکہ انسانی فطرت کا اندازہ لگانا مشکل ہے اس کی متضاد حالتیں خیال کی طاقت سے باہر ہیں۔ جہاں ایک طرف راجہ شوی کبوتر کی جان بچانے کیلئے اپنے جسم کا گوشت کاٹ کر دے دیتا ہے۔ وہاں راجہ کنس اپنی بہن کی اولاد کو ایک ایک کر کے اپنے ہاتھوں سے ہلاک کرتا ہے۔ یہ دونو انسان تھے لیکن اعمال میں قطبین کا فرق ہے ؎

عجب حالت ہے انساں کی نرالے اسکے ہیں جوہر
کہ نیکی اور بدی کا یہ پراگندہ ہے اک دفتر
نہ بھولو اسکی بھولی بھالی صورت پر کبھی عارف
یہ ہے اک طرفہ معجون جسکی خاصیت ہے طرفہ تر

انسانی طبائع کی اس نیرنگی کو نظیر نے کیا اچھا بیان کیا ہے ؎

پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نمازیاں
اور آدمی ہی اُن کی چُراتے ہیں جُوتیاں
چلتا ہے آدمی ہی مسافر ہوکے مال
اور آدمی ہی مارے ہے پھانسی گلے میں ڈال
یاں آدمی ہی چور ہے اور آدمی ہی چھال
سچا بھی آدمی ہی نکلتا ہے میرے لال
یاں آدمی ہی لڑتے ہیں قہر سے گھور گھور
اور آدمی ہی دیکھ اُنہیں بھاگتے ہیں دُور

انسان کون ہے؟

ہے اُنس مادہ اِس کا محبت اس کا خمیر
یہی سبب ہے جو انسان نام اس کا ہوا

ظاہرا طور پر تو یہ سوال بچوں کا سا معلوم ہوتا ہے کہ انسان کون ہے؟ کیونکہ اس کا جواب صاف ہے کہ انسان وہ ہے جو اس روئے زمین کی اشرف المخلوقات دو ہاتھ۔ دو پاؤں، دو آنکھیں، دو کان، ناک وغیرہ اور دل و دماغ رکھنے والا کم و بیش ساڑھے تین ہاتھ لمبا مٹی کا چلتا پھرتا پتلا ہے۔ انسان کی یہ تعریف ظاہرہ تو جچتی ہے۔ لیکن کیا حقیقتاً جس ہستی میں مندرجہ بالا اوصاف پائے جاتے ہوں۔ اسے انسان کہا جا سکتا ہے؟ مخلوق کی تقسیم کے لحاظ سے تو شاید یہ تعریف ٹھیک ہو لیکن انسانیت کے لحاظ سے نہیں۔ انسانیت کے نقطۂ نگاہ سے تو یہ بات ہے کہ ؎

ہو نہ کچھ انسانیت انساں میں تو پھر انسان کیا
اے ظفر گرچہ ہوا ظاہر میں وہ انساں کی شکل

ایسے چلتے پھرتے پتلے تو بے شمار ہیں۔ اگرچہ حکومتیں مردم شماری کر کے تمام بنی نوع انسان کی تعداد کو معلوم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ لیکن افریقہ کے جنگلوں کے حبشیوں اور دیگر ہمچو قسم کی خلائق کی گنتی کرنا ممکن نہیں ہے غرضیکہ اَن گنت انسانی پتلے اس کائنات میں موجود ہیں۔ لیکن ؎

آدمی کہتے ہیں جن کو کم ہیں دنیا میں وہ لوگ!
یوں تو سب اولادِ آدم سے یہ بستی ہے بھری

اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ ظاہرا بناوٹ کے لحاظ سے تو انسان انسان میں کوئی

نمایاں فرق دکھائی نہیں دیتا۔ سب کے دو ہاتھ اور دو پاؤں وغیرہ ہیں۔ سب کے ہی چہروں پر آنکھیں اور ناک لگی ہوئی ہیں۔ سب کا ہی سر اُوپر اور پاؤں نیچے ہیں۔ سب کے ہی کندھوں میں سے ہاتھ کی شاخیں پھوٹ کر نکلی ہوئی ہیں۔ لیکن ؎

بظاہر سب مساوی ہیں مگر ہے فرق باطن میں
نہ ہر سینے میں حکمت ہے نہ ہر جا پہ فلاطوں ہے

بظاہر سب پتھر ایک سے ہوتے ہیں۔ بناوٹ کے لحاظ سے، سائنس کی رُو سے ان کی ماہیت میں ذرّہ بھر فرق نہیں ہوتا۔ لیکن اُن کی قدر و قیمت جدا جدا ہوتی ہے۔ ایک پتھر سڑکوں پر کُوٹے جاتے ہیں۔ ایک پتھر تاج شاہی میں نصب ہو کر شہنشاہوں اور مہاراجوں کے سر پر جگہ پاتے ہیں۔ کیونکہ ؎

خوبیِ جوہر سے پاتی ہے ہر اک شے امتیاز
لعل بھی پتھر ہی ہے، لیکن وہ پتھر اور ہے

ہر ایک چیز کا اپنا اپنا وصف اور جوہر ہوتا ہے۔ اس وصف یا گُن کے رہنے سے وہ چیز امتیازی درجہ پاتی ہے۔ جونہی وہ چیز اپنے اس ذاتی جوہر کو چھوڑ دیتی ہے اسی وقت وہ اپنی قسم کی قطار سے باہر ہو جاتی ہے۔ ذاتی وصف کی موجودگی ہی اس شے کی زندگی ہے۔ مثلاً ویسے تو نرمی اور لطافت اعلیٰ وصف شمار ہوتے ہیں۔ اشیاء خوردنی یعنی پھل پھول، سبزی ترکاری اور پارچات پوشیدنی میں جسقدر لطافت اور نرمی ہو اس قدر ہی وہ زیادہ مرغوبِ خاطر ہوتی ہے اور زیادہ قیمت پاتی ہے۔ لیکن جب لکڑی اور لوہے کی چیز درکار ہوتی ہے تو وہ جس قدر سخت مل سکے حاصل کی جاتی ہے ؎

جوہرِ ذات بھی لازم ہے ہر اک شے کے لئے
موم سا نرم ہو یہ خوبیِ فولاد نہیں! (رند)

اسی طرح سے انسان میں انسانیت کا جوہر ہونا لازمی ہے ورنہ وہ انسان کہلانے کا مستحق نہیں محض شکلِ انسانی ہونے سے یا پاکیزہ اور قیمتی لباس پہننے سے ہر ایک انسان انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا۔ صرف ظاہری بناوٹ اور سجاوٹ ہی انسان کہلانے کا معیار نہیں ہے۔ حقیقت میں تو سجاوٹ اور اعلیٰ پوشاک بھی زیب تن کرنے کا اُسی کو حق ہے جس میں انسانیت کا وصف ہے۔ جو اس ذاتی خوبی سے محروم ہے وہ اعلےٰ پوشاک پہننے کا حقدار نہیں ہے

آدمیت ہے تو ہے زیبا لباسِ فاخرہ
ورنہ اک خر ہے کہ ہے جس پر پڑا اطلس کا جھول

دھاتیں یعنی سونا، چاندی، پلاٹینم وغیرہ پتھروں کے اندر سے نکلتی ہیں لیکن ہر ایک پتھر کے اندر وہ موجود نہیں ہوتیں جس مقام پر دھاتوں کی کان ہو اس مقام کی بڑی توقیر ہوتی ہے۔ بڑی احتیاط سے اس مقام کو کھودا جاتا ہے۔ اس مقام سے کھودے ہوئے پتھر کنکر کا ایک ایک ذرّہ بڑی ہوشیاری سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ لیکن جن پہاڑوں میں یہ قیمتی چیزیں نہیں پائی جاتیں۔ ان کو بارود کے ذریعے اڑایا جاتا ہے۔ وہاں سے پتھر کاٹ کاٹ کر سڑکوں پر اور ریل کی پٹڑی پر ڈالنے کے لئے مصالحہ تیار کیا جاتا ہے۔ قدر و منزلت اُسی مقام کی ہوتی ہے۔ جہاں پتھروں میں دھاتیں موجود ہیں

گرچہ سیم و زر ز سنگ آمد ہے　　　در ہمہ سنگہا نہ باشد سیم و زر

ترجمہ۔ اگرچہ سونا، چاندی پتھر کے اندر سے ہی برآمد ہوتے ہیں۔ لیکن ہر ایک پتھر میں تو سونا چاندی موجود نہیں ہوتے۔

اسی طرح سے انسانی شکل والے خاکی پتلے تو بہتیرے ہیں۔ لیکن جن کے پاس آدمیت کا سیم و زر ہو وہ خال خال ہیں

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

انسان اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے۔ کیوں؟ اس میں کیا خوبی ہے۔ کون سا وصف ہے جس سے وہ سب سے برتر گنا جاتا ہے۔ کھانا پینا، چلنا پھرنا، سونا جاگنا۔ اٹھنا بیٹھنا۔ پیدا ہونا مرجانا وغیرہ تو حیوانوں میں بھی ویسے ہی ہیں کہ جیسے انسانوں میں۔ بلکہ کئی صورتوں میں حیوانات انسان سے فائق ہیں یعنی وہ اس سے زیادہ کھاتے پیتے ہیں۔ زیادہ طاقت سے چلتے پھرتے ہیں۔ زیادہ زور کے کام کاج کرتے ہیں۔ تو بایں ہمہ اسے کیوں یہ شرف حاصل ہے کہ اسے احسن المخلوق کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ غور کرنے سے پتہ چلے گا۔ کہ اس کو سب پر فضیلت اور بزرگی دلانے کا وصف "انسانیت" ہے۔ اگر انسانیت اس میں سے نکال لی جائے تو انسان نہ صرف حیوانوں کے برابر ہو جائے گا۔ بلکہ ان سے بھی رذیل تر حیوان اتنی بد اعمالی نہیں کرتے جتنی کہ انسانیت سے عاری انسان ؎

اگر انساں ہو حق انساں سے غافل کیا شک کہ بہائم ہیں اس انساں سے بہتر

انسانیت سے بے بہرہ انسان حیوانوں سے بھی کہیں بدتر ہوتا ہے کیونکہ حیوان تو بڑے کام کی چیز ہیں۔ وہ دنیا میں بہت مفید کام کرتے ہیں سینکڑوں طرح کی خدمت بجا لاتے ہیں لیکن جو انسانیت سے گرا ہوا انسان ہے وہ انسانوں کے قطار و شمار سے تو باہر ہو ہی چکا ہے۔ مزید برآں وہ حیوانوں کے کام بھی نہیں کر سکتا کہ جس سے وہ اُن کی ذیل میں ہی گنا جا سکے۔ اس طرح سے وہ حیوانوں سے بھی ادنےٰ تر ہے۔ پس اشرف المخلوقات تو یہ تبھی کہلا سکتا ہے کہ اگر یہ انسانیت کے جوہر سے بہرہ ور ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ انسان وہ درجہ پاتا ہے۔ جو کسی دوسری ارضی و سماوی۔ نوری و ناری مخلوق کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کو اس مقام میں باریابی ہو سکتی ہے۔ کہ جہاں دیگر خلائق کو پاس پھٹکنے تک کی مجال نہیں ؎

پَر فرشتوں کے جہاں جلتے ہیں واں بُلوا لیا
واہ! کیا رتبہ دیا خالق نے آدم زاد کو (رہبر آر)

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ جملہ خلائق کا پیشرو ہے۔ خلیفہ ہے۔ رہبر ہے اس کی خلافت مسلّمہ ہے اس کی برتری سے کسی کو انکار نہیں حقیقتاً خلافتِ الٰہی کے لئے اور کوئی دعویدار بھی نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی اپنے آپ کو مستحق ثابت کر سکتا ہے ؎

مکتبِ صُبحِ ازل کا خلیفہ انساں
پھر کرے کون اگر یہ ہی خلافت نہ کرے

یہ بھی درست ہے کہ اس خاکی پُتلے کو فرشتوں سے سجدہ کرایا گیا۔ اور دیوتا لوگ خواہشمند رہتے ہیں کہ انہیں پیکرِ انسانی ملے۔ اس مٹی کے پُتلے کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کرنے والا شیطان بنایا گیا۔ آج تک اس پر لعنت وپھٹکار پڑتی ہے اور وہ بدی کے لئے ضرب المثل بن گیا ہے۔ لیکن سوال ہو سکتا ہے کہ ؎

ہو گئے جس سے ملائک یہ سجودِ تہِ خاک
نہیں معلوم کہ وہ چیز ہے انسان میں کیا

وہ چیز، وہ خوبی، وہ جوہر، وہ وصف، وہ گُن کوئی معجزہ گری نہیں۔ کوئی جسمانی طاقت نہیں۔ کوئی جاہ وجلال، شوکت وصولت نہیں۔ کوئی رُعب بدبہ نہیں بلکہ وہ چیز وہ ہے کہ جو حضرت ذوقؔ ارشاد فرماتے ہیں ع

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ

آدمیت اس کے اندر سے نکال دو تو اس کی خلافت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی رہبری قبول کرنا تو درکنار، اس کی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر دیکھنا گوارا نہ کرے گا۔ آدمیت سے بے بہرہ آدمی حیوان بصورتِ انسان ہوتا ہے ؎

آدمیت اگر شعارے نیست
جُز بحیوانیت شمارے نیست

ترجمہ:۔ اگر انسان کا شیوہ آدمیت نہیں ہے تو اس کی گنتی حیوانوں کی ٹولی کے سوا

کہیں نہیں کی جا سکتی۔"

پس اس سوال کا جواب کہ "انسان کون ہے؟" یہی ہے کہ جس کے اندر انسانیت ہے۔ آدمیت ہے۔ منشیناً ہے۔ منشیناً کے بغیر نہ یہ اشرف المخلوقات ہے۔ نہ فرشتوں اور دیوتاؤں کے لئے قابلِ رشک۔ بلکہ اس کا شمار انسانوں کے زمرہ میں ہی نہیں ہو سکتا ؎

جہاں میں رہ کے جن لوگوں میں رہتی کج ادائی ہے
وہ اِک گتے ہیں گرچہ شکل انسانوں کی پائی ہے (حشر)

جو انسان آدمیت کو تلانجلی دے بیٹھا ہے اس کا تیاگ کر بیٹھا ہے۔ اس سے کسی قسم کی نیک امید نہیں رکھی جا سکتی۔ اس سے کوئی بھی بھلی توقع باندھنا بچپن ہوگا ؎

اے ظفر اس سے محبت کی توقع مت رکھ
آدمیت کا جو رکھتا نہیں انسان طریق

اس وصف کو چھوڑ کر اس خوبی سے بے بہرہ ہو کر خواہ کچھ بھی سج دھج انسان بنا دے کوئی بھی اسباب مہیا کرے کیسی ہی زیبائش و آرائش بنائے وہ انسان نہیں کہلا سکتا۔ کیونکہ اس کا جوہر ذاتی غائب ہو چکا ہے۔ باہر کی نمود اور سجاوٹ اس کو انسان بننے کا درجہ نہیں دلا سکتی۔

گردنِ خر میں جیسے طوقِ زر اور ہو جُھولِ طلائی پشت پر
چال میں بھی تبختر گر کرے اسپِ تازی اسکو کہنے سے رہے
اسپِ تازی ہوا گر دُبلا کمال صحت سے چلنا بھی اسکا ہو محال
ٹھوکریں گو ہر قدم پر کھائے گا
پر گدھا ہرگز نہ وہ کہلائے گا (عارف)

اِنسانیت کیا ہے؟

درد دل پاس وفا جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

یہ عرض ہو چکا ہے کہ انسان کہلانے کا حقدار اور آدمیوں کے شمار و قطار میں جگہ پانے والا وہی انسان ہو سکتا ہے جو انسانیت کا جوہر اپنے اندر رکھتا ہے اب یہ دیکھنا ہے کہ انسانیت کس چیز کا نام ہے کہ جس کے ہونے سے انسان فرشتوں سے بھی بڑھ کر اپنے مالک کی نظروں میں قابل قدر بن جاتا ہے۔ دیوتاؤں کے لئے قابل رشک بن جاتا ہے اور جس کے نہ ہونے سے حیوانوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے اس سوال کا جواب سوز گیا شی گلستاں کے اس شعر میں بڑی خوبی سے دیا گیا ہے جو اس مضمون کا طرۂ ہوا ہے حضرت اکبر مرحوم بھی کیا خوب فرما گئے ہیں ؎

ہے اُنس مادہ اس کا محبت اس کا خمیر
یہی سبب ہے جو انسان نام اسکا ہوا

بس یہی انسانیت کی کسوٹی ہے یہی معیار ہے یہی پیمانہ ہے۔ یہی تول ہے۔ یہی ماپ ہے یعنی جو انسان جس حد تک اُنس کے جوہر سے بہرہ ور ہے اتنا ہی وہ انسانیت کے نزدیک تر ہے اور جس قدر اس جذبہ کی اس میں کمی ہے۔ اتنا ہی وہ انسانیت سے دور ہے۔

انسانیت کا یہی جوہر ہے اور اسی سے انسان انسان کہلانے کا مستحق ہے۔ ہر ایک چیز اپنے ذاتی وصف کے باعث ہی اپنا مخصوص نام پاتی ہے۔ آگ اسی

وقت تک ساگ ہے کہ جب تک اس میں سوز اور تپش موجود ہے۔ یہ نہ ہو تو وہ خاکستر ہے جسے چیونٹیاں بھی روندا کرتی ہیں۔ پھول رنگ و بو کا ایک خاص وضع کی خوشنما پتیوں میں نشوونما و ظہور کی کیفیتیں دکھانے کا نام ہے۔ یہ نہ ہو تو کاغذ کی صنعت گری ہے یا کھاد کی پتیاں ہیں ؎

حسنِ صورت محض بے رونق ہے سیرت کے بدون
جن گلوں میں بو نہیں وہ خوشنما کہنے کو ہیں!

اگر جوہرِ ذاتی کی موجودگی موصوف کے لئے لازمی نہ ہو تو دنیا میں قدر و منزلت کے درجے اُڑ جائیں۔ گھوڑا گدھا برابر ہو جائیں۔ ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا والا معاملہ ہو جائے۔ اگر ہر ایک چمکنے والی چیز سونا ہو تو سونا ایسی گراں بہا چیز نہ رہے لوگ اُسے سنبھال کر لوہے کی مضبوط الماریوں میں تالوں کے اندر محفوظ نہ رکھیں۔ وہ پتھر جس کے چھونے سے لوہا سونا بن جاتا ہے ایک خاص قسم کا پتھر ہے۔ ہر ایک پتھر ایسا نہیں بن سکتا۔ اس پتھر کی خاصیتیں عام پتھروں سے بالکل علیحدہ ہیں جس کی وجہ سے وہ کمیاب ہی نہیں بلکہ نایاب ہے۔ ہر ایک پتھر پارس بننے کا دعویٰ کرے تو نیک و بد کی تمیز دنیا سے اُٹھ جائے ؎

باقی رہے تمیز نہ پھر خوب و زشت میں
پارس کے ہوں خواص جو ہر سنگ و خشت میں!

ایسے ہی ہر ایک انسان انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ پارس انسان وہی ہے کہ جو انس کے محبت کے اور پریم کے وصف سے متصف ہے۔ ورنہ وہ سنگِ راہ ہے کہ جس سے ہر راہرو ٹھوکریں کھائے۔ وہ راستہ سے دور پھینک دئے جانے والا پتھر ہے کہ جس کی موجودگی کسی کو نہیں بھاتی۔ کیونکہ وہ سب کے لئے باعثِ زحمت ہوتا ہے۔

دنیا میں انسان اپنے آپ کو قابلِ قدر بنانے کے لئے کئی کوششیں کرتا ہے۔ مثلاً بڑے بڑے مکانات بنوانا۔ باغ لگوانا۔ موٹر گاڑیاں خریدنا۔ اچھے اچھے لباس حاصل کرنا۔ مال و زر اکٹھا کرنا۔ اولاد کا خواہشمند ہونا وغیرہ لیکن کیا یہ سب چیزیں اسکو بطور انسان کے قابلِ قدر بنا دیں گی۔ ہرگز نہیں۔ انسان کو دنیا کے تخیلات موہ لیتے ہیں۔ بیوی بچوں کی محبت گرویدہ کر لیتی ہے مال و منال کی خواہشیں دل و دماغ پر قابو پا لیتی ہیں۔ لیکن سوچئے کہ کیا یہی مقصدِ حیات ہے؟ اور انہی الجھنوں کا نام نیکی ہے؟ کیا خدا کے ساتھ رشتہ قائم کرنے کا یہی ذریعہ ہے؟ بے شک یہ چیزیں نظام و کاروبار چلانے کے لئے درکار ہیں۔ لیکن ان کو ہی انسانی زندگی کا مقصود سمجھ لینا غلطی ہے ؎

مانا ہوس زر ہے بشر کے لئے عادت ، لیکن نہیں دنیا میں فقط ایک ہی نعمت
کچھ اور بھی جوہر ہیں عطا کردہ قدرت ، غمخواری و دلجوئی و ہمدردی و الفت

یہ ہیں انسانی محفل کی سیڑھیاں کہ جن کے ذریعے انسان اوپر چڑھ سکتا ہے۔ اونچا اٹھ سکتا ہے۔ جو انسان محض دنیاوی جاہ و حشمت کو حاصل کر لینا ہی اعلیٰ انسان بننے کا ذریعہ سمجھتا ہے وہ دھوکے میں ہے۔ حقیقی وصفِ انسانی تو یہی ہے کہ جب وہ اپنے بھائی کو تکلیف میں دیکھے تو موم کی طرح اس کا دل پگھل جائے۔ اس کا غم اپنا غم معلوم ہو۔ لیکن یہ محض احساس ہی نہ رہے۔ بلکہ پھر اس بھائی کی دلجوئی ہو۔ اس سے ہمدردی ہو۔ اور اس کے بعد چارہ گری کی جائے۔ اور اس کی تکلیف کو رفع کیا جائے ؎

کرم جنس ہے یاں دستگیری ہم جہانوں کی
خریدا کر یہیں سستی دعائیں ناتوانوں کی !

انسانیت اسی کا نام ہے کہ انسان کے اندر وہ دل ہو کہ جو بنی نوع انسان کا درد محسوس کرے۔ نہ صرف انسان کی بلکہ ہر ذی روح کی تکلیف اس کو اپنی تکلیف

محسوس ہو۔ اب ایک سچّے انسان کا تواریخی سانحہ سنیئے:۔

حکایت:۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ الیشور بھگت حضرت ابوبکر شبلیؒ جن کا دل ہمدردی و غمخواری سے لبریز تھا اپنے مالک کی یاد میں مگن ہر ایک چیز پر محبت کی نگاہ ڈالتے ہوئے خوش خوش ایک بازار میں جا رہے تھے۔ کہ ایک موقعہ پر کسی دکاندار نے ایک گائے کو جو اسکی دکان کے سامنے پڑے غلّہ کو کھانے لگی تھی۔ بڑی بیدردی سے ایک لاٹھی ماری۔ گائے کی پیٹھ اسکی چوٹ سے جھک گئی اور وہ وہاں سے دوڑ گئی۔ حضرت شبلیؒ کہ جو انسانیت کے حقیقی جوہر سے بہرہ ور تھے عین اس وقت اس دکان کے سامنے سے گذر رہے تھے۔ جونہی اُس لاٹھی کی چوٹ اس بے زبان گائے کی پیٹھ پر پڑی اور گائے درد کے مارے نیچے جھکی ٹھیک اُسی وقت اُس خدا دوست سچے انسان کی پیٹھ بھی جھک گئی۔ اور چیخ نکل گئی۔ وہ بڑے زور سے کراہنے لگے۔ لوگ حیران ہوئے کہ کسی نے اس شخص کو کچھ کہا نہیں چھیڑا نہیں۔ پھر یہ کیا ہو گیا۔ ادھر اُدھر سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ پوچھا بھائی تم کو کیا ہوگیا کہ یک لخت چیخنا چلّانا شروع کر دیا ہے۔ لوگ پوچھتے تھے۔ لیکن وہ ہمدردی و اُلفت کا پُتلا درد کے مارے زبان نہ کھول سکتا تھا۔ آخر کہنے لگا۔ کہ اس بھائی نے لاٹھی ماری ہے وہ دوکاندار اور دیگر دیکھنے والے لوگ حیران ہو کر کہنے لگے۔ کہ اس نے تم کو ہرگز نہیں مارا۔ یہ سُنکر انسانی زندگی کا حقیقی مقصد سمجھنے والے بزرگ نے اپنے جسم پر سے کپڑا ہٹا دیا۔ تو دیکھا گیا۔ کہ جسم کے جس حصّہ پر گائے کو لاٹھی کی ضرب لگی تھی عین اسی جگہ پر ضرب کا ویسا ہی نشان اس کے جسم پر موجود تھا۔ اس کا نام ہے انسان ہونا۔ اور اس کا نام ہے انسانیت ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

جس انسان کے دل میں اُلفت و ہمدردی کا جذبہ نہیں وہ آدمیت سے بے بہرہ ہے وہ دِل پھینک دینے کے قابل ہے۔ کہ جس میں دوسروں کا درد نہیں۔ کیونکہ وہ

دِل دل ہی نہیں بلکہ پتھر ہے

وہ آدمی ہی کیا ہے جو درد آشنا نہ ہو پتھر سے کم ہے دل میں شرر گر نہاں نہیں

انسان کی شرافت، انسان کی انسانیت، انسان کی بزرگی، انسان کی قدر و منزلت اسی میں ہے کہ وہ دوسروں کے لئے درد رکھتا ہو۔ اُن سے نیکی کرے۔ نیکی سے دن گزارے۔ ہر وقت بھلائی کرنے کا خیال دل میں رکھے۔ نیکی اور بھلائی کے خیالات اور جذبات ہر وقت اس کے دل میں موجزن رہیں۔ ایسا کرنے سے اس کی زندگی بڑے امن کی ہو گی۔ اور اسے ہر طرح کا آرام نصیب ہو گا ۔

یہی ہے ایک دلیل شرافتِ انسان امید خیر پہ مبنی ہو عادتِ انسان

گزارے عمر دوروزہ وہ نیک نامی سے

یہی ہے باعثِ آرام و راحتِ انسان

اے .... مثلاشیو! سکھ کی تلاش میں کہاں بھٹک رہے ہو۔ کدھر کدھر سرگرداں ہو ۔ کیا کیا پاپڑ بیل رہے ہو۔ کیا کیا نسخے برتتے ہو۔ کیسی کیسی مصیبتیں اور اذیتیں اُٹھاتے ہو۔ ... پھر سکھ نصیب ہو جائے۔ سمجھو اس راز کو۔ برتو اس نسخے کو اور دیکھو کہ کس طرح ... سکھ، شانتی، امن اور سکون خود بخود دوڑے چلے آتے ہیں۔ جو انسان نیکی اور محبت کو ملحوظِ خاطر نہیں رکھتا۔ اور بدی کی طرف مائل رہتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ انسان نہیں کہلا سکتا۔ بلکہ حیوانوں سے بھی بدتر ہے ۔

نہ ہر آدمی زادہ از دو بہ است کہ دو ز آدمی زادہ بد بہ است

ترجمہ: ہر ایک آدمی حیوان سے بہتر نہیں۔ بلکہ ایک بد انسان سے چوپایہ بہتر ہوتا ہے

حقیقت یہی ہے کہ جس انسان کے اندر اُلفت و نیکی کا جذبہ موجود نہیں۔ وہ ویسا ہی انسان ہے کہ جیسے ایک دیوار پر انسان کی تصویر۔ اس سے بڑھ کر اس کا

رتبہ نہیں۔ اگر دیوار پر کھینچی ہوئی تصویر کو ہم انسان کا نام دے سکتے ہیں۔ تو اُلفت سے بے بہرہ آدمی کو بھی انسان کہہ سکتے ہیں۔ ورنہ نہیں ؎

چو انساں را نباشد فضل و احساں چہ فرق از آدمی تا نقشِ دیوار

ترجمہ:- اگر انسان کے اندر مہربانی اور احسان یعنی محبت کے اوصاف موجود نہیں۔ تو ایسے انسان اور دیوار پر کھچی ہوئی ایک تصویر انسانی میں کوئی فرق نہیں ہے۔

جیسے وہ تصویر نکمی، بے کار اور عضوِ معطل کی طرح ہے۔ ویسے ہی اس انسان کی ہستی ہے۔ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دونوں کا وجود بے سود ہے جو حقیقت بیں انسان ہیں۔ وہ آدمیت کا اندازہ اور کسی پیمانے سے نہیں لگاتے۔ بلکہ ان کی نگاہ میں ایک ہی کسوٹی ہوتی ہے وہ یہ کہ ؎

عزت اسی کی اہلِ نظر کی نظر میں ہے سب کچھ بشر میں ہے جو محبت بشر میں ہے

کبیر صاحب نے بھی اسی ترازو سے انسانیت کی کھیپ کو تولا ہے وہ جو فرماتے ہیں وہ بھی سُننے اور سمجھنے کے قابل ہے ؎

جا گھٹ پریم نہ سنچرے سو گھٹ جانو مسان
جیسے کھال لوہار کی سانس لیت بن پران۔

ترجمہ: جس انسان میں محبت کا مادہ نہیں، اسے ایک (زندہ) مسان یعنی قبرستان سمجھو۔ گویا لوہار کی دھونکنی ہے جو بے جان ہونے کے باوجود سانس لے رہی ہے۔ اسی طرح سے الفت و محبت سے بے بہرہ انسان سانس لیتا ہے۔ یعنی اس کے اندر بظاہر زندگی تو ہے لیکن وہ حقیقی زندگی سے جو کہ پریم ہے محروم ہے۔

انسان کی عظمت کو جانچنے کے لئے مختلف طبائع کے مختلف معیار ہیں بعض لوگوں کے خیال میں مال و دولت بڑائی کا پیمانہ ہے۔ بعض اچھے رتبے کو بڑائی کی

علامت جانتے ہیں۔ بعض کی نگاہ میں جسمانی خوبصورتی اور اچھی صحت بڑائی کے نشانات ہیں۔ لیکن حقیقت میں انسانوں کی نظر میں بڑائی کی کسوٹی اور ہی کچھ ہے ؎

بزرگی[1] بجز خدمتِ خلق نیست   بہ تسبیح و سجّادہ و دلق نیست

ایک اور شاعر نے اس کسوٹی کو اور بھی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اور وہ بھی قابلِ ملاحظہ ہے ؎

اگر ہے ترے دل میں یہ مدّعا   کہ عالم میں رتبہ ہو تیرا بڑا

کیا کر تواضع یہی ہے بھلا   ہر ایک اہلِ معنی نے یوں ہے کہا

بڑی یوں تو دولت کی ہیں خوبیاں   ولے ہے تواضع کی وہ عزّ و شاں

کہاں نام اور سیرِ فردوس واں   کہا ہے بزرگوں نے اے مہرباں

تواضع اگر ہوگا تیرا شعار

بڑھے گا ترا سب میں عزّ و وقار   (نظیر)

کبیر صاحب فرماتے ہیں۔ کہ اگر بزرگی حاصل کرنے یا بڑا ہونے کے اوصاف پوچھنا چاہتے ہو۔ تو یہ ہیں۔ کہ اول انسان کے اندر فروتنی اور انکساری ہو۔ دوسرے عبادت اور تیسرے ہر ایک سے محبت اور پریم حقیقت میں وہی بڑے انسان ہیں۔ کہ جن کے اندر خوش اخلاقی کا بڑا وصف ہے۔ انہوں نے لکھا ہے ؎

دین گریبی بندگی سب سے آدر بھاؤ

کہے کبیر تیہی بڑے! جاں میں بڑا سو بھاؤ

بعض بھائی انکساری اور فروتنی کو کمزوری اور بے بسی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے سے ہی کام چلتا ہے۔ لیکن وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں۔ کہ بے شک آگ اپنا خاص درجہ رکھتی ہے۔ لیکن جب وہ انکساری اختیار کر کے راکھ بن جاتی ہے تبھی ماتھے پر چڑھائی جاتی

[1] بزرگی تسبیح مصلّے اور گودڑی سے نہیں آتی بلکہ خدمتِ خلق سے ہی آتی ہے۔

ہے۔ اور سادہ موسلمنوں کے زیب تن ہوتی ہے پس جو انسان حقیقتاً عظمت و بزرگی حاصل کرنے کے خواہشمند ہوں۔ ان کیلئے ان ہی اوصاف کا اختیار کرنا از بس لازمی ہے۔ اس کے علاوہ اور طرح سے بڑا بننا اہل نظر کی نگاہ میں کچھ معنی یا حقیقت نہیں رکھتا دولتِ دنیا یا خودی اور غرور سے بڑا بننے کی کوشش کرنا چھوٹے ہونے کی دلیل ہے اس طرح سے بڑے بننے والوں کی حقیقت کو حقیقت شناس بھگت کبیرنے خوب واضح کیا ہے۔

سے
بڑا ہوا تو کیا ہوا جیسے پیڑ کھجور
پنتھی کو چھایا نہیں پھل لاگے اتی دُور

وہ فرماتے ہیں کہ مندرجہ بالا اوصاف کے علاوہ اگر کوئی انسان اور طریق سے بڑا بننا چاہے تو بے معنی ہے کیونکہ اس کی مثال کھجور کے پیڑ کی سی ہوتی ہے جو کہ نہ تو تھکے ماندے مسافر کے لئے سایہ مہیا کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کے پھل نزدیک ہوتے ہیں کہ جن سے ایک بھوکا انسان فوراً اپنی بھوک رفع کر سکے۔

اے بڑائی کے خواہشمند انسانو! ذرا سوچو کہ آپ کہیں غلط طریقوں سے تو بڑائی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کر رہے۔ اگر آپ نے جاہ وحشمت اور زر و دولت اس دنیا میں حاصل کر لئے تو مت سمجھو کہ حقیقی بڑائی حاصل ہو گئی۔ اگر واقعی طور پر بڑائی کے خواہاں ہو تو اُن سے ہمدردی کرو۔ کہ جن کا پرسانِ حال کوئی نہیں۔ ان کی تواضع کرو جن کو ان کی بیکسی اور بے بسی کی وجہ سے کوئی پاس تک کھڑا نہیں ہونے دیتا۔ ہزاروں یتیم بچے ہزاروں بیوہ عورتیں۔ ہزاروں اپاہج، لولے، لنگڑے، اندھے انسان اس دنیا میں لاکھوں مصیبتوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ ہزاروں شرفا تنگدستی کے ہاتھوں نالاں ہیں اور فاقوں پر فاقے کر رہے ہیں۔ ان کی مدد کرنا۔ ان کا درد بٹانا سچے انسانوں کا اصلی فرض ہے حقیقی بڑائی ایسے انسانوں کی خدمت میں ہے اور ایسے انسانوں کے درد کی دوا بننے میں ہے سے

مجھ کو اس میلے میں گر پر نفع سودا چاہیئے شوقِ استرضائے خلائق لوٹانا چاہیئے۔

اِندمالِ زخمِ ناکامانِ بےکس کے لئے
مرہم کافورِ ہمدردی کا پھایا چاہیئے (احمدی)

ان بےکس خدا کے بندوں کے کام آنا اور ان سے عملی ہمدردی کرنے کا نام ہی انسانیت ہے۔ خدمت کا دوسرا نام انسانیت ہے۔ اپنا پیٹ تو جانور بھی بھر لیتے ہیں۔
بعض انسان بہت پڑھ لکھ جانے کو ہی بڑائی سمجھتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں تحصیلِ علم بڑا ہونے کا ذریعہ ہے۔ تعلیمی درسگاہوں کی ڈگریاں حاصل کر لینا ہی بڑائی کا رتبہ حاصل کرنے کے مترادف ہے اور بڑی بڑی کتابوں پر عبور کر لینا زندگی کا معیار ہے۔ یہ بھی غلط ہے اگر یہ حالت ہوتی تو سب تعلیم یافتہ آدمی بڑے بن جاتے۔ لیکن ع

آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے

حضرت محمد صاحب بالکل اُمّی تھے۔ ایک لفظ بھی کسی استاد سے نہیں پڑھا تھا۔ لیکن انسانیت کے وصف سے بہرہ ور تھے۔ آج دنیا کا ایک بڑا حصہ ان کا پیرو ہے ان کا نام زبان پر آتے ہی بےشمار گردنیں فرطِ احترام سے جھک جاتی ہیں۔ ہم پرم ہنس رام کرشن کہ جن کو بنگال کے اندر بعض لوگ اوتار تک سمجھنے لگ گئے ہیں کتابی علم سے بالکل ناآشنا تھے۔ لیکن ان کو انسانیت کے علم سے پوری پوری آگاہی تھی۔ ان کی کہی ہوئی باتیں سُن کر ہی لوگ وجد میں آ جاتے ہیں۔ اور ان کے نام اور کلام کی پرستش ہوتی ہے اس سے ثابت ہے کہ کتابی علم کی تحصیل بھی انسانیت کی حقیقی کسوٹی نہیں بلکہ کئی صورتوں میں یہ کتابی علم غلط استعمال کئے جانے سے انسانیت کے درجے سے گرا دیتا ہے۔
بعض زاہدِ خشک سال رُوکھی سُوکھی عبادت کو ہی انسانی فضیلت شمار کرتے ہیں۔ یہ پیمانہ بھی غلط ہے جس مالکِ کل کی عبادت کی جاتی ہے وہ قادرِ مطلق ہے قائم بالذات اور دائم الصفات ہے سب سے بڑا ہے۔ سب سے افضل ہے اس کی بڑائی یا اس کے اوصاف کا شمار کرنا یا ان کا اندازہ لگانا طاقتِ انسانی سے باہر ہے پھر کیا ہزاروں

انسانوں کا اس کی بڑائی کرنا یا اس کی حمد و ثنا کے گیت گانا کیا معنی رکھ سکتا ہے۔ ایسا کرنے سے ہم اس کی شان میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ عبادت ضروری چیز نہیں۔ عبادت تو انسان کا فرض اولین ہے۔ لیکن خشک عبادت عبث ہے۔ مثلاً ایک آدمی بیٹھا ہوا سندھیا یا نماز میں مشغول ہے۔ ابھی کچھ سندھیا یا نماز باقی ہے کہ سامنے سے ایک پیاسا پیاس سے بےکل ہو کر گر پڑتا ہے۔ اس وقت اگر یہی خیال رہے کہ باقی کے منتر یا رکوع ختم کر لوں۔ تب اس پیاسے کی طرف رجوع کیا جائے۔ تو یہ ایک روکھی عبادت ہے۔ یہ عبادت وہ گنا ہے جس میں رس نہیں۔ یہ وہ پھول ہے جس میں خوشبو نہیں۔ یہ وہ آنکھ ہے جس میں نور نہیں۔ یہ وہ چراغ ہے جس میں تیل نہیں۔ یہ وہ چشمہ ہے جس میں پانی نہیں۔

اس پروردگار کی توصیف کرنے کیلئے انسان کے علاوہ اور بہتیری ہستیاں ہیں کہ جن کا دن رات کا کام ہی یہی ہے۔ انسان تو بھلا اپنے دنیاوی مشاغل کی وجہ سے بہت تھوڑا وقت اس کام کے لئے نکالتا ہے۔ لیکن ان ہستیوں کو تو اور کوئی کام ہی نہیں۔ بلا محالا یہ ماننا پڑتا ہے کہ انسان کی پیدائش سے خالق کائنات کا کچھ اور ہی منشا ہے اور اس کا مفہوم جناب درد کے اس شعر میں مندرج ہے ؎

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کیلئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

یہ درد دل، ہمدردی، یہ غم خواری، یہ تلطف، یہ پریم کا ہی جذبہ ہے کہ جس کے لئے انسان کو پیکر انسانی عطا ہوا ہے۔ یہی نیک اخلاق اور یہی اوصاف حسنہ ہیں کہ جن کے اظہار کیلئے اور جن کے مطابق حیات کے قیمتی دن گذارنے کے لئے انسان کو اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ اگر یہ جوہر انسان نے نہیں پایا۔ تو وہ انسانوں کی قطار میں نہیں گنا جا سکتا۔ بلکہ حیوانوں کے زمرے میں چلا جاتا ہے ؎

آدمیت کو ہی تم جوہرِ انساں سمجھو
جس میں اخلاق نہیں ہیں اسے حیواں سمجھو

الغرض مال وجمال اور علم و زہد ہر چند لازمۂ انسانیت ہیں۔ مگر انسانیت کی تکمیل کے لئے جملہ مخلوق کے ساتھ محبت و ہمدردی کے جذبے سے سرشار ہونا ازبس ضروری ہیں۔ اس بارے میں کہا ہے ؎

اے دل تو ازیں علم چہ خواہی دانست　　وز زہد کہ اسرارِ الٰہی دانست
کس نیست الٰہی کہ ز علم و عمل
ماہیتِ ذاتِ تو کماہی دانست　　(رحمٰن)

ترجمہ:- اے دل تو اس علم سے کیا جاننا چاہتا ہے اور زاہد بننے سے اس ذاتِ مطلق کے بھید جاننا چاہتا ہے۔ کوئی انسان ایسا نہیں۔ کہ جس نے محض علم سے اس ذاتِ پاک کی حقیقت کو جانا ہو۔ بلکہ وہ نیک اعمال ہیں۔ کہ جن سے اس ذاتِ اعلیٰ کو جانا جا سکتا ہے۔

اس بحث سے واضح ہو گیا ہوگا۔ کہ انسانیت کی کسوٹی زر و مال۔ جاہ و جلال کسب و کمال۔ گوہر و لعل۔ سن و سال۔ شمشیر ڈھال۔ حسن و جمال۔ خط و خال یا دیگر ہیچ قسم کے دنیاوی مخصوصات نہیں ہیں۔ بلکہ اس کی واحد علامت نیک دلی۔ نیک نیتی۔ نیک خوئی۔ نیک طینتی۔ نیک سرشتی۔ نیک سیرتی۔ نیک خیال اور نکوکاری ہے۔ جس کسی کو انسان بننے کی، انسان کہلانے کی آرزو ہو اسے واجب ہے کہ یہ اوصاف اپنے دل میں پیدا کرے۔ اور ان کی ضد یعنی بدخیالی۔ بدکاری وغیرہ کو نکال دے۔

انسانیت کا جوہر کیا ہے؟

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

عشق، پریم اور محبت مترادف باہم معنی الفاظ ہیں انکی ماہیت کو یا ان کے معنی کو سمجھانا آسان نہیں۔ کیونکہ یہ کیفیت طاقتِ بیان سے باہر ہے۔ یہ تو صرف وجدان و احساس کی بات ہے۔ پھر میرے جیسا آدمی اس اہم مسئلہ کی نسبت کیا کہہ سکے۔ وہ پریم کی باتیں کیا جانے۔ کہ جس نے اس کوچہ میں کبھی قدم ہی نہ رکھا ہو۔ پریم کے بازار میں سے کبھی ہو کر بھی نہ گذرا ہو۔ پریم کی راہ دشوار گذار ہے۔ پریم کا مقام بہت اونچا ہے۔ کبیر صاحب نے کہا ہے ؎

یہ تو گھر ہے پریم کا خالہ کا گھر نا ہیں
سیس اُتارے بھوئیں دھرے تب بیٹھے گھر ماہیں

ہر ایک انسان پریم کا گاہک نہیں ہو سکتا۔ نہ ہر ایک آدمی پریم کی کہانی سُنا سکتا ہے۔ نہ ہی عشق یا پریم کی تعریف کر سکتا ہے۔ جن لوگوں نے اس کے متعلق کچھ لکھنے یا کہنے کی کوشش کی ہے انہوں نے یقینی طور پر کچھ بیان نہیں کیا۔ بلکہ محض ایک قیاس آرائی کی ہے۔ جیسے کہ عنوان کے شعر میں عرض ہوا ہے۔

دیکھیے اول تو لفظ شاید کا استعمال ہوا ہے۔ پھر کہا ہے کہ "آگ سی" لگی ہوئی ہے یعنی حقیقتاً آگ نہیں۔ بلکہ کوئی جلن ہے۔ جو آگ کی سی ہے کہہ نہیں سکتے کہ وہ کیا بلا ہے۔ پریم ایسی چیز نہیں، کہ جو ہر جگہ ملتی ہو اور نہ ہی یہ اتنی سستی ہے کہ

ہر کوئی اس کا خریدار بن سکے۔ کبیر صاحب فرماتے ہیں ؎

پریم نہ باڑی اُوپجے، پریم نہ ہاٹ بکائے
راجا پرجا جیہہ رُچے سیس دے لے جائے

ترجمہ:- پریم طبیعت کے اندر نہیں اُگتا۔ نہ کسی دکان پر فروخت ہوتا ہے۔ امیر و غریب جو بھی اس کا خریدار ہو، سر دے کر لے سکتا ہے۔

اسی بات کو ایک اردو شاعر نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے ؎

سطر منصور کے لہو سے ہوئی یہ تحریر
یعنی سر دار[1] نہیں وہ جو سر دار[2] نہیں

حضرتِ سودا نے بھی کچھ اسی طرح سے فرمایا ہے وہ بھی سنیئے ؎

سودا خمارِ عشق میں خسرو سا کوہکن
بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے رُو سیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

ایسی صورت میں مجھ ایسے ڈرپوک انسان کیلئے پریم کی کتھا سنانا ناممکن ہے۔ لیکن ہاں دل میں ولولے ضرور اُٹھتے ہیں۔ حالاتِ حاضرہ میں پریم کی مٹی پلید ہوتے دیکھ کر رگِ حمیت ضرور پھڑکتی ہے۔ دل کا جوش کم کرنے کیلئے کچھ کوشش کی گئی ہے۔ جو کچھ بزرگ اور مہاتماؤں سے سُنا ہے۔ یا جو کچھ مذہبی اور اخلاقی کتابوں میں پڑھا ہے اس کی بنا پر اس موضوع پر چند خیالات پیش کئے گئے ہیں۔

پریم کے اصل معنی اگر دریافت کرنے ہوں یا اس کی ٹھیک ٹھیک تعریف سُننی ہو تو وہ کوئی پریمی یا عاشق ہی بتا سکتا ہے بشرطیکہ سچا پریمی ہو، حقیقی عاشق ہو۔

آنکھوں سے مخربِ اخلاق نظارے دیکھنے والے۔ گناہ آلودہ کام کرنیوالے اور لٹریچر رکھنے والے اور اخلاق کی جڑ پر کلہاڑی چلانے والے آجکل کے نوجوان راہ چلتی بہنوں پر پھبتیاں اڑانے والے یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ بھی پریم کے بازار کے گاہک ہیں یہ تو سب دودھ پینے والے مجنوں ہیں۔ ایک دفعہ لیلیٰ نے ڈھنڈورہ پٹوایا کہ وہ مجنوں کو دودھ پلانا چاہتی ہے مجنوں جہاں ہو آ جائے۔ وقت مقررہ پر لیلیٰ کو بتایا گیا۔ کہ باہر تو آدمیوں کا تانتا

[1] لیڈر [2] سر کو نذر کرنیوالا

لگ گیا ہے اور بھی اپنے آپ کو مجنوں بیان کرتے ہیں۔ لیلیٰ مسکرائی اور پوچھا کہ ان کا حلیہ کیا ہے؟ تو وہ کہنے لگے بڑے موٹے تازے خوش رُو نوجوان ہیں سب پیالہ لیکر دودھ پینے کو آئے ہیں۔ لیلےٰ نے کہا میرا مجنوں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میرے مجنوں کا حلیہ تو یہ ہونا چاہیئے۔ ع

چشمِ تر۔ ضعفِ بدن۔ زردیٔ رنگ خشکیٔ لب

پھر لیلےٰ نے کہا کہ اچھا آزمائش کئے لیتے ہیں۔ یہ لے جاؤ چھری اور پیالہ اور کہو لیلیٰ دُودھ پلانے سے پیشتر مجنوں کا خون مانگتی ہے جب ان نقلی مجنوؤں سے کہا گیا تو ایک ایک کرکے یہ کہتے ہوئے کھسک گئے "کہ بھائی ہم تو دودھ پینے والے مجنوں ہیں۔ خون دینے والا کوئی اور ہوگا" اور دم کی دم میں میدان عاشقوں سے خالی ہو گیا۔ آخرانہوں نے اصل مجنوں کو بھی ایک درخت کے نیچے اپنے حال سے بے خبر کھڑا دیکھا۔ کیونکہ ان کی تو حالت ہی عجیب ہوتی ہے ؎

نرالی صورتیں ہیں بادہ نوشانِ محبت کی
کبھی ہوشیار رہتے ہیں کبھی مدہوش رہتے ہیں

اس سے خون مانگا تو اس نے اپنے جسم میں جگہ جگہ پر چھری چلائی لیکن کہیں سے خون کا قطرہ بھی نہ نکلا۔ ٹھیک تو ہے۔ عاشقی اور خون کی موجودگی متضاد باتیں ہیں ؎

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا حال ہوا خونِ جگر ہونے تک

آج کل کے نوجوان پہلے اس راز کو سمجھ لیں۔ ان کا جھوٹا اور مخربِ اخلاق عشق تو نفس پرستی ہے اس کی کیفیت کیا ہے ؎

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

ان کو خبردار رہنا چاہیئے اس نفس پرستی کے نتیجے برے ہوتے ہیں۔ یہ نفس پرستی ذلت و خواری کا باعث بنتی ہے۔ اور اس کا ماحصل بربادی اور تباہی و خواری کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس نے اَن گنت نوجوانوں کو پستی اور تباہی کے گڑھے میں گرا دیا ہے

عشق حقیقی یا سچے پریم کی کتنا سلنی ہو۔ تو منصور سے پوچھو کہ جو انا الحق کہتا ہوا قربان ہو جاتا ہے حضرت عیسیٰ سے پوچھو کہ جو اپنے پریتم کی دھن میں چڑھتے ہیں دار پر لٹک جاتے ہیں۔ میراں بائی سے پوچھو۔ کہ جو زہر کا پیالہ غٹ غٹ پی جاتی ہے۔ گورو ارجن دیو سے پوچھو جنہوں نے گرم توے، گرم ریت اور دیگر کئی قسم کی اذیتوں کو سہہ کر بھی پریم کی رٹ کو نہ چھوڑا۔ یا حضرت محمدؐ سے پوچھو کہ جن کو ہر قسم کے لالچ اور دکھ دیئے گئے۔ لیکن اپنے اصول سے ٹس سے مس نہ کی۔ سوامی دیانند سے پوچھو۔ کہ جن پہ پتھر پھینکے گئے اور جن کو زہر پلایا گیا۔ لیکن وہ چٹان کی طرح قائم رہے۔ بھگت بینا نند سے پوچھو کہ جنہیں پریم کا پرچار کرنے پر سر میں ٹوٹے ہوئے ٹھیکرے مارے گئے۔ خون بہہ رہا تھا۔ اور وہ کہتے تھے۔ یہ پریم کا پہلا زینہ ہے۔ میرا مارنے والا یہ بھی ابھی ابھی اگلے زینہ پر چڑھ جائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ وہ پاؤں پر آ گرا ؎

آہ کیا سہل گذر جاتے ہیں جی سے عاشق!
ڈھب کوئی سیکھ لے ان لوگوں سے مر جانے کا (میر)

اس راہ میں جان دینے کی چاشنی کچھ عجیب ہوتی ہے اس کا لطف کچھ انوکھا ہوتا ہے اس کی چاٹ بڑی عجیب ہوتی ہے اس کا مزا کچھ نرالا ہوتا ہے ؎

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے!

ایسے سچے پریم کے پریمیوں کو پریم کے سوا دوسری کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی۔ پریم ہی ان کا ملجا و ماوا ہوتا ہے۔ پریم ہی ان کا گھر بار اور مال و دولت ہے حتیٰ کہ پریم ہی ان کا دھرم ایمان ہوتا ہے ؎

میری ملت ہے محبت میرا مذہب عشق ہے
خواہ ہوں میں کافروں میں خواہ دیں داروں میں ہوں

ان کی پرستش گاہ بھی پریم ہی ہوتی ہے وہ ان اینٹ پتھر کی عبادت گاہوں سے

الگ تھلگ رہتے ہیں۔ ان عبادتگاہوں میں انہیں حقیقی پریم دکھائی نہ دینے کی وجہ سے ٹھہرنے کو جی نہیں چاہتا۔ وہ پریم کی نگری اور محبت کی بستی میں بسنا چاہتے ہیں ؎

اے عشق کہیں لے چل یہ دیر و حرم چھوٹیں
ان دونوں مکانوں میں جھگڑا نظر آتا ہے   (بیدل)

ایک فارسی شاعر نے اس موضوع کو ایک اور نقطۂ نگاہ سے بیان کیا ہے ؎

منزلِ عشق مکانے دیگراست   ایں زمیں را آسمانے دیگراست

ترجمہ:۔ حقیقی پریم کی منزل کا مقام دوسرا ہے اس زمین کا آسمان ہی اور ہے۔

سائیں بُلھے شاہ کی طرح ان کا خیال ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ ؎

دھرم سال وچ دھاڑوی رہندے ٹھاکردوارے ٹھگ
مسیتاں وچ کستی رہندے بُلھا عاشق رہن الگ!

یعنی گوردواروں میں محض لٹیرے رہتے ہیں اور مندروں کے پجاری ٹھگ ہیں مسجدوں کے مُلّا جھوٹے ہیں، لیکن جو سچے ایشور بھگت ہیں وہ ان تمام مقاموں سے الگ رہتے ہیں۔ ان پریمیوں کا حج اور تیرتھ کا مقام بھی پریم ہی ہوتا ہے وہ اسی مقام کا طواف کرتے ہیں اور اسی کی یاترا کرتے ہیں۔ جن مقاموں کو عام لوگ تیرتھ اور حج کے مقام کہتے ہیں ان کے لئے وہ بغیر پریم کے کچھ معنی نہیں رکھتے وہ پریم کے بس ہو کر جو کچھ کہتے ہیں۔ وہ بھی سننے سے تعلق رکھتا ہے ؎

مکہ، مدینہ، دوارکا، بدری اور کیدار   بنا پریم سب جھوٹ ہے کہے ملوک بچار

"اس کا مطلب یہ نہیں کہ پریمی ان مقامات کو حقارت سے دیکھتے ہیں ہرگز نہیں" پریمی اور حقارت، پریمی اور نفرت۔ پریمی اور منافرت یہ تو متضاد باتیں ہیں پریمی کی لغت میں بھی یہ الفاظ نہیں ملتے۔ ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پریم دھن تک پہنچنے کیلئے کسی خاص جگہ تلاش کرنے کی بجائے روحانیت کی لو لگانے کے لئے کہیں گھومنے کی ضرورت نہیں۔

دُور جانا یا منزلیں طے کرنا لازمی نہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں ؎

شیخ و برہمن! دیر و حرم میں ڈھونڈتے ہو کیا حاصل
مُوند کے آنکھیں دیکھو تو ہے ساری خدائی سینے میں (دانشاں)

جس وقت عام لوگ مندروں اور مسجدوں کا قصد کرتے ہیں۔ ان عبادتگاہوں کی راہ لیتے ہیں اور وہاں پہنچکر جسم سے تو پوجا اور نماز میں مصروف ہو جاتے ہیں لیکن دل کہیں اور جگہ جا کر لگتا ہے تب اس نظارے سے متاثر ہو کر پریمی کہتا ہے ؎

شور کیوں گبر و مسلماں نے مچا رکھا ہے | دیر میں کچھ بھی نہیں کعبہ میں کیا رکھا ہے
شیخ گر کعبہ میں خوش ہے تو برہمن دیر میں | اپنے اپنے طور پر ہر شخص بہلاتا ہے دل
گر شیخ و برہمن سُنیں افسانہ کسی کا! | معبد نہ رہے کعبہ و بت خانہ کسی کا

تو کیا پریمی ان مقامات سے پرے ہٹ کر کچھ کرتا ہی نہیں کیا وہ اپنی زندگی کے بے بہا لمحوں کو ضائع کرتا ہے؟ نہیں! ایسا نہیں ہوتا۔ پریمی بھی ایک آستانہ پر جا کر بیٹھتا ہے ؎

شیخ کعبے میں شوالے میں برہمن بیٹھے
ہم تو کوچہ میں تیرے مار کے آسن بیٹھے (اکبر)

پریمی تو پریم کے کوچہ میں آسن لگاتا ہے دوزانو ہوتا ہے۔ وہیں آرتی اُتارتا ہے وہیں نماز گذارتا ہے اور وہیں سجدہ کرتا ہے ؎

جائے جو جا ہے سوئے دیر و حرم | ہم تو بیٹھے ہیں درِ دلدار پر

سوال ہو سکتا ہے کہ پریمی بھی کوئی نہ کوئی دروازہ تو آخر ڈھونڈتا ہی ہے وہ دوسرے لوگوں کی بنائی ہوئی عبادتگاہوں میں نہیں پہنچا تو اپنی بنائی ہوئی عبادتگاہ میں تو جاتا ہی ہے یہاں اعتراض واجب ہے کیونکہ آخر وہ بھی کسی کوچہ میں یا کسی دروازہ پر جا کر بیٹھتا ہی ہے۔ لیکن وہ دروازہ کہاں ہوتا ہے ؎

کچھ کلیسا پہ ہے موقوف نہ کچھ کعبہ پر | ہر جگہ ہم نے تجھے جان جہاں دیکھا ہے

پریمی کے پریم کا کوچہ ہر ایک مقام پر موجود ہے۔ اسکو پریم کی لہر ہر جگہ نظر آتی ہے۔ اس کا معبود، اس کا محبوب، اس کا معشوق کہیں کسی خاص جگہ پر قیام نہیں رکھتا وہ ہر جائی ہے۔ اس لئے پریمی کا پریم بھی ہرجائی ہے۔ جب کوئی پریمی سے اس کے پیار کے مقام کا سوال کرتا ہے۔ تو وہ ناچتا ہوا جواب دیتا ہے ؎

یار کو ہم نے جا بجا دیکھا   کہیں ظاہر کہیں چھپا دیکھا
کہیں ممکن ہوا کہیں واجب   کہیں فانی، کہیں بقا دیکھا
کہیں موجود اور کہیں غائب   کہیں بندہ، کہیں خدا دیکھا
کہیں بیگانہ وش نظر آیا!   کہیں صورت سے آشنا دیکھا
کہیں عاشق نیاز کی صورت
سینہ بریاں و دل جلا دیکھا   (نیاز)

اب تو سن لیا آپ نے کہ عاشق کا کوچۂ پریم اور اس کا معبد کہاں ہوتے ہیں۔ پریم کا کوچہ کہیں دور نہیں ہوتا۔ پریم کی لہر ہر جگہ چل رہی ہے۔ پریمی کو شادی کے نغموں اور دکھی کی آہ میں ایک ہی قسم کی لہر دکھائی دیتی ہے۔ پریم بہت ہی لطیف شے ہے۔ وہ ہوا سے بھی ہلکا ہے۔ خیال سے بھی لطیف ہے۔ اس لئے وہ سب جگہ سمایا ہوا ہے۔ پریم کا منبع کیا ہے؟ پریم کا مخزن ہے پریم سروپ پرماتما۔ اس لئے جس طرح سے وہ مالکِ عزّ و جلّ ہر ایک چیز کے اندر سمایا ہوا ہے اسی طرح سے پریم کی کیفیت ہے۔ پریم پرماتما کا دوسرا نام ہے۔ ان میں کوئی بھید نہیں۔ سچ تو کہا ہے:- GOD IS LOVE & LOVE IS GOD

یعنی "پرماتما پریم ہے اور پریم پرماتما ہے"

کسی ہندی کوی نے اسی مفہوم کو بہت اچھا نبھایا ہے وہ کہتا ہے ؎

پریم ہری کو روپ ہے، تیوں ہری پریم سروپ

ایک ہوتے دو تے یوں بسیں جیوں سورج اور دھوپ (درشناں)

یعنی "پریم پرماتما کا روپ ہے اور ایسے ہی پرماتما پریم کا روپ ہے یہ دونو حقیقت میں ایک ہیں۔ لیکن دو صرف اسی طرح سے دکھائی دیتے ہیں۔ کہ جیسے سورج اور دھوپ"

پریم کی اصلی توصیف کرتے ہوئے، حقیقی عشق کی حمد گاتے ہوئے ایک اردو شاعر نے اس کی اصلیت کو بڑی اچھی طرح سے واضح کیا ہے ؎

محبت کا عالم میں پھیلا ہے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور!

ایک اور شاعر نے تو حد کر دی ہے وہ کہتا ہے ؎

محبت خدا ہے خدا ہے محبت
محبت نہ ہوتی خدا ہی نہ ہوتا!

پریم پرماتما کا سروپ ہونے کی وجہ سے احاطۂ تحریر و تقریر سے باہر ہے یہ بھی اتنی لطیف شے ہے کہ مادی طاقتیں نہ تو اس کا اندازہ لگا سکتی ہیں اور نہ ہی اس کی حد باندھ سکتی ہیں ایک ہندی کوی کہتا ہے ؎

پریم اگم انوپم امت ساگر سرس بکھان
جو آوت یہی ڈھگ بوہر جات نہیں رس کھان

یعنی "عشق ایک ایسا گہرا بے اندازہ، بے تول سمندر ہے کہ جو کہنے میں نہیں آ سکتا جو اس کے نزدیک آتا ہے۔ وہ پھر واپس نہیں جا سکتا"

بے شک پریم ساگر میں پہنچ کر پھر واپسی کا سوال نہیں رہتا۔ پتنگا شمع کے پاس آ کر کیسے لوٹ سکتا ہے وہ تو وہیں ڈھیر ہو جاتا ہے پریم ایسی ہی شے ہے پریم کی تعریف کرتے ہوئے ایک مغربی فلاسفر ٹیپر صاحب لکھتے ہیں کہ "پریم! ایک انوکھی شے ہے! پریم کے ایک لفظ میں ساری کتاب کا مطلب آ جاتا ہے۔ پریم کے ایک آنسو میں سمندر سما جاتا ہے پریم کی ایک نظر میں چودہ طبق سما جاتے ہیں۔ پریم کی ایک ایک آہ میں سو سو طوفان جوش مارتے ہیں۔ پریم کی ایک مسکراہٹ میں ہنستا بجلیاں کوندتی ہیں۔ پریم کے ایک ایک لمحے میں جگ بیت جاتے ہیں۔ آہا! پریم کے اندر کیا کیا راز پنہاں ہیں!"

ایک اور فلاسفر مسٹر ہنری وان نے لکھا ہے کہ "پریم میں لینے کا حساب نہیں ہوتا دینے کا ہی ہوتا ہے۔ پریم خوشی کا یا خواہش کا پاگل پن نہیں ہوتا۔ پریم تو پاکیزگی تسکین اور پاک زندگی کا نام ہے۔ بے شک اسی کا نام پریم ہے۔ پریم سے افضل تر دنیا میں کوئی چیز نہیں۔ اور پریم ہی ایک ہمیشہ رہنے والی چیز ہے۔"

کیا حقیقتاً پریم سے بڑھکر کوئی چیز نہیں۔ کیا واقعی یہ ایسی گراں بہا شے ہے ہاں بلاشبہ یہ وہ نگینہ ہے کہ جس کے ہاتھ آنے سے پھر کوئی لعل و گوہر آنکھ میں نہیں جچتے۔ یہ وہ دولت ہے کہ جس کے مقابلہ میں سارے شاہی خزانے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ پریم وہ پونجی ہے۔ کہ جس کے قبضہ میں ہو۔ اسکو کبھی خسارہ کا خیال ہی نہیں آسکتا۔ پریم وہ مشعل ہے کہ جو سدا روشن رہتی ہے۔ پریم وہ شیریں ساز ہے کہ جس کے لطیف تاروں سے سدا ہی من موہنے راگ نکلتے رہتے ہیں۔ پریم وہ بجلی ہے کہ جہاں ایک دفعہ کوند جائے وہاں اس کی رَو کبھی بند نہیں ہوتی۔ پریم وہ چمک ہے کہ جس کے سامنے باقی سب چیزوں کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے۔ پریم وہ مٹھاس ہے کہ جس کا مزا بیان سے باہر ہے۔ پریم وہ پھل ہے کہ جس کا رس زبان سے لگا چھوٹتا نہیں۔ پریم وہ پھول ہے کہ جس کی خوشبو دماغ کو سدا معطر رکھتی ہے پریم وہ عمارت ہے کہ جسکی نیو دیا تال لوک میں ہے اور کبھی ہل نہیں سکتی۔ پریم وہ منتر ہے کہ جو سب کو رام کر لیتا ہے پریم وہ جادو ہے جو سب پر قابو پا لیتا ہے۔ غرضیکہ پریم وہ پارس پتھر ہے وہ رسائن ہے۔ وہ کیمیا ہے کہ جس خوش قسمت انسان کو حاصل ہو جائے اسے نہ کوئی خواہش رہتی ہے نہ کمی۔ اگر یہ الٰہ دین کا چراغ کسی راجہ یا بادشاہ کو مل جائے تو اس کی رعیت اس پر جان نثار کرتی ہے۔ اگر کسی سردار کے ہاتھ آجائے تو اسکی فوج اسکے اشارہ پر چلتی ہے اگر کسی حاکم کے پاس ہو تو اس کے انصاف کا ڈنکا بج جاتا ہے اگر کسی نیک عورت کو دستیاب ہو جائے تو سارا کنبہ اسکو دیوی سمجھ کر پوجتا ہے۔ اگر

کسی بیٹے کے حصّہ میں آجائے۔ تو باپ اس پر سو جان سے قربان ہو جاتا ہے۔ قصہ کوتاہ پریم کا نگینہ جس انسان کے پاس بھی ہو۔ اس کی خوش نصیبی مسلّمہ ہے۔ کوئی تکلیف اسکو نہیں ستا سکتی۔ وہ سدا خوش و خرّم رہتا ہے۔ دنیا بھر کے انسان ہی نہیں بلکہ چرند و پرند بھی اس کے آگے آنکھیں بچھاتے ہیں۔ ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ جنگلوں میں اکیلے رہنے والے خدا کے بندے جو سچے پریم کے جذبہ سے سرشار تھے۔ خونخوار جانوروں سے کبھی خوف نہ کھاتے تھے۔ بلکہ وہ جانور اس پریم کے دائرہ میں آکر کھیلتے کلیلیں کرتے تھے۔ سنو پرانی داستان ہے ؎

یکے[1] دیدم از عرصۂ رودبار کہ پیش آمدم بر پلنگے سوار

پریم کے متعلق ایک اور بات عرض کرنی ہے اور وہ نہایت ضروری اور اہم ہے پیشتر ازیں ایک مقام پر عرض ہو چکا ہے کہ پریم لینے کی چیز نہیں بلکہ صرف دینے کی شئے ہے۔ جب تک اس خیال سے پریم کیا جائیگا تب تک وہ حقیقی پریم رہے گا۔ لیکن جونہی اس میں کسی معاوضہ کا خیال آگیا پریم کے عوض پریم یا کسی اور چیز کی امید باندھی گئی۔ تو وہ پریم پریم نہیں رہیگا۔ بلکہ سودا ہو جائیگا۔ دکانداری کی شکل اختیار کرلے گا۔ اور پریم کا لطیف جوہر۔ پریم کی لطافت اس میں سے اڑ جائے گی۔ نین دین کے بازار میں پریم نہیں مل سکتا۔ اور نہ ہی معاوضہ کے خیال سے کیا ہوا پریم کسی خوشی کا باعث بن سکتا ہے۔ بلکہ ایسا خود غرضی کا پریم تو تکلیف کا موجب ہوتا ہے۔ مثلاً اکثر لوگ آج کل یہ کہتے ہوئے سُنے جاتے ہیں کہ زمانہ بہت بُرا آگیا ہے جس کے ساتھ بھلائی کی جائے وہی بُرائی کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ نیکی کی کوئی قدر نہیں کرتا۔ احسان کے لئے کوئی شکر گذار نہیں ہوتا۔ نیک آدمی کی کوئی عزت نہیں۔ وغیرہ وغیرہ ایسے پریمی پریم کو بدنام کرتے ہیں۔ وہ تو سوداگری کرتے ہیں وہ بھلائی کرتے ہی اس امید سے ہیں کہ اس سے دنیا میں عزت اور برتری ہوگی۔ یا لوگ تعریف کریں گے۔ ایسے پریم کی بنیاد ہی غلط ہے اور اسی لئے

[1] میں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ چیتے پر سوار ہو کر میرے سامنے آیا۔

امید بر آنے سے رنج محسوس ہوتا ہے۔ پریم کرنے میں تو یہ خیال ہونا چاہیئے۔ کہ جو ایک ہندی کوی نے بیان کیا ہے ؎

تم ہماری سُدھ لو کہ نہ لو کبھی — اُچت اُتر دو کہ نہ دو کبھی
پر یہی کہتے ہم ہیں رہو — تم سدا یو سہرش سکھی رہو

یعنی اے پیارے! تم خواہ ہماری خبر لو یا نہ پوچھو۔ ہماری بات کا مناسب جواب دو یا نہ دو۔ لیکن ہم تو ہمیشہ یہی خواہش کریں گے۔ کہ تم ہمیشہ خوش و خرم رہو"

حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن است و بس — در بند آں مباش کہ نشنید یا شنید

ترجمہ:۔ اے حافظ تیرا کام تو دعا کرنا ہے اور بس اس فکر میں نہ پڑ۔ کہ وہ سُنی جاتی ہے یا نہیں سُنی جاتی ۔۔

پریم اور موہ میں بُعد بین کا فرق ہے۔ موہ کے زیر اثر انسان تو ہر کسی کی بھی خوبصورتی پر دل دے بیٹھتا ہے۔ لیکن پریم کسی ایک خاص [illegible] خصال سے شیدا ہوتا ہے۔ خواہ دوسرے آدمی اس ہستی کو کیسا ہی سمجھتے ہوں۔ اور [illegible] گھٹیا جانتے ہوں۔ موہ کے اندر عقل گمراہی میں ہوتی ہے اور اس پر [illegible] کا پردہ ہوتا ہے پریم کے اندر عقل پاکیزہ ہوتی ہے اور نیک رہبری کرتی [illegible] موہ میں خود غرضی زوروں پر ہوتی ہے اور پریم میں ایثار اور قربانی کے جذبات موجزن ہوتے ہیں موہ کے اندر خواہشات اور ارادے رذیل اور اوچھے ہوتے ہیں۔ اور پریم میں نیک اور اعلےٰ۔ اسی لئے موہ کا نتیجہ ذلت اور رنج ہوتا ہے اور پریم کا نتیجہ سرور اور آنند۔ موہ میں انسان اپنے ناپاک ارادوں کی تکمیل کیلئے اپنی پیار کی شے سے بڑی بیدردی کا سلوک روا رکھتا ہے۔ پریم کے اندر اس کی حفاظت کے لئے اپنے آپ کو قربان کرنے کو طیار رہتا ہے۔ موہ سے بھرا ہوا انسان ڈاکوؤں کا سا برتاؤ کرتا ہے۔ اور پریمی انسان اپنے پریم پاتر کا پجاری ہوتا ہے۔ موہ میں انسان

چمڑے اور لہو سے محبت رکھتا ہے۔ پریم کا پجاری باطن کی پرستش کرتا ہے۔ موہ میں انسان لینے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ لیکن پریم میں برخلاف اس کے لینے کا نام تک نہیں ہوتا۔ وہاں دینا ہی دینا ہوتا ہے۔ موہ جمع اور ضرب کے گُر جانتا ہے۔ اور پریم نفی اور تقسیم کے۔ موہ میں دوسری جانب سے لاپروائی یا حسب خواہش ردعمل نہ پاکر نفرت جاگ اُٹھتی ہے۔ لیکن پریم میں نہ صرف لاپروائی اور بے اعتنائی بلکہ ظلم اور سختی ہونے پر بھی پریم کے جذبہ میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ پریمی پریم اس لئے کرتا ہے۔ کہ پریم ہی اس کی زندگی ہوتی ہے۔ پریم ہی سہارا، پریم ہی جیون اور پریم ہی پران۔ موہی انسان کو اگر اپنی پیار کی چیز ملنے کی امید نہ رہے تو اور طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ یا کسی دوسری چیز کی ٹوہ لگاتا ہے۔ لیکن پریمی اُسی چیز کا ہو چکتا ہے۔ ملنے یا نہ ملنے امید یا مایوسی کا وہاں سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ وہاں تو پریم پریم ہی کے لئے ہے۔ ہر حال میں پریم کرتا ہے۔ اس کے بدوں اور کوئی راہ ہی نہیں۔

اس دنیا میں سچے پریم کی مثال کچھ حد تک ماں کی محبت سے دی جا سکتی ہے ماں کی محبت بچے سے اکثر خود غرضی اور معاوضہ کے خیال سے نہیں ہوتی جس طرح تکلیف سے رات دن مصیبت جھیل کر بچے کو پہلے بطن میں رکھتی ہے جس تکلیف سے اسکو جنتی ہے اور جس دُکھ سے اسکو پالتی ہے۔ پھر جس طرح سے ہر وقت اس کی بھلائی کی خواہاں رہتی ہے۔ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ سچے پریمی اپنے محبوب کے عیبوں کو نہیں دیکھتے۔ وہ تو اس کے لئے ہر وقت قربان ہونے کو طیار رہتے ہیں اور اگر ان کے پریم کے رستہ میں نثار ہونے کے لئے کوئی چیز رکاوٹ پیدا کرے تو برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کا قربانی کے لئے جی اچھلتا ہے ؎

فانوس کو پروانوں نے دیکھا تو یہ بولے ‏ کیوں ہم کو جلاتے ہو کہ جلنے نہیں دیتے

سچے پریم کے متعلق کبھی حساب یا گنتی شمار نہیں کیا جاتا۔ جمع تفریق کا سوال وہاں

پیدا ہی نہیں ہوتا۔ وہاں اس سنہری اصول کے سوا اور کسی دوسرے اصول کی پابندی نہیں ہوتی۔ اس میں سودے نہیں کئے جاتے عیوض کی توقع نہیں ہوتی۔ وہ اصول کیا ہے ؎

جہاں پریم تہاں نیم نہیں، تہاں نہ بدھی بیوہار پریم مگن جب من بھیا تب کون گنے تتھ وار

ترجمہ:۔ جہاں سچی محبت ہوتی ہے۔ وہاں کسی اصول کی پابندی نہیں ہوتی۔ نہ ہی وہاں غور و فکر یا سوچ سمجھ کا کام ہوتا ہے۔ جب دل کے اندر حقیقی محبت نے جگہ لے لی۔ تب وہاں گنتی حساب کو کوئی دخل نہیں رہتا"

سچے پریم کی ماہیت کو واضح کرنے کے لئے ایک حکایت عرض کی جاتی ہے:۔

حکایت:۔ کسی راجہ کا لڑکا اپنے پروہت کی لڑکی کی خوبصورتی کا شکار ہو گیا اور اس بات کے لئے مُصر ہوا۔ کہ اس سے شادی کرے۔ پروہت کے لئے ایک طرف تو ذات پات کی تمیز کی رکاوٹ تھی۔ اور دوسری طرف راجہ صاحب کی ناراضگی کا خیال تھا۔ اسلئے وہ بڑا رنجیدہ خاطر رہنے لگا۔ لڑکی نے لگاتار کئی دنوں تک ایسی حالت دیکھ کر اپنے باپ سے اس کا سبب پوچھا۔ لیکن وہ بیچارا زبان نہ کھول سکتا تھا۔ لڑکی کے اصرار کرنے پر اس نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ لڑکی نے اپنے باپ کو تسلی دی اور کہا کہ آپ مطمئن رہیں میں اپنے خاندان کے نام پر ہرگز بٹہ نہ لگنے دونگی۔ آپ یوراج سے کہدیں۔ کہ ساتویں دن آکر رسوم شادی ادا کرلے۔ پروہت بیچارا بڑی کشمکش و پیچ میں تھا لیکن آخر لڑکی کے کہنے کے مطابق اس نے پیغام بھیجدیا۔ لڑکا بہت خوش ہوا۔ اور بڑے ذوق و شوق سے شادی کی تیاریاں کرنے لگا۔ ادھر لڑکی نے ایک علیحدہ کمرہ اپنے لئے تجویز کر لیا۔ اور ایک سخت دست آور دوائی کھالی۔ اجابتیں بڑے زور سے شروع ہو گئیں۔ جو غلاظت نکلتی تھی۔ وہ اسکو وہیں ایک گھڑے میں جمع کرتی جاتی تھی۔ متواتر کئی روز دست آنیکی وجہ سے لڑکی نہایت کمزور ہو گئی خون کا نام و نشان نہ رہا۔ رخساروں کی ہڈیاں باہر نکل آئیں وہی سُندری جو حور وش تھی چڑیل سی نظر آنے لگی۔ اور غلاظت کے کئی دن تک وہاں پڑے

رہنے سے وہ کمرہ عفونت سے بھر گیا۔ آخر مقررہ دن آپہنچا۔ راجہ کا لڑکا بن سنور کر وہاں پہنچا۔ اس کو گندے کمرے میں پہنچایا گیا۔ اس کو پروہت کی حرکت پر سخت غصہ آیا۔ اور قریب تھا۔ کہ پروہت کو تلوار کے گھاٹ اتار دے کہ اندر سے لڑکی نے اپنی کمزور آواز سے کہا۔ راج کنور آئیے آپ کی معشوقہ موجود ہے۔ جب اس نے آواز کے مقام پر نگاہ ڈالی تو وہ اور بھی زیادہ غضبناک ہو گیا۔ اور کڑک کر کہا۔ او ڈائن تو کون ہے؟ وہ پری جمال محبوبہ کہاں ہے کہ جس کے حسن کا مقابلہ عرش کی حوریں اور اندر کے اکھاڑہ کی پریاں بھی نہ کر سکتی تھیں۔ اس نے کہا۔" وہ میں ہی ہوں البتہ میں چیز کی وجہ سے آپ کی رگ محبت پھڑک اٹھی تھی۔ اور آپ کے عشق نے جوش مارا تھا۔ اگر اسے دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ گھڑے میں موجود ہے۔ سوائے اس چیز کے میرے اندر سے اور کوئی شے جدا نہیں ہوئی۔ جس حسن کا آپ ذکر کرتے ہیں وہ بجنسہٖ اس گھڑے میں محفوظ رکھا ہے" لڑکے کو سمجھ آ گئی۔ اس کی چیخ نکل گئی۔ اور وہ اس کے پاؤں پہ گر کر کہنے لگا۔ "اے بہن! واقعی میں جھوٹے پریم کا دعویدار تھا۔ میری محبت غلاظت اور عفونت سے تھی۔ لیکن اب میں تیرا سچا پریمی ہوں۔ تیری خوبی۔ تیری نیکی۔ تیری عصمت اور تیرے اندرونی حسن کا پجاری ہوں۔" عزیزو یہ ہے سچے اور جھوٹے پریم کا فرق! ؎

نرسد عاشقی بہ بوالہوساں عاشقی دیگر و ہوس دگر است

ترجمہ: حریص آدمی عاشقی حاصل نہیں کر سکتا۔ عاشقی ایک علیحدہ چیز ہے اور ہوس علیحدہ۔

اپنے پروردگار سے بھی خود غرضی کا پریم نہ ہونا چاہیئے۔ جو لوگ دنیا کی فانی چیزوں کیلئے یا سورگ یا بہشت حاصل کرنے کی نیت سے اپنے مالک سے پریم کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ بھی بنیا پن دکھاتے ہیں اور اپنے مالک سے بھی بیوپار کرتے ہیں۔ ایسا پریم حقیقی راحت کا موجب نہیں بن سکتا۔ سندھیا یا نماز ادا کرنے یا دیگر طرح سے عبادت کر کے کسی چیز کی بھی خواہش نہ رکھنا چاہیئے ؎

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے ! — او بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

اول تو کوئی خواہش رکھنا ہی نہ چاہیئے۔ لیکن اگر کچھ مانگنا ہی ہو تو بس یہ کہ ؎

آہ ہر کس بخیالِ خود دارد ز تو مقصودے — ایں جملہ طفیل ز من از تو ترا خواہم!
ہر صبح اُٹھ کے تجھ سے مانگوں میں تجھی کو — تیرے سوا تو میرا کچھ مدعا نہیں ہے

بھگوان سے پریم بے اندازہ ہونا چاہیئے۔ ایک منٹ کی بھی جدائی اس سے نہ ہونی چاہیئے۔ لیکن پریم کا معاوضہ نہ مانگ کر کہنا چاہیئے ؎

جیتا رکھے تو ہم کو یا دھڑ سے سر اُتارے — اب تو فقیر عاشق کہتا ہے یوں پکارے
راضی ہیں ہم اُسی میں جس میں تری رضا ہے — یاں یُوں بھی واہ وا ہے اور وُوں بھی واہ وا ہے

پریم کتھا تو بہت لمبی ہے افسانۂ محبت طویل ہے۔ اسکو کہاں تک بھلا بیان کیا جائے۔ اس چھوٹے سے مضمون میں اس سارے افسانے کو ضبطِ تحریر میں لانا ممکن نہیں لیکن جس قدر عرض ہُوا ہے اسکو ہی اگر ٹھیک طور پر سمجھ لیا جائے۔ تو ہماری ۹۹ فیصدی تکالیف رفع ہو سکتی ہیں۔ یہ تکالیف اور رنج کہیں باہر سے نہیں آتے۔ ہم خود ہی ان کو پیدا کرنے والے ہوتے ہیں۔ اور ان کو دُور کرنے کیلئے بھی کوئی باہر کی طاقت کام نہیں کر سکتی۔ دُور بھی ہم خود ہی کر سکتے ہیں۔ ہم خود ہی ان کا سبب ہیں اور خود ہی ان کے معالج بن سکتے ہیں۔ اگر ہم پریم اور اُلفت کے راز سے آگاہ ہو جائیں۔ تو ہمارے سارے رنج والم راحت و مسرت میں تبدیل ہو جائیں۔ فی زمانہ ہم اوّل تو پریم کو اپنی زندگی اور اپنے شعار میں جگہ ہی نہیں دیتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی بے لطف ہو جاتی ہے۔ اگر ایک شخص مٹھائی تیار کرے اور اس میں قند نہ ڈالے تو وہ مٹھائی نہیں کہلا سکتی کیونکہ اس کے اندر مٹھاس موجود نہیں ایسے ہی زندگی کی مٹھاس کے اندر اگر پریم کی قند شامل نہ کی جائے تو وہ بدمزہ پھیکی۔ اور بد ذائقہ رہیگی۔ اس میں نہ اپنے آپ کو لطف آئیگا نہ اُن کو جن سے ہمارا دنیا کے اندر واسطہ

پڑتا ہے۔ خواہ وہ گھر کے آدمی ہیں یا باہر کے جس قدر پریم کا جزو زیادہ ہوگا۔ اتنا زیادہ لطف ہم کو بھی آئیگا۔ اور دوسرے بھی اس سے اتنے ہی زیادہ محظوظ ہونگے۔

بعض بھلائی پریم کا جزو تو کچھ کچھ شامل کرتے ہیں لیکن اس کے اوپر چھلکا لگا دیتے ہیں جس کی وجہ سے مٹھاس پورے طور سے شامل نہیں ہوتی۔ اگر چاشنی بنانے کیلئے گڑ کی ڈلی پر غلاف چڑھا کر پانی میں چھوڑ دیا جائے۔ تو چاشنی پھیکی تیار ہوگی۔ اگر مٹھاس کا پورا لطف لینا ہو تو غلاف کو ہٹا دینا پڑیگا۔ تبھی ٹھیک، رسدار اور اعلیٰ چاشنی تیار ہوگی۔ ایسے ہی جو بھائی پریم کے اوپر غیریت کے غلاف چڑھا دیتے ہیں۔ ان کی زندگی کی چاشنی بھی پھیکی تیار ہوتی ہے۔ یعنی ایک انسان کہتا ہے کہ جس کے سر پر چوٹی ہوگی وہی پریم کے لائق ہوسکتا ہے۔ ایک کہتا ہے کہ جس کے سر پر ترکی ٹوپی ہوگی وہی میری محبت کا اہل ہوسکتا ہے تیسرا کہتا ہے کہ جس کے سر اور منہ پر بال ہونگے۔ اسی سے میں پیار کرسکتا ہوں۔ یہ غلاف ہیں یہ چھلکے ہیں کہ جو پریم کی مٹھاس کو باہر نہیں آنے دیتے۔ اگر سچ مچ زندگی کو شیریں بنانا منظور ہو۔ تو ان رکاوٹوں کو دور کر دینا چاہیئے۔ پھر دیکھیے کیسا سرور آتا ہے۔ زندگی کیسی پُر لطف ہوجاتی ہے۔ اور پھر کیسے مستی کے سرور آمیز ترانے اُٹھتے ہیں۔ اور خود بخود زبان سے نکلتا ہے ؎

ہندو سے عداوت نہ مسلمان سے کینہ
گنگا بھی پیاری ہے پیارا ہے مدینہ
ہم طالب حق ہیں ہمیں چاہیئے آتش
پہنچا دے جو حق تک وہی عرفان کا زینہ

پریم کی گرمی پر سے اگر چھلکا اُتر جائے تو وہ وشو پریم[1] بن جائیگا جسکو ایک چشمہ سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ ہر ایک انسان کے پریم کا انفرادی جذبہ ایک قطرے کی مانند ہوتا ہے اگر وہ قطرہ الگ تھلگ غلاف میں بند رہیگا۔ تو زمانے کے گرم جھونکے اسکو خشک کرکے نیست و نابود کر دینگے۔ لیکن اگر وہ پہنچا دیا گیا چشمہ سے ہم آغوش ہو جائیگا۔ تو اُس کو ابدی زندگی مل جائے گی۔ اور وہ خود بھی چشمہ بن جائے گا۔ سچ ہے ع

[1] ہر ایک سے محبت۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

ایسا بن کر ایک تو قدرت کی خوبصورتی کو بڑھائے گا۔ دوسرے ہر ایک کو پیارا اور بھلا معلوم دیگا۔ اور علاوہ ازیں اور لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ اگر وہ پریم کا قطرہ وشو پریم کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوگا۔ تو نتیجہ کیا ہوگا۔ ع

خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

ہم نے موجودہ زمانے میں اپنے اپنے انفرادی پریم کے اوپر چھلکا چڑھا رکھا ہے وہ آہستہ آہستہ خشک ہو رہا ہے جس کی وجہ سے باہمی ہمدردی و اُلفت کے جذبے بڑے کمزور پڑ گئے ہیں۔ ایسے حالات کو دیکھ کر کوئی کوئی جو سچا پریمی موجود ہے دل برداشتہ ہو جاتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے اور کہاں جائے۔ موجودہ بے رُخی نارواداری، نزاع و تکرار، بے جا چھیڑ چھاڑ اور بلا وجہ جنگ و جدال دیکھ کر غالب کی طرح کہتا ہے ؎

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو — ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیئے — کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار — اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

میرؔ نے بھی کچھ ایسا ہی کہا ہے ؎

ان اجڑی ہوئی بستیوں میں جی نہیں لگتا — ہے جی میں وہیں جا بسیں ویرانہ جہاں ہو

جدھر نگاہیں ڈالیں۔ خود غرضی کے پتلے اغرض کے بندے۔ اپنے بھائیوں کی کھال اتارنے والے انسان ملتے ہیں بلکہ آدم بو آدم بو کہنے والے ملتے ہیں۔ ان کو جو چاہو نام دے لو۔ کوئی سچا پریمی جو وشو پریم کے راز سے باخبر ہو نظر نہیں آتا۔ ؎

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا!

بُت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا (اکبر)

حالات حاضرہ کو دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ سینہ دہکتا ہے۔ گلا رُکتا ہے۔ نہ معلوم یہ بُرا وقت ہماری آنکھوں کے لئے کیوں رکھا ہوا تھا۔ کاش اگر یا تو یہ حالات بد پیدا نہ ہوتے یا ہم ہی نہ ہوتے۔ لیکن مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس مالک برتر کی بارگاہ عالی سے ہر وقت نیک امید رکھنا چاہیئے۔ وہ خدائے عزوجل تو ہر وقت ہماری بہتری چاہتے ہیں۔ لیکن ہم خود ہی اس حالت زبوں کے ذمہ دار ہیں ہم جان بُوجھ کر اور دیکھ بھال کر چاہ ضلالت میں گر رہے ہیں۔ اس لئے اُس پاک ذات کی درگاہ عالی سے یہی امید رکھنا چاہیئے۔ کہ وہ ہمیں بھی دین و دنیا میں سربلند کرے اور ہمیں اپنے بھگتوں کی صف میں شامل ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور ہمارا درشن کا شمار بھی دنیا کے نیک نام ملکوں میں ہو ؎

یارب ایں آرزوئی من چہ خوش است — تو بدیں آرزو مرا برساں

ترجمہ:۔ اے میرے مالک یہ میری خواہش کیسی اچھی ہے۔ تو اس میری آرزو کو بار آور کر۔

ممکن ہے یہ کمزور لیکن پُردرد آواز میرے بھائیوں کے کان تک پہنچے اور وہ اپنی حالت کو بہتر بنانے کے لئے کمربستہ ہو جائیں۔ اسی لئے میں یہی امید رکھتا ہوں کہ ؎

ہر دردمند دل کو رونا مرا رُلا دے
بیہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے — (اقبال)

اِنسان اور اِنسان

کیا غضب ہے نہیں انسان کو انساں کی قدر
ہر فرشتے کو یہ حسرت ہے کہ انساں ہوتا

لوگ کہتے ہیں کہ سب ملک ترقی کر رہے ہیں۔ نئی نئی ایجادیں کر رہے ہیں۔ سائنس کے نئے نئے کرشمے دکھا رہے ہیں۔ اب بجلی کے ذریعہ ایک آدمی بنایا گیا ہے۔ جو نوکر کی طرح بہت سے کام سرانجام دیتا ہے یعنی دروازے پر موجود رہتا ہے کسی آنے والے کی اطلاع اندر اپنے مالک کو پہنچاتا ہے۔ واپس آکر جواب دیتا ہے وغیرہ وغیرہ دوسرے ملکوں کی ترقی کی تعریف کرتے ہوئے لوگ ہندوستانیوں کو کوستے ہیں کہ وہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ جو چرخہ رام کی ماں کاتتی تھی۔ وہی آج تک موجود ہے جس کشتی پر حضرت نوحؑ سوار ہوئے تھے۔ بعینہ وہ آج تک چلی آئی ہے۔ جو ہل حضرت آدمؑ نے چلایا تھا۔ اس کو پوری قدر و منزلت اور احترام کے ساتھ آج تک برقرار رکھا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ شاید ہندوستانیوں کے خلاف یہ الزام درست ہو۔ لیکن میں تو اس کو تسلیم نہیں کرتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو کام ایک ہندوستانی خاص کر وہ ہندوستانی جو آجکل مذہب کے پیرو ہونے کا مدعی ہے کر سکتا ہے وہ کسی ملک کا ہیئت دان یا سائنس دان نہیں کر سکتا۔ آپ سوال کریں گے۔ کہ یہ کیسے؟ لیجئے میں ابھی آپ کی حیرانی رفع کئے دیتا ہوں۔ جس مغربی سائنس دان نے بجلی کا آدمی بنایا ہے۔ اس نے کئی سال کے تجربات اور محنت و کاوش کے بعد اس کی تکمیل کی ہوگی۔ اور ابھی جو خامیاں اسے معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے دور کرنے میں شاید کئی سال اور بھی لگیں گے۔ اور پھر بھی وہ قدرتی انسان جیسا نہیں ہوگا

سکتا۔ قدرتی طور پر جو انسان بنتا ہے۔ اسکو بھی کئی سال لگتے ہیں۔ پہلے ماں کے پیٹ میں نو ماہ تک حمل کی صورت میں رہتا ہے۔ پھر پیدا ہونے پر ہزار مصیبتوں سے ماں باپ اس کی پرورش کر کے بڑا کرتے ہیں اور تعلیم و تادیب کے ذریعہ لاکھ جتن کر کے کہیں اس کو انسان کا درجہ حاصل کرنے کے لائق بناتے ہیں۔ لیکن اس کے مقابلہ میں آج کل کا مذہبی دیوانہ ہندوستانی پانچ منٹ میں بنا بنایا جیتا جاگتا رگ و خون والا انسان طیار کر سکتا ہے آپ حیران ہونگے یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ بھی سن لیجئے!

دیکھئے ایک شخص جس کا نام کریم بخش ہے وہ نہایت پاکباز۔ خوش اخلاق اور خدا ترس آدمی ہے۔ لیکن گوپال داس کی نظر میں وہ انسان ہی نہیں۔ گوپال داس کا اگر بس چلے تو بھارت بھومی کی سرحد سے اسے باہر کر دے۔ اب گوپال داس کو دھن سماتی ہے کہ اسے انسان بنا دے۔ کسی طرح کریم بخش کو اپنا ہم خیال کر لیتا ہے۔ آگ کے اندر تھوڑا سا گھی اور خوشبودار چیزیں جلا کر اس کے سر پر چوٹی رکھوا کر اور گلے میں جنیو پہنا کر اس کا نام رکھ دیتا ہے دیال ونت بس اب گوپال داس کی نظر میں وہ بھی انسان ہو گیا۔ حالانکہ اس شخص کے جسم و جان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اور اس کے نام کریم بخش کے بھی وہی معنی ہیں۔ جو دیال ونت کے ہیں۔ دوسری طرف ایک شخص بھگوان داس ہے وہ وحدانیت کا قائل ہے اور ایک اونکار کا جاپ کرتا ہے۔ ہر ایک انسان میں ایک ہی مالک کا نور دیکھتا ہے۔ لیکن عاشق محمد کی نگاہ میں وہ انسان نہیں۔ اس کا بس چلے تو اس کافر کی گردن اڑا دے۔ عاشق محمد کو خبط سماتا ہے اور بھگوان داس کو راضی کر کے اس کی چوٹی کٹوا دیتا ہے۔ لا الہ الا اللہ کا کلمہ پڑھا دیتا ہے اور عبدالباری نام رکھ دیتا ہے۔ بس دو منٹ میں اس کو انسان بنا دیتا ہے۔ حالانکہ پہلی مثال کی طرح بھگوان داس اور عبدالباری کے معنی میں کوئی فرق نہیں۔ ایک اونکار

اور لا الٰہ الا اللہ ہم معنی کلمے ہیں۔ تاہم وہ پہلے انسان نہیں تھا۔ لیکن اب پورا انسان بن گیا۔ اب آپ کو پتہ لگ گیا ہوگا۔ کہ کس طرح سے جنت نشان ہندوستان کا مذہبی دیوانہ ہندوستانی مداری کی جادو کی لکڑی کی طرح منٹوں میں انسان بنا لیتا ہے اور اس طرح سے انسان طیار کرنے میں قدرت اور یورپ کے سائنسدانوں سے بھی بازی لے جاتا ہے

وائے بدقسمتی! ہے کوئی حد جہالت اور نادانی کی؟ انسانیت کا معیار کیا رکھ لیا گیا ہے؟ نہ کوئی اخلاق کی قدر ہے اور نہ سیرت کا خیال۔ رام لال خواہ اوّل درجہ کا غنڈہ ہے دیا کرشن کو عزیز ہے کیونکہ اس کا نام رام لال ہے۔ دین محمد خواہ بداخلاق اور بدچلنی کا پتلا ہے انسانی امن میں ہر وقت خلل ڈالنے والا ہے۔ لیکن اللہ دتہ کو پیارا ہے کیونکہ اس کا نام دین محمد ہے۔ ہے کوئی ٹھکانا اس پاجی پن کا

راہ وہ چلتے ہیں ہم لگتی ہے جس سے ٹھوکر
کام ہم کرتے ہیں وہ جس میں ضرر دیکھتے ہیں

کیا ہم اسی عقل و ذہانت کے برتنے پر سوراج کے طلبگار ہیں۔ کیا ہم سوراج لیکر سنبھال سکیں گے؟ ہے ہمارے اندر وہ مادہ اور اہلیت؟ ہرگز نہیں ہمارے اندر تو DISCIPLINE یا ضبط کا مادہ نام کو بھی نہیں۔ رواداری کا نشان تک نہیں بُردباری کا سایہ بھی ہم پر نہیں پڑا۔ ایسی حالت میں سوراج کے خواہاں ہونا نادان بچے کی طرح چاند کیلئے لپکنا نہیں تو اور کیا ہے؟ میں تو کم از کم ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ کہ جس قوم کا اخلاق اتنا نیچا ہے۔ وہ اوّل تو سوراج کی اہل ہی نہیں۔ اور اگر اسے مل بھی جائے تو اس سے زیادہ؂ سر پھٹول ہوگی۔ سوراج کی طلب تو ناجائز نہیں لیکن پہلے اپنی طبائع اور اپنے اخلاق پر سوراج حاصل کرنا لازمی ہے۔ اندر کا سوراج جب تک ہاتھ نہ آئے باہر کا سوراج تو مل ہی نہیں سکتا۔ اور اگر ملے بھی تو بجائے فائدہ نے نقصان دیگا

کیا آپ کو معلوم ہے کہ کیوں اہل مغرب برسر اقتدار ہیں؟ اگر نہیں تو سن لو

مشرقی تو سرِ دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

؂ یہ بات ۱۹۳۷ء میں لکھی گئی تھی۔ آج ۱۹۴۶ء میں سچی ثابت ہو رہی ہے۔

یہ ہے فرق! اسی فرق نے ان کو حاکم اور ہمیں محکوم بنایا ہوا ہے۔

کہیں رٹ لگائی جاتی ہے کہ تعلیم کی کمی اس ملک کی پس ماندگی کی ذمہ دار ہے۔ ہیں تعلیم کا بڑا حامی و مددگار ہوں۔ لیکن ملکوں کو ترقی کی شاہراہ پر چلانے کیلئے کوئی اور چیز درکار ہے جو اس ملک میں معدوم ہے۔ وہ بھی سن لو ؎

قوم میں گر علم پھونکے بھی سہارے زندگی
جان کیا پیدا ہو جب دو شخص بھی یکدل نہیں (اکبر)

ہم تو پڑے ہوئے ہیں فضولیات میں حقیقت کی طرف اور اصلی مدعا کی طرف ہماری توجہ ہی نہیں جاتی۔ اصلیت کی طرف ہمارا دھیان ہی منتقل نہیں ہوتا۔ حالانکہ انسان کی عقل و دانش کا اندازہ ہی اس بات سے لگتا ہے کہ کہاں تک وہ مہملات سے دور رہتا ہے ؎

اتنا ہی آدمی میں سمجھئے کمالِ فہم — جتنا کہ احتراز کرے وہ فضول سے

اس ملک میں کوئی ایک مرض تھوڑا ہی ہے۔ یہاں تو جسم کی رگ رگ میں جراثیم امراض پیدا ہو گئے ہیں۔ خود غرضی کا وہ عالم ہے کہ خدا کی پناہ! کہیں نوکریوں کا جھگڑا انسان کو انسان سے جدا کر رہا ہے۔ عبدالغفور چاہتا ہے کہ اللہ بخش اور شاہنواز ہی سارے ملازمت میں آ جائیں۔ اور دیو داس کی خواہش رہتی ہے کہ رام کشن اور کرپا رام ہی سب آسامیوں پر قابض ہو جائیں۔ کوئی آدمیت کی کسوٹی نہیں۔ کوئی لیاقت کا لحاظ نہیں۔ پھر یہ بات بھی سوچنے کے قابل ہے کہ کیا سب کو ملازم کرا لوگے۔ نوکریوں کی تعداد تو مقرر ہے اس میں ہر سال کالجوں کی مشین سے نکلے ہوئے سارے کے سارے پڑھے کس طرح کھپ سکتے ہیں۔ خواہ ہندو ہیں یا مسلمان۔ کیا اپنی اپنی ملت کے افراد کو ملازمت میں حلقہ تنگ پیش کرنے کی کوشش کرنا بے روزگاری کا علاج ہے؟ یا کیا اسکو ملک و ملت کی خدمت کا نام دیا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اکبر نے کہا ہے ؎

ہر ایک کو نوکری نہیں ملنے کی — ہر باغ میں یہ کلی نہیں کھلنے کی

کچھ پڑھ کے تو صنعت و حرفت کو سیکھ عزت کے لئے کافی ہے دل کی نیکی

ہم اگر اس حقیقت کو نہیں سمجھتے اور اپنے اپنے راگ الاپنے کو ہی ملت کی حقیقی خدمت سمجھتے ہیں۔ اور ایک تنگ دائرہ میں مقیّد رہنے کو ہی ترقی خیال کرتے ہیں۔ یا تنگ نظری کو ہی قومی خدمت کا نام دیتے ہیں۔ تو ہاتھ تو کچھ آئیگا نہیں۔ البتہ موجودہ حالت کو ہم اور بھی بدتر بنا دیں گے۔ ہمارا موجودہ رویّہ پہلے ہی کافی مصیبت ہم پر لا چکا ہے۔ اگر اس میں نمایاں اور فوری تبدیلی نہ کی گئی تو اور بلائیں نازل ہونگی۔ میں یہ بات اپنے پاس سے نہیں کہتا۔ بلکہ یہ صاحب الرائے اہل نظر کا نظریہ ہے کہ اس طریقۂ کار سے بہتری کی صورت نہیں نکل سکتی۔ سنیئے حضرت اکبر الہ آبادی کیا فرماتے ہیں ؎

پیچھے چلائے کودے اچھلے ٹہلے پھر پھر کے وہیں رہے جہاں تھے پہلے
حالت تو وہی ہے بلکہ اس سے بدتر یوں منہ سے جو چاہے دل میں آئے کہہ لے

یہ طریقے غلط ہیں۔ یہ تمیزیں اور تفرقے سچے ایمان کی منافی ہیں۔ اس غربت کی وجہ بلاشبہ یہی ہے کہ لوگوں کے سامنے محض روٹی کا سوال یا تنگدلی رہ گئی ہے اور خدا کو لوگ بھلا بیٹھے ہیں۔ اگر ہم اپنے پیارے پربھو کی ہستی کو سچے معنوں میں تسلیم کریں تو کیسے ممکن ہے۔ کہ انسان اور انسان کے درمیان محض اس بنا پر فرق دیکھیں کہ وہ مختلف شریعتوں کے پابند ہیں۔ اگر ہم کو پروردگار کی ہستی کا حقیقی معنوں میں یقین ہو۔ تو اس کے بندوں میں ہرگز تمیز نہ کریں۔ ان فرضی حدبندیوں اور اس بناوٹی حدِ فاصل کی وجہ سے باہمی صلح اور آشتی کو ترک کر دینا اس امر کی بیّن دلیل ہے کہ ہم کو خالق کونین کے واحد و یکتا ہونے سے انکار ہے ؎

میں دیکھتا ہوں صلح و محبت ہے اٹھ گئی ہر دل سے ہر گروہ سے ہر خاندان سے
اس کا سبب نہیں ہے سوا اسکے اور کچھ یعنی کہ اٹھ گیا ہے خدا درمیان سے

جو اہل نظر ہیں۔ جن کو چشم بینا عطا ہوئی ہے اور بصیرت جن کے حصہ میں آئی ہے وہ ان تمیزوں کا دل میں خیال بھی نہیں لا سکتے۔ ان کی نظر میں تو سب انسان ایک ہی

آفتاب کی کرنیں۔ ایک ہی سمندر کی لہریں۔ ایک ہی بحر کے قطرے۔ حتیٰ کہ ایک ہی جسم کے اعضا ہیں ؎

ہر دم بذاتِ جملہ عیاں است آں یکے　　در جملہ ہست بلود نہاں ست آں یکے
در صورتِ بشر تو نگاہ چہ مے کنی　　نے نے بشر کجاست عیاں ست آں یکے

ترجمہ:- وہ ایک خالقِ کل ہر ایک چیز کے اندر ہر وقت موجود ہے۔ تو انسان کی شکل و صورت کو دیکھ کر قیاس آرائیاں کرتا ہے (اے بے سمجھ!) یہ انسان کہاں ہے؟ یہ تو سب اسی ذات کی جلوہ آرائیاں ہیں!

حقیقت یہی ہے کہ اس صانع قدیر کا جلوہ ہر ایک بشر میں چمکتا ہے۔ پھر جو شخص ایسا نہیں دیکھتا۔ وہ کس طرح سے اس ذاتِ پاک کی ہستی کا قائل کہا جا سکتا ہے ؎

ایک ہے اللہ اور بندے بھی سارے ایک ہیں　　پھر بتا و تفرقہ کیوں ہندو و مسلم میں ہے

جو لوگ سچے معنی میں اس حکیم مطلق کی رحمت کو سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اس ذاتِ مقدس کے نزدیک شرلعیتوں کی وجہ سے کوئی امتیاز نہیں۔ ہاں اعمال اور نیکی کے لحاظ سے درجے ضرور ملتے ہیں۔ بھگوان کرشن گیتا کے نویں ادھیائے میں فرماتے ہیں کہ "میں سب ہستیوں میں یکساں طور پر موجود ہوں۔ نہ مجھے کسی سے رغبت ہے نہ نفرت۔ جو سچی عقیدتمندی سے مجھ کو یاد کرتے ہیں۔ وہ مجھ میں سمائے ہوئے ہیں۔ اور میں اُن کے اندر سمایا ہوا ہوں" سچی عقیدتمندی سے یاد کرنا کیا ہوتا ہے۔ اس کے متعلق وہ ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ "جو شخص میرا جلوہ ہر ایک ہستی میں چمکتا ہوا دیکھتا ہے اور مختلف ہستیوں میں کوئی تمیز نہیں کرتا۔ وہی حقیقت بین ہے لہذا اسکو میں کبھی نہیں بھلاتا"

جو لوگ اپنے مالک کی سچی محبت سے سرشار ہوتے ہیں۔ ان کی نظر میں یہ ظاہری امتیاز کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ وہ تو قدم قدم پر جبینِ نیاز ٹیکتے ہیں اور پاؤں ہی سے نہیں بلکہ راہِ محبت میں سر کے بل چلتے ہیں ؎

مجھے تو بیخودیٔ شوق میں منظور سجدہ تھا　　مجھے یہ ہوش ہی کب تھی کہ پیشانی کہاں رکھدی

سوال ہو سکتا ہے کہ یہ تو بڑی نا زیب بات ہے کہ انسان دوست دشمن میں تمیز ہی نہ کرے۔ قدرتی طور پر جو انسان ہم سے اُنس کرتا ہے وہ ہماری توجہ کا زیادہ مستحق ہے یہ سوال ضرور صحیح ہے۔ لیکن دراصل نہایت ادنٰے درجے کے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ بعض لوگ ایک انسان کو اچھا سمجھتے ہیں اور بعض ایسا نہیں سمجھتے۔ اچھا جاننے والے لوگ دوست کے لقب سے پکارے جا سکتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگوں کو مخالف یا دشمن کہتے ہیں۔ لیکن حقیقت بین انسان اس بات کی پڑتال نہیں کرتا کہ کون مجھے نیک سمجھتا ہے اور کون بد۔ وہ ان کے خیالات کا جائزہ ہی نہیں لیتا۔ اُن کے خیالات ان کو مبارک رہیں۔ وہ ایسا نہیں سمجھتا۔ بلکہ اس سے اگر پوچھو کہ تمہارا کون دوست ہے اور کون دشمن۔ تو اس کا جواب وہ یہ دیتا ہے ؎

سب میں جلوہ ہے اسی کا کیا میں دیکھوں کون ہے دوست
میری نظروں میں ہے یکساں لٹنے دشمن لوٹے دوست

ایسے حقیقت بین انسانوں کے لئے سب ہی دوست ہوتے ہیں۔ ایسی نگاہ رکھنے والے کے لئے دوست اور دشمن کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ؎

خوش بخت ہے وحدت کا جسے جام ملا　　کیا خوب یہ سرکار سے انعام ملا
آنکھوں سے اٹھائے دوئی کے پردے　　ہر رنگ میں لچھمن ہے کہیں رام ملا

سچی محبت کے رنگ میں رنگے ہوئے انسان نہ صرف یہ کہ انسان انسان میں تمیز نہیں کرتے۔ بلکہ ہر ایک انسان میں جلوۂ الٰہی کی تجلیاں دیکھتے ہیں ؎

دوئی محال ہے اہلِ وجود کے نزدیک　　تو جس کو کہتا ہے بندہ وہی خدا بھی ہے

اہلِ نظر کے آئین میں وہی سچا خدا دوست ہے۔ وہی مالکِ کل سے پیار کرنے والا ہے۔ وہی حقیقی پر بھو بھگت کہا جا سکتا ہے اور اسی کی ہی سچی عبادت اور

جھلکتی ہے۔ جو اس مالک کو ہر ایک بشر کے اندر دیکھتا اور پہچانتا ہے۔ اگر ایسی حالت پیدا نہ ہو۔ تو وہ اپنے مولا کا سچا عاشق نہیں کہلا سکتا ؎

ہر جان میں ہر زبان میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے اگر اس کو تو ہر رنگ میں پہچان

حقیقت بین انسان اس دنیا کی چند روزہ زندگی کو بے حقیقت سمجھتے ہیں ان کے نزدیک دنیا ایک کاروان سرائے ہے۔ ان کو یقین ہے کہ یہ دنیا ضرور چھوڑنی ہے۔ یہاں کا قیام عارضی ہے ؎

ایکدم ہستی نے کو ٹھہرا ہوں چلنا ہے مجھے   شمع ہستی کو سمجھتا ہوں ہیں ایکبہ دم کا

قرآن شریف میں موت کا نام یقین لکھا ہے۔ اس لئے کہ دو چیزوں میں خواہ کسی کی شک بھی ہو۔ لیکن موت کے آنے میں ہرگز شک نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک لازمی اور یقینی شے ہے جس سے کوئی کہیں بھی بھاگ کر نہیں بچ سکتا۔ موت کی گرفت سے نہ کوئی بڑا بچ سکتا ہے نہ چھوٹا۔ نہ کوئی شہزور بچ سکتا ہے نہ کمزور۔ نہ کوئی چکرورتی راجہ محفوظ رہ سکتا ہے نہ کنگال ؎

مسکیں ہو گدا ہو یا ہو شاہ   بیماری موت سے کہاں کسکو پناہ
آ ہی جاتا ہے زندگی میں وقت   کرنا پڑتا ہے سب کو اللہ اللہ

جب اس موت کے بعد کی حالت کو دیکھتے ہیں تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ انسان انسان میں جو تمیز کی جا رہی ہے۔ یعنی پیشانی پر تلک لگانے والے اور جس کے ماتھے پر سجدہ کا نشان ہو۔ ان دونوں کو جو مختلف ہستیاں سمجھا جاتا ہے۔ یہ یہیں کی اُپج ہے۔ اسی دنیا کی ایجاد ہے اور یہیں کے ڈھکوسلے ہیں ؎

مرگ چوں آید زجاں بے جاں کند   ایں مراتب با ہمہ یکساں کند

ترجمہ۔ جب موت آکر جاندار کو بے جان کر دیتی ہے۔ تو یہاں کی درجہ بندیوں

اور تمیزوں کو اڑا کر سب کو یکساں کر دیتی ہے۔

یہاں پر کوئی کہہ لے کہ وہ ایسا بڑا ہے۔ یا اس کو ایسا جاہ و مرتبہ ملا ہے۔ یا وہ ایسا عالی نژاد ہے۔ یا وہ اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہے یا وہ لاکھوں کی جائیداد کا مالک ہے۔ لیکن ؎

دکھالیں تزک و حشمت چار دن افلاک کے نیچے
شہنشاہ و گدا سب ایک سے ہیں خاک کے نیچے

جاؤ جا کر دیکھو قبرستان میں اور شمشان بھومی میں۔ پہچانو تو وہاں کونسی ہڈی بادشاہ کی ہے اور کونسی در بدر پھرنے والے گدا کی۔ کیا اسوقت کوئی تمیز باشناخت رہتی ہے کتنے مفلس ہو گئے کتنے تونگر ہو گئے خاک میں جب مل گئے دونو برابر ہو گئے۔

وہ سب کا مالک سب کو ایک نظر سے دیکھتا ہے سب کو اپنے بندے سمجھتا ہے اس کی نظر میں ہندو مسلمان کی کوئی تمیز نہیں۔ اس کی رحمتیں سب کے لئے یکساں ہیں۔ اس کے بنائے ہوئے سورج، ہوا، پانی اور آگ وغیرہ نہ ہندو کے لئے مخصوص ہیں نہ مسلمان کی وراثت قرار دی گئی ہیں ؎

سلوک تیرے ہیں سب سے یکساں وہ گبر و ترسا ہوں یا مسلماں
نہ ان سے کچھ تیرا بیر پایا نہ اُن سے کچھ تیرا پیار دیکھا

اُس مالک کو اپنی ہی وراثت سمجھنا ہی بڑی نادانی ہے۔ وہ سب کا مولی ہے سب کا مالک ہے۔ سب کا محافظ ہے اس لئے ؎

میرے اللہ مرے اللہ نہ کر صرف اللہ اللہ کر
یہ ہٹ دھرمی ہے اے زاہد خدا سب کا برابر ہے

ایسا سمجھ کر اصلیت پر نگاہ رکھنے والے اور انسانیت کے جوہر سے بہرہ ور انسان ہر ایک ہستی میں ایک ہی نور چمکتا ہوا دیکھتے ہیں۔ ان کو ہر ایک انسان کی شکل میں اپنا

بھگوان نظر آتا ہے ؎

جلوۂ حق یوں نمایاں صورتِ انساں میں ہے
نورِ خورشیدِ فلک جیسے مہِ تاباں میں ہے

اس حقیقت کو سمجھنے والے کب کسی انسان کو غیر سمجھ کر اس سے نفرت کر سکتے ہیں۔ کب کسی سے بیر رکھ سکتے ہیں۔ کیا کوئی اپنے باپ کی تصویر کو بُرا کہہ سکتا ہے۔ یا اسکو نظرِ بد سے دیکھ سکتا ہے یا اس کی بےحرمتی کر سکتا ہے۔ اگر نہیں تو حقیقت بین انسان بھی ہر ایک انسان کو اس ذاتِ پاک کی صنعت کاری سمجھ کر اس سے محبت کرتے ہیں ؎

ہم نے مخلوق سے خالق کی تجلی پائی   دیکھ لی آئینہ میں آئینہ گر کی صورت

مالک کے سچے پیارے، اس کے حقیقی جاننے والے جب اِدھر اُدھر نگاہ دوڑاتے ہیں تو سوائے اس ذاتِ احدیت صمدیت کے انہیں کچھ اور نظر ہی نہیں آتا۔ وہ سب جگہ ہی بس ہم درشن کرتے ہیں۔ ہر ایک نام اور شکل میں بلکہ ہر ایک خیال میں انہیں اسی ذاتِ پاک کا جلوہ نظر آتا ہے۔

سر و پا میں اس کے نظر کرکے تم   جہاں دیکھو اللہ ہی اللہ وہاں ہے

جن کی آنکھوں میں اس مالک کی تصویر سما جاتی ہے۔ بصیرت اس تجلی سے آشنا ہو جاتی ہے جن کی نگاہ رازِ حقیقت کو بھانپ لیتی ہے۔ جن کی نظر سطح کو چھوڑ کر تہہ پر جا پہنچتی ہے جو باطنی آنکھوں سے پسِ پردہ نگاہ ڈالتے ہیں وہ کیا دیکھتے ہیں ؎

سما یا ہے تو جب سے نظروں میں میری   جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے!

لیکن مشکل یہ ہے کہ انسان اس دید کو حاصل نہیں کرتا۔ اس بصیرت سے فیضیاب نہیں ہونا چاہتا۔ اس دریائے سرور میں غوطے نہیں لگانا چاہتا۔ دنیا ایک سی ہے اس کے اندر سامان ایک سے ہیں۔ لیکن سارے انسان ان سے یکساں مستفید نہیں ہوتے بچھڑا بھی گائے کے تھن سے منہ لگاتا ہے اور جونک بھی تھن کے ساتھ لپٹتی ہے۔ بچھڑا

اس تھن سے دودھ پیتا ہے۔ جونک خون چوستی ہے۔ یہی حال دنیا کے بندوں کا ہے۔ سارے انسان اپنے ہم جنسوں کو دیکھتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بہت کم ہیں۔ جو ہر ایک انسان کو محبّت کا چشمہ سمجھ کر اس سے پیار کر کے اس سے اپنا سرور حاصل کر لیتے ہیں۔ زیادہ تر تو دیکھ کر کڑھتے ہوئے اپنا جی جلاتے ہیں ؎

بشر کی صورت و سیرت کا دیکھنے والا نظر پڑا ہمیں لاکھوں میں کوئی انسان ایک

اپنی اپنی عینک کے مطابق، اپنے اپنے دل کے رنگ کے مطابق انسان اس دنیا کو دیکھتے ہیں۔ جیسے ان کے من کے بھاؤ ہیں۔ ویسے ہی وہ دوسرے کو دیکھتے ہیں ؎

گہر کو جوہری صراف زر کو دیکھتے ہیں بشر کو دیکھنے والے بشر کو دیکھتے ہیں

ورنہ اکثر انسان تو نفرت و غیریت کے جذبہ سے بھرے ہوئے دوسروں کیلئے دُکھ کا باعث بنتے ہیں اور اپنے دل کو جلتی ہوئی بھٹی کی طرح بنا کر خود بھی آرام اور چین سے سدا محروم رہتے ہیں۔ یا اپنے غرور کے اندر اپنے تعصب کے اندر اپنی تنگ نظری کے اندر جکڑے ہوئے خود بخود اپنے لئے دکھ اور مصیبت پیدا کر لیتے ہیں۔

ایسے انسانوں کے لئے ایک اردو شاعر نے کیا اچھا کہا ہے ؎

او بشر او خاک کے پتلے تجھے اتنا غرور! تیرے ہم جنس اور پھر تو ہی رہے ان سے نفور

نشۂ زر نشہ رز[1] کی طرح کیوں چڑھ گیا ہو گئی الٹی سمجھ کیوں کیا ہوا تیرا شعور

اے بشر تجھ پر نہ ہوتا فضل گر اللہ کا تجھ کو کب ملتی یہ عزت یہ شرافت یہ غرور

کر خدا کا شکر کیا تھا کیا سے کیا تو ہو گیا جو ہو کرنا آج کر لے کل تو ہے مرنا ضرور

ہو کے انساں پھر کرے تو ہی جفا انسان پر!

کیا یہی ہے آدمیت تیرے ہاں اے بے شعور؟

اس لئے اپنے غرور، خودی، تعصب، تنگ نظری کو چھوڑ کر یہ سمجھ رکھنا چاہیئے کہ انسان انسان کا بھائی ہے سب انسان ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ ایک ہی خالق

[1] شراب۔

کی مخلوق ہیں۔ ایک ہی ساز کے تار ہیں اور ایک ہی سورج کی کرنیں ہیں۔ وہ لوگ جو ہندو اور مسلمان کی تمیز کرتے ہیں۔ وہ حقیقت سے بہت دور ہیں۔ حقیقتاً ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے۔ ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں رہ سکتے ان کا رشتہ چولی دامن کا ہے۔ ان کا تعلق سورج اور کرن کا ہے۔ ان کا واسطہ درخت اور سایہ کا ہے۔ جیسے یہ چیزیں ایک دوسرے کو ترک نہیں کر سکتیں یعنی باہم دگر علیحدہ نہیں ہو سکتیں۔ ایسے ہی ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ اس علیحدگی کے خیال کو ہی دل سے اُڑا دینا چاہیے۔ ان کا علیحدہ علیحدہ رہنا امر محال ہے ناممکن بات ہے۔ جو شخص ناممکن کو ممکن بنانے کے خیال میں ہے یا اس کے لئے کوشش کرتا ہے۔ اسے تضیع اوقات اور ذلت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا ؎

گر نہیں منہ سے مسلماں ہم سے ہیں ہندو الگ　　کیا ہوا ہونے پھریں ہندو اگر ہیں سو الگ
ہو نہیں سکتے ہیں چہرے سے کبھی ابرو الگ　　یہ الگ تو بھی نہیں ہے پھول سے خوشبو الگ
آئینے میں دو ہیں لیکن عکس و صورت ایک ہیں　　جو بظاہر مختلف ہیں فی الحقیقت ایک ہیں

جو لوگ امتیاز کو وقعت دیتے ہیں۔ جو ان شریعتوں کے اختلاف کو وجہ نزاع و تکرار اور رغبت و نفرت ٹھہراتے ہیں۔ وہ فی الحقیقت متکبر ثابت ہیں وہ خدا کو محدود اور خدائی کو نابود کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو ہندو کہتے ہیں کہ مسلمان اچھے نہیں، بلکہ وہ دھرم کے دشمن ہیں۔ یا جن مسلمانوں کا خیال ہے کہ ایمان ہمارے ہی حصے میں آیا ہے اور سب کے سب ہندو کافر ہیں۔ اُن سے میں ایک سوال کرتا ہوں۔ اور اس کے جواب با صواب کا منتظر رہونگا ؎

دو ستو میں نے یہ مانا کہ شریعت والے　　کفر و ایماں کو بُرا اور بھلا کہتے ہیں،
لیکن از راہِ ظرافت ہے مرا سب سے سوال
جو کہ دو دلوں سے بری ہو اُسے کیا کہتے ہیں؟

بتلایئے کس گروہ یا ٹولے میں ایسے انسانوں کا شمار کروگے۔ جو ان شریعتوں کے وہم سے بالاتر ہیں۔ اے پکّے ہندوؤ اور مسلمانو! کیا ایسے انسانوں کا بھی آپ کے خیال میں کہیں شمار ہوگا؟ کیا وہ بھی آپ کے نزدیک کسی گنتی میں آسکیں گے؟ کیا ایسے لوگوں کا بھی جن کو ہر ایک انسان خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ایک سمندر کی لہر دکھائی دیتا ہے۔ آپ کے اندازہ میں کہیں ٹھکانا ہے؟ یہ آزاد منش لوگ خدا کی مخلوق ہیں یا نہیں؟ سنو ست

جو رند ہیں اُس کے وہ نیارے ہیں مشرب ‎ ‎ کر دیتے ہیں مذہب تو بالکل نہ ہر د بالا
رکھتے نہیں دونوں سے سروکار یہ کچھ بھی ‎ ‎ مسجد ہو مسلماں کی کہ ہندو کا شوالا
ہے اور ہی سمرن یہ جپا کرتے ہیں جس کو ‎ ‎ تسبیح کی حاجت ہے نہ درکار ہے مالا

اے میرے بھولے بھائیو! کیوں غلطی میں پڑے ہو؟ اس ذات باری نے سب انسانوں کو ایک ہی طریق پر پیدا کیا ہے۔ ایک طریق سے ہی اُن کی پرورش کرتا ہے۔ ایک طرح کے ان کو ناک، کان، منہ، آنکھ ملے ہیں۔ سب کو اس کی نعمتیں یکساں حاصل ہیں۔ سارے کے سارے ایک ہی موت کا شکار ہونگے سب کے سب مرنے کے بعد ایک ہی خاک کے نیچے بچھونا لگائیں گے۔ پھر کیوں مفت میں اپنے لئے آزار سہیڑ رکھا ہے۔ کیوں اپنی یہ دنیا اور آخرت دونو خراب کر رہے ہو۔ اس غلطی کو سمجھو اس بھول سے خبردار ہو جاؤ۔ تنگ نظری چھوڑو۔ ذرا دل کو وسیع کرلو۔ اور فراخدلی سے سوامی رام تیرتھ جی مہاراج کے یہ شعر اس حقیقت کو سمجھ کر پڑھا کرو ست

ہر جان میری جان ہے ہر ایک دل ہے دل مرا ‎ ‎ ہاں بلبل و گل مہر و ماہ کی آنکھ میں ہے تل مرا

ہندو مسلماں پارسی سکھ جین عیسائی یہود
ان سب کے سینوں میں دھڑکتا ایک ہے دل مرا

اِنسان اور اُس کا خالق

نشاں کیا کیا دکھائے تُو نے یا رب بے نشاں ہو کر
عیاں کیا کچھ کیا ہے تو نے اے خالق نہاں ہو کر

شری گورو گرنتھ صاحب کے اندر ایک جگہ لکھا ہے کہ باپ کی نسبت بیٹا کیا جانے یا ایک بنی ہوئی چیز اپنے بنانے والے کی نسبت کیا کہے۔ یہی حالت انسان کی اپنے خالق باری کی نسبت کچھ کہنے کے متعلق ہے۔ اسکی ذات بے نیاز کو احاطۂ تحریر و تقریر میں لانا ناممکن ہے۔ کیونکہ وہ اتنی لطیف سے لطیف ہستی ہے کہ اس کے اوصاف کہنے اور لکھنے سے باہر ہیں۔ جو چیز خیال ہی میں نہ آسکتی ہو۔ اس کی نسبت انسان کیا بتا سکتا ہے۔ اس کی ذات بابرکات محسوس کرنے کی شے ہے اور وہ احساس بھی ایک خاص حالت میں پہنچ کر ہوتا ہے۔ ان عنصری حواس سے اسکو سمجھنا یا سمجھانا کیسے ممکن ہو سکتا ہے حق تو یہ ہے کہ اس بحرِ بے پایاں کی کوئی کوئی موج اُس نُورِ مطلق کی کچھ کچھ جھلک خاص خاص انسانوں کو جو کہ نیکی اور عبادت کے پُتلے ہوتے ہیں بڑی جانفشانی کے بعد محسوس ہوتی ہے تو پھر میرے جیسا گنہگار انسان جو کہ اس علم کی ابجد سے بھی آگاہ نہیں اس ذاتِ عالی کے متعلق کیا عرض کر سکتا ہے ؎

کس نداںست کہ منزل گہِ آں یار کجا ست   ایں قدر ہست کہ بانگِ جرسے مے آید

ترجمہ۔ کسی کو معلوم نہیں ہُوا کہ اس یار کی فرودگاہ کہاں ہے۔ ہاں اتنا تو ہے کہ ایک گھنٹہ بجنے کی آواز آتی ہے۔

لیکن ایسا ہوتے ہوئے بھی اپنے سب سے بڑے محسن۔ اپنے مولی۔ اپنے مالک

اپنے خالق کے ان گنت احسانات اور عنایات کا۔ اس کی بے شمار رحمتوں اور نعمتوں اور اسکے فضل و کرم کا ذکر نہ کرنا بھی ناشکر گزاری میں داخل ہے۔ ہاں اسکی توصیف کیلئے توفیق بھی اُسی سے مانگتے ہیں۔ زبان اور قلم تو عاجز ہے۔ خیال کی دوڑ محدود ہے۔ پھر ایسی ہستی بیکراں کے متعلق کچھ عرض کرنے کیلئے بھی اسی کے دربارِ عالی سے امداد کا ملتجی ہوتا ہوں ؎

کمر کستا ہوں تیرے نام پر مجھکو ہدایت دے — سہارے پر ترے اُٹھتا ہوں تیرا مدح خواں ہو کر
جہاں بھولوں تو بتا جس جا بہک جاؤں ہدایت کر — جو ہو لغزش تو مجھکو تھام میرا مہرباں ہو کر
بھروسہ پر تیری امداد کے بیڑا اٹھایا ہے — میں بارِ کوہ اُٹھانے پر تُلا ہوں ناتواں ہو کر

سب سے اول یہ عرض کرنا ہے کہ اُس صانعِ حقیقی کی ہستی ایسے ہی ہویدا ہے اور چشمِ حقیقت رکھنے والوں پر اُس کا وجود اسی طرح سے ظاہر ہے جیسے آفتاب نصف النہار۔ لیکن اگر کوئی اپنی آنکھیں بند کر کے آفتاب کی ہستی سے انکار کر دے یا آنکھوں میں مرض ہونے کی وجہ سے آنکھیں کھل نہ سکیں۔ تو اُس کو سمجھانا کسی شخص کے لئے بھی ممکن نہیں۔ دیکھنے والوں کے لئے تو پتہ پتہ ذرّہ ذرّہ وجودِ باری کی ہستی کی شہادت دے رہا ہے۔ اگر ہم کسی جگہ پر گھاس پھوس اگا ہوا دیکھتے ہیں تو اندازہ لگاتے ہیں کہ یہ خودرَو ہے۔ لیکن اگر باقاعدہ دو دو فٹ کے فاصلہ پر پیڑ اور پودے لگے ہوئے دیکھتے ہیں تو فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ یہ کسی ہاتھ کے لگائے ہوئے ہیں۔ ایسے ہی قدرت کے اندر اگر ہم قدرت کی چیزوں میں بے قاعدگی پاتے تو شاید سمجھ لیتے کہ یہ خود بخود بن گئی ہیں لیکن کائنات کے اندر ہر ایک چیز میں ایک زبردست باقاعدگی پائی جاتی ہے۔ قدرت کے اصول اور اسکا قانون ایسا باقاعدہ ہے کہ ذاتِ باری کے وجود کو جبراً تسلیم کرواتا ہے۔ سورج کا اصولِ مقررہ کے مطابق طلوع اور غروب ہونا۔ چاند کا گھٹنا بڑھنا۔ اپنے اپنے وقت پر موسموں کا بدلنا۔ ہر ایک موسم کے مطابق مختلف نباتات کا نشوونما پانا۔ گندم کے بیج سے گندم ہی کا اُگنا۔ پانی کا نشیب کی طرف بہنا وغیرہ یہ ساری باتیں

قانونِ قدرت کی باقاعدگی کو پکار پکار کر بتا رہی ہیں۔ کسی انسان کی یا کسی ہستی کی کیا مجال کہ اس قانون کے اندر ذرا بھی تبدیلی کر سکے۔ انسان تو بعض دفعہ اپنی نادانی سے خالق برتر کی ہستی سے منکر ہوتا ہے۔ یا شک میں پڑتا ہے۔ اتنی قدرت بھی نہیں رکھتا کہ اپنے جسم سے اکھڑا ہوا ایک بال پھر اسی جگہ لگا دے۔ یا ایک پتے کو توڑ کر پھر وہیں جما دے۔ بلاشبہ خالقِ برتر کو یہ سب توفیق ہے۔ وہی سب کا پیدا کرنے والا۔ پرورش کرنے والا۔ اور فنا کرنے والا ہے۔ کوئی اور دوسرا نہیں ؎

کوئی ہے دوسرا جو خاک کے پتلے میں جی ڈالے یہ قدرت بھی کسی کو ہے کہ سب مخلوق کو پالے
کوئی انسان دو ساعت تو اپنی نبض ٹھہرا لے عنانِ توسنِ عمرِ گذشتہ پھر تو پلٹا لے
عدم سے لا نہیں سکتا ہے انسان ایک ذرہ بھی
بنا سکتا نہیں کوئی بشر چھوٹی سی چیز یا بھی (احمدی)

اس کی قدرت کے طلسم دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ دنیا میں کروڑوں انسان ہیں۔ ان کے ہاتھ، پاؤں، ناک، کان، آنکھ وغیرہ ایک سے ہوتے ہیں۔ لیکن باہم ایک ایسا لطیف فرق ہے کہ ہر ایک انسان کے چہرے کی بناوٹ۔ اس کی آواز، اس کی چال۔ اس کے اعضا کا تناسب ایک دوسرے سے علیحدہ ہے۔ اور اسی اختلاف کی وجہ سے ہر ایک کی لاکھوں میں تمیز اور شناخت ہو سکتی ہے ؎

تیری قدرت نے دکھائی ہے عجب نیرنگی سب کئے تو نے جدا شکل میں انسان پیدا

اگرچہ یہ قدرت کے اصولوں کی باقاعدگی قدرت کی بگونا گوں گلکاری بجائے خود صانع ازلی کی ہستی کا بدیہی ثبوت ہے۔ لیکن پھر بھی اگر کسی کو عقلی دلائل کی ہی ضرورت ہو تو ان کے عرض کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

بعض صاحبان کا خیال ہے کہ یہ کائنات ایک دورِ تسلسل سے چل رہی ہے یعنی جیسے بیج اور زمین کے ملنے سے نباتات اگ آتی ہے اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ خالق کی

موجودگی تب مانی جا سکتی ہے کہ اگر وہ تسلسل کو توڑ کر دکھائے۔ اولاً جیسے اوپر عرض ہوا ہے۔ یہ کائنات کی باقاعدگی اور اس کے اندر مقررہ اصولوں کی موجودگی بجائے خود خالق کی ہستی کی ناطق دلیل ہے۔ اس کے اصولوں میں اگر ذرا بھی فرق آجائے تو ایک منٹ کے لئے بھی یہ کائنات قائم نہ رہ سکے۔ مثلاً ہزاروں سیارے اور ستارے آسمان کے اندر چکر لگا رہے ہیں۔ زمین گھوم رہی ہے۔ اگر یہ اپنے اپنے مقررہ رستے سے ایک ثانیہ بھی ادھر ادھر ہو جائیں۔ تو آج ہی قیامت برپا ہو جائے لیکن یہ اس طرح سے اس حکیم مطلق کے حکم سے قائم ہیں کہ وہ اپنے چکر نہیں راستہ کی تبدیلی یا رفتار کی کمی بیشی نہیں کر سکتے ہیں کوئی طاقت جو اُن کو اس طرح سے نکیل ڈال کر چلا سکے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ ایک دوسرے کی کشش سے اپنے مقررہ مقامات پر قائم رہ کر گھومتے ہیں۔ مانا لیکن وہ کشش کہاں سے آئی؟ اس کا دینے والا کون ہے؟ پھر اُن لوگوں کا سوال بیج سے نباتات کی روئیدگی کے متعلق ہے۔ وہ صاحب شاید اس بات کو بھول جاتے ہیں۔ کہ بعض حالات میں بیج بو یا ہوا بھی روئیدگی اختیار نہیں کرتا۔ یا اُگ کر بڑھتا نہیں۔ یا پھول پھل نہیں آتے۔ محکمۂ زراعت کے ماہرین و دیگر محققین بہتیرے قیاس دوڑاتے اور تجربے کرتے ہیں۔ لیکن سبب دریافت نہیں کر سکتے۔ کبھی کچھ نتیجہ نکالتے ہیں کبھی کچھ۔ مگر وہ نہیں جانتے کہ ے

کس را بپس پردۂ قضا راہ نشد وز سِرّ خدا ہیچ کس آگاہ نشد
ہر کس از سِرّ قیاس چیزے بگفت معلوم نہ گشت و قصہ کوتاہ نشد

ترجمہ:- کوئی شخص قدرت کے طلسموں سے آگاہ نہیں ہو سکا۔ نہ کوئی اس مالک ازلی کے بھیدوں سے باخبر ہوا۔ ہر ایک شخص نے اپنے قیاس کے مطابق کچھ نہ کچھ کہا۔ لیکن حقیقت معلوم نہ ہوئی۔ وہ بھید ویسے کے ویسے ہی پردۂ راز میں رہے اس کی قدرت کے عجائبات کہاں سمجھ میں آسکتے ہیں ے

زخارے گل آورد از نافہ مشک　　زر از کان و برگ تر از چوب خشک

ترجمہ:- وہ حکیم مطلق اپنی قدرت سے کانٹے سے پھول کو اور ناف سے مشک عنبر پیدا کرتا ہے۔ کانوں سے سونا۔ چاندی اور خشک لکڑی سے پتے۔

ہوا کا چلنا۔ پہاڑوں کا بلند چوٹیاں نکالنا۔ آسمان سے بارش کا ہونا سب باتیں اسکی قدرت کے عجائبات ہیں۔ نگاہِ غور رکھنے والے کو سب کچھ دکھائی دیتا ہے ؎

سلیقہ سے صبا جاروبی کی خدمت بجا لائے　　قرینے سے پہاڑوں پر وہ گہری منجیں گرداوائے
فضا اسباب کی ڈوریں ہر اک سو ٹھیک کھچوائے　　اشارہ ہوتے ہی سقائے باراں مشکیں بھر لائے
جہاں جیسی ضرورت ہو کرے چھڑکاؤ تھم تھم کر　　کہیں ہلکا سا چھینٹا دے برس جائے کہیں جم کر
بجز اس کے کوئی ہے بھی کہ برسائے کبھی پانی　　دکھائے ابر کے دامن میں بجلی کی درخشانی

یہ بیابان۔ لق و دق صحرا۔ سرسبز و شاداب پہاڑی علاقے۔ انواع و اقسام کے درخت پھل اور پھول کیا یہ سارے اس خالق ازلی کی بعید از فہم طاقت کو زبانِ حال سے نہیں پکار رہے ہیں ؎

جنگل سرسبز میل ہا میل　　اشجار کی کیا شمار و تفصیل
کیا ہو سکے مجھ سے شرح و تاویل　　زیبا ہے یہاں بیانِ جبریلؑ
اثمارِ لذیذ روح پرور　　بے غایت و انتہا میسر
اللہ رے شیونِ پاک قدرت　　ہر شے سے عیاں ہے اسکی عظمت
جو جانتے ہیں نکاتِ حکمت　　ہر شے سے پاتے ہیں نصیحت
سامع ہو تو ہر طرف صدا ہے　　بینا کو نظارہ جا بجا ہے

مٹی اور پتھر کی کانوں سے سونا پیدا ہونا خشک لکڑی سے سبز پتے ایک ہی زمین میں مختلف بیجوں کو پانی پہنچ کر مختلف اثر دکھانا۔ دھتورے کے اندر زہر بننا اور گنے کے اندر مٹھاس طیار ہونا عجائباتِ قدرت ہیں۔ مولانا رومؒ نے کہا ہے ؎

آب در غورہ ترش باشد ولیک　　چوں بانگورے رسد شیریں و نیک

باز در خُم او بوَد تلخ و حرام　　در مقامِ سرکگی نعم الدام

ترجمہ:- کچے انگور میں پانی ترش ہوتا ہے۔ وہی پانی پکے انگور میں میٹھا اور لذیذ ہو جاتا ہے۔ وہی پھر انگوری شراب کے اندر کڑوا اور حرام بن جاتا ہے۔ لیکن سرکہ کی شکل میں ایک نعمت ہوتا ہے۔

اس لئے قدرت کے عجائبات کو اور اس کی نیرنگیوں اور حکمتوں کو کون سمجھ سکتا ہے۔ ہم ہر ایک چیز کا اندازہ اپنی محدود عقل سے لگاتے ہیں۔ اور کوئیں کے مینڈک کی طرح جو کچھ ہماری سمجھ میں بیٹھتا ہے۔ اس کو ہی علم کی حد سمجھتے ہیں۔

فرض کیجئے کہ وہ صانعِ مطلق یہ اصول نہ بناتا کہ بارش بادلوں سے ہو۔ اور اگر بارش بادلوں کے بغیر ہی ہو جاتی۔ تو ہم کسی وقت بھی خدشہ سے محفوظ نہ رہ سکتے ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہتا کہ نہ جانے کس وقت آسمان سے پانی کی دھاریں بہنے لگ جائیں۔ لیکن اب یہ قانونِ قدرت ہمارے لئے کتنا اطمینان بخش ہے کہ جب کبھی ہم ابر دیکھیں گے تبھی بارش کے امکانات سمجھیں گے اور اس وقت ہر ایک شے کو بھیگنے سے بچانے کا ضروری تردد کریں گے۔ اگر مختلف چیزوں کے اندر خاص خاص خاصیتیں نہ رکھی جاتیں تو کتنی گڑبڑ ہوتی۔ سنکھیا سمِ قاتل ہے۔ شہد موجبِ شفا ہے۔ تجربہ اور علم کی برکت سے ہم سنکھیئے سے اجتناب کرتے ہیں اور شہد سے رغبت رکھتے ہیں۔ اگر قانونِ قدرت اٹل نہ ہو۔ اور شہد کبھی شفا دینے والی خاصیت رکھے اور کبھی زہر قاتل بن جائے تو کسی چیز کو بھی ہم اطمینان سے استعمال میں نہ لا سکیں۔ پس اُس حکیمِ مطلق نے جو خواص ہر ایک چیز اور جسم کے اندر رکھے ہیں۔ اس سے ہم پر بڑا احسان کیا ہے ان کے بغیر ہماری زندگی بڑے خطرے میں رہتی اور ہمیشہ دغدغہ لگا رہتا۔

ہر ایک چیز کا وجود تسلسل کبھی نہیں چلتا۔ کئی خاندانوں کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے کئی قسم کے جانور اور پرندے جن کا وجود ایک وقت میں تھا۔ اب ختم ہو چکے ہیں کئی درختوں

اور نباتات کا یہی حال ہے اور زمین کی تہ میں ایسے جانوروں کی ہڈی وغیرہ کو دیکھ کر سائینسدان ہم کو ایسا بتاتے ہیں۔ اندریں حالات یہ اعتراض کہ اس کائنات کا سلسلہ ازخود چل رہا ہے۔ بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ خاص کر یہ بات قابلِ غور ہے کہ عناصر جن کی باہمی آمیزش سے کائنات کا تسلسل ظہور میں آتا ہے۔ نہ تو اپنی ذات سے قائم ہیں۔ اور نہ اس کے آئندہ قیام کی طاقت رکھتے ہیں۔ یعنی اُن میں نہ ارادہ ہے نہ استعداد۔ نہ وہ اپنے خواص کو تبدیل کر سکتے ہیں۔ اور نہ کسی خاص حکم کی تعمیل کا انصرام ان سے ہو سکتا ہے۔ مثلاً پانی ایک نشیب میں پڑا ہوا آگے نہیں چل سکتا۔ جب تک کہ اس کو اور زیادہ نشیب کی جگہ نہ ملے۔ آگ بغیر رگڑ کے پیدا نہیں ہوتی اور بغیر ایندھن کے قائم نہیں رہ سکتی۔ اس لئے مادی اشیاء سب مجبور اور ماتحت ہیں۔ انسان ہر ایک مادی شے پر قادر نہیں ہے اس لئے اس سارے سلسلۂ کائنات کو چلانے والا قادرِ مطلق کے سوا اور دوسرا کوئی نہیں ہے ؎

ارادہ سے تیرے قائم ہے ہر اک سلسلہ ورنہ مدبّر جسم کا پھر کون حافظ کون جانوں کا؟

بعض صاحب یہ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ خدا محسوس نہیں ہوتا پھر ہم کیسے جان لیں کہ وہ ہے اس کے متعلق ایک اور باب میں پہلے بھی کچھ عرض ہو چکا ہے کچھ اور بھی سنیئے اول تو ذات باری کے متعلق کسی دنیاوی چیز سے تشبیہہ دیکر موازنہ کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ وہ ایسی بے مثال ذات ہے کہ جس کے کسی وصف کا بھی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ جو بھی مثالیں دی جاتی ہیں۔ وہ صرف ایک حد تک ہی اصل غرض کو پورا کرتی ہیں یہ کہنا کہ جو چیز محسوس نہ ہو وہ وجود ہی نہیں رکھتی ایک بڑی بھاری بھول ہے۔ دنیا کے اندر کئی چیزیں ہیں۔ کہ جن کو حواس نہیں جان سکتے۔ لیکن وہ موجود ہیں۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص عقلمند ہے۔ دانا ہے۔ ذہین ہے اور فلاں شخص جاہل یا بے عقل ہے۔ اگر پوچھا جائے کہ کس چیز سے اس شخص کی عقل کو جانچا گیا کس پیمانہ سے

ان کی عقل کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ تو کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ ان کی عقل کا اندازہ انکے افعال کو دیکھ کر لگایا گیا ہے۔ جو آدمی سوچ وچار کے بعد سلیقے سے پس وپیش کا خیال کر کے کام کرتا ہے اس کو عاقل کہہ دیتے ہیں۔ اور جو شخص اندھا دھند نتیجہ سوچے کے بغیر جلد بازی سے کام لیتا ہے اس کو بیوقوف کہتے ہیں۔ یعنی ان کے افعال ہی ان کی عقل کی کسوٹی ہیں۔ حالانکہ اور کسی طرح سے عقل کا ادراک، تصور میں نہیں آسکتا کیونکہ یہ جسمانی طور پر محسوس نہیں ہو سکتی۔ سوکشم یعنی لطیف ہے۔ اس طرح سے اس ذات پاک کے کاموں کو دیکھ کر اس کی موجودگی کا شک نہیں رہتا۔ چاند اور سورج کو کس نے چمک دی۔ دن کے بعد رات اور رات کے وقت اندھیرا کون کرتا ہے۔ بجلی کے اندر تڑپ۔ چمک اور تیزی کہاں سے آئی۔ بادلوں سے پانی کون برساتا ہے۔ سمندری اور ہوائی مخلوق کو خوراک کون مہیا کرتا ہے۔ انسان کو دیکھیے۔ پلنے اور بڑھنے کی طاقت کس نے دی۔ ننھے سے بیج سے اتنا اتنا درخت کون بناتا ہے۔ ماں کے پیٹ کے اندر بچے کی تشکیل اور خوراک کا انتظام کون کرتا ہے۔ مقناطیس میں کشش اس نے رکھی۔ پسّو اور اس سے بھی کمتر مخلوق کے اندر سانس چلنے اور جان رکھنے کا انتظام کس نے کیا۔ یہ وہی قدرت عالی ہے جو سب کام کرتی ہے۔ اسی نے اناجوں میں غذائیت اور پھلوں میں ذائقہ پیدا کیا۔ اسی نے ہر ایک چیز کے اندر علیحدہ علیحدہ خواص پیدا کیے ہیں اسی نے انسان کو عقل بخشی کہ جس سے وہ حیران کر دینے والے کام کر کے دکھا سکتا ہے ان سب چیزوں میں تصرف کی طاقت اس صانع مطلق کے سوا کس کو ہے وہ اُسی کی انصاف مجسم ذات ہے کہ جس کے سامنے ایک شہنشاہ اور ایک فقیر ایک درجہ رکھتے ہیں۔ ایک ہاتھی اور ایک پسّو مساوی حقوق رکھتے ہیں۔ ایک سی جان سب کو بخشی ہے اور قدرت کی چیزوں کے استعمال کا حق بھی ان سب کو یکساں ہے اُسی کے خوانِ نعمت سے انسان حیوان چرند۔ پرند۔ کیڑے مکوڑے اور دیگر حشرات الارض پل رہے ہیں ؎

تو ہے اجسام کا خالق مربی تو ہے جانوں کا — ترے خوانِ کرم پر جمگھٹا ہے میہمانوں کا

وہ پتھر میں بیٹھے ہوئے کیڑے کی بھی سنبھال رکھتا ہے - وہ علام الغیوب اور قادرِ مطلق ہے - ہر جاندار کا رب اور روزی رساں ہے ؎

رازق کی عنایت میں ہوا شک جو کسی کو — اقرار کیا کیڑے نے پتھر سے نکل کر

بچہ کی پیدائش سے پہلے اس کے لئے خوراک مہیا کی جاتی ہے - اس کا رزق اس کی ماں کی چھاتیوں میں دودھ کی شکل میں پہلے ہی طیار ہو جاتا ہے وہ بچہ جو کئی مہینوں تک کسی چیز کا بھی ہوش نہیں رکھتا - اپنے رزق کا شعور لیکر پیدا ہوتا ہے اور پیدا ہوتے ہی سنبھال لیتا ہے ؎

غم روزی مخور برہم مزن اوراقِ دفتر را — کہ پیش از طفل ایزد پر کند پستانِ مادر را

ترجمہ:- اے انسان اپنی روزی کے لئے پریشان مت ہو اور کھلبلی مت مچا - کیونکہ دیکھ بچے کی پیدائش سے پہلے ہی وہ رازق ماں کی چھاتیوں کو دودھ سے بھر دیتا ہے - تلسی داس جی نے بھی کہا ہے ؎

پہلے رچی پراربدھ پاچھے بنا شریر — تلسی بات اچرج ہے من نہ باندھے دھیر

اس صانعِ ازل کے وجود سے اس جہان کے نقشہ کو اور اس کائنات کے انتظام کو اور اس جہان کی چیزوں کو دیکھنے کے بعد کون منکر ہو سکتا ہے ؎

نظامِ عالم بتا رہا ہے کوئی ہے اس کا بنانے والا — ظہورِ آدم دکھا رہا ہے کہ دل ہے کوئی آنے والا

نسیم مستانہ چل رہی ہے چمن میں پھر رُت بدل رہی ہے

صدا یہ دل سے نکل رہی ہے وہی ہے یہ گل کھلانے والا (اکبر)

ایک شاعر نے ایک نظم میں اس بات کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے ؎

کہا اک سادہ دل نے فکرِ حیرانی سے باز آؤ — کوئی بانی[1] نہیں دنیا کا اس بانی[2] سے باز آؤ

مہیا خود بخود سامان ہوتے ہیں یہاں ہر دم — جو ہوتا کوئی بانی دیکھتے اُسکو کبھی تو ہم!

[1] خالق [2] گفتگو

کہا اُس سادہ دل سے منکرِ فہمی کا کر دفتر نظر آنا ہر اک موجود شے کا شرط ہو کیونکر
کبھی آنکھوں سے تو نے عقل بھی دیکھی ہے اے مضطر کبھی قوت بھی دیکھی ہے مجسّم اندر اور باہر
یہ ہیں لیکن نظر آتی نہیں کیسے اچنبھا ہے مگر کیا اُلٹے ہونے میں ذرا بھی تجھ کو شبہا ہے
پھر اس بانی کے تو ہونے سے منکر ہے خطا پر ہے ترے سر کی قسم ناداں ہے جھوٹے ادعا پر ہے

حیرانی کی بات ہے کہ انسان جو اس ذاتِ مقدس کے متعلق اتنے شکوک کرتا ہے اور اس ذاتِ لطیف کو اپنی کثیف حواس سے نہ پاکر معترض ہوتا ہے۔ اُسے تو اپنے متعلق بھی کوئی علم نہیں۔ اس سے پوچھنا چاہیئے ؎

اس فلسفی کو کہیئے کچھ اپنی بھی ہے خبر جس کو ہزار شک ہیں خدا کی صفات پر

بعض بھائی یہ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ اگر وہ خالق برتر ہر ایک چیز پر قادر ہے تو دنیا میں اتنے دُکھ کیوں ہیں جھگڑے فساد کیوں ہیں۔ وہ سارے جھگڑے کیوں نہیں مٹا دیتا۔ اور ساری خلقت کو کیوں سکھی نہیں کر دیتا۔ یہ اعتراض کوئی وزندار نہیں۔ اس مالکِ کُل نے جملہ اشیا کے اندر خواص رکھ کر اور انسان کو ان کے جاننے کی عقل دیکر اپنے بھلے اور بُرے کی تمیز سکھا کر سُکھ اور دُکھ کا راستہ دکھا دیا ہے۔ اب جو انسان جانتا بوجھتا ہُوا آنکھیں بند کر کے کوئیں میں گرے یا آگ میں ہاتھ ڈالے تو اس میں اُسکا اپنا قصور ہے۔ آگ روٹی پکانے کے بھی کام آتی ہے۔ اور گھروں کو بھی جلا رہی ہے اس کا مفید اور مضر ہونا اس کے استعمال پر منحصر ہے۔ ایسے ہی انسان اپنی عقل کا اچھا یا بُرا استعمال کر کے اپنے لئے آرام یا تکلیف کے سامان پیدا کر سکتا ہے۔

جو کچھ اوپر عرض ہُوا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کائنات کے نظام کو چلانیوالی اور اسکو اصول میں باندھ کر رکھنے والی اور ان میں حسب موقعہ تصرف کرنے والی ایک اعلیٰ طاقت ہے۔ اب یہ سوال ہو سکتا ہے کہ وہ طاقت جس کے ہزاروں کروڑوں نام ہیں کس طرح کی ہے؟ اور اس کو کس طرح سے جانا بھی جا سکتا ہے یہ جتانا کہ

وہ ذات کس قسم کی ہے۔ اس کی صفات کیا کیا ہیں۔ یہ تو ممکن نہیں۔ کیونکہ وہ مالک آپ ہی جانتا ہے کہ وہ کیا ہے۔ یا شاید کچھ کچھ وہ نیک انسان جان سکتے ہیں جنہوں نے اپنا تن من اور دھن سب کچھ قربان کر کے اس کی حقیقت دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔

ان لوگوں میں اکثر تو ایسے ہیں کہ جس وقت وہ نور سے واصل ہوتے ہیں تو چپ لگ لیتے ہیں۔ اور ان پر یہی بات صادق آتی ہے ؎

بھیکھا بات اگم کی کہن سُنن کی نا نہہ جو جانے سو کہے نہیں کہے سو جانے نا نہہ

ترجمہ۔ بھگت بھیکھا جی فرماتے ہیں۔ کہ اس کی ذات بے پایاں ہے کہنے سننے میں نہیں آسکتی۔ جو اس کو جان لیتے ہیں۔ وہ کہتے نہیں اور جو اس کی نسبت کچھ کہتے ہیں وہ درحقیقت جانتے نہیں۔ ایک فارسی شاعر نے کہا ہے ؎

ستانی زبان از رقیبان راز کہ تا راز سلطاں نگویند باز

تاہم بعض بعض جیون مکت انسان (REALIZED SOULS) یعنی ایسی خدا رسیدہ ہستیاں جنہوں نے اس زندگی میں اُس نورِ مطلق کے پرتو کی جھلک دیکھ پائی ہے۔ اس بے نیاز کی نسبت کچھ کچھ کہتے ہیں۔ لیکن وہ اصل حقیقت کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہوتا۔ ساری مذہبی کتابیں اور ساری مقدس ہستیاں آج تک اس کے متعلق کہتی ہی چلی آئی ہیں لیکن ان کا کہنا اب تک ختم نہیں ہوا۔ اور آخر ان کو بھی کہنا پڑا کہ ؎

مقدور کس کو حمدِ خدائے جلیل کا ! اس جا ہے یہ زبانِ دہن گنگ قال و قیل کا

جیسے اوپر عرض ہوا ہے حقیقت میں تو انسان اس ذاتِ برتر کی نسبت کہنے سے بالکل قاصر ہے کیونکہ اس کی عقل، اس کا علم، اس کی طاقت، سب محدود ہیں ؎

کیا طاقت ہے کہ تیرا مدح خواں ہو اے کریم آپ ہی حامد ہے تو اور آپ ہی محمود ہے

جب اس ذات باری کے اوصاف کو خیال کے اندر نہیں لایا جا سکتا تو بیان کس طرح سے ممکن ہے۔ خیال کی دوڑ بھی محدود ہے۔ یہ خیال بھی ایک خاص مقام پر پہنچ کر رہ جاتا

ہے اور وہاں وید مقدس کے الفاظ میں "نیتی نیتی" کہنا پڑتا ہے یعنی "اتنا ہی نہیں" "اتنا ہی نہیں"

تو ہے خیال سے بلند تیرا خیال ہو تو کیا   تیری صفت میں عقل کو لاف کمال ہو تو کیا
تیرا حریم ناز جب اونچا ہو لامکان سے   لاکھ بلند و تیز رو مرغ خیال ہو تو کیا

وید اور اپنشدوں کے اندر یہ بھی لکھا ہے کہ پربھو زبان کی قوت بیان اور ہاتھوں کی طاقت گرفت سے پرے ہے نہ جسم نہ رنگ، نہ آنکھیں رکھتا ہے اور نہ پاؤں۔ ہر زمانہ میں موجود۔ ہر جگہ پر ظاہر۔ ہر مقام پر پہنچنے کی قدرت والا۔ لطیف ترین، غیر فانی اور لاثانی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ہزاروں سروں والا۔ ہزاروں آنکھوں والا۔ ہزاروں کانوں اور پاؤں والا ہے بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا دور سے دور۔ نزدیک سے نزدیک۔ باہر بھی ہے اندر بھی ہے۔ سارے نوروں کا نور ہے۔

قرآن شریف کی سورۃ شوریٰ کے رکوع ۲ میں آیا ہے۔ کہ کسی چیز کو اس سے تشبیہہ نہیں دی جا سکتی۔ سورۃ کہف میں آیا ہے کہ اگر سارے سمندروں کو سیاہی کی شکل میں بدل لیا جائے تو وہ سیاہی ختم ہو جائے گی لیکن اس کی توصیف ختم نہیں ہوگی۔ سورۃ لقمان میں آیا ہے کہ سارے درختوں کو اگر قلم بنایا جاوے اور سارے سمندروں کو سیاہی۔ تو یہ سب ختم ہو جائیں گے۔ لیکن ربّ تعالےٰ کی تعریف ختم نہ ہوگی پھر سورت بقر رکوع نمبر ۳۴ کی آیت کرسی میں آیا ہے۔ کہ وہ ہمیشہ رہنے والا۔ اور ہمیشہ قائم ہے۔ نیند یا اونگھ اس کے نزدیک نہیں پھٹکتے۔ کوئی سفارش اس کے سامنے نہیں چلتی۔ جو کچھ ہمارے آگے پیچھے ہے اسکو وہ جانتا ہے۔ سورۃ حدید میں آیا ہے کہ وہی اول ہے وہی آخر ہے وہی ظاہر ہے وہی باطن ہے وغیرہ وغیرہ۔

وید اور اپنشدوں کی طرح گورو گرنتھ صاحب میں بھی لکھا ہے:۔

سورٹھ محلہ پہلا

الکھ اپار اگم اگوچر نہ تس کال نہ کرما!
جاتی اجاتی اجونی سمبھو نہ تس بھاؤ نہ بھرما

تبھی تو کہا ہے ؎

تقریر سے وہ نزول بیان سے باہر ادراک سے وہ پرے گمان سے باہر
اندر باہر ہے وہ نہ پیدا نہاں ہے سرحد مکاں و لامکاں سے باہر

اور بھی کہا ہے ؎

تصور تیری ذات کا ہے محال کسے ہے یہ سکت اور کہاں یہ مجال
جو ہوتی مشابہ تیرے کوئی چیز تو کچھ کام کرتی سمجھ یا تمیز!
سمجھ کیا ہے اور کیا سمجھ کی بساط سمندر سے قطرے کو کیا ارتباط

خیال، عقل، اندازہ، بدھی، بچار سب سے کام لیکر یہی کہنا پڑتا ہے ؎

اس ذات کی غایت کو کوئی پا نہیں سکتا کیسا ہے کہاں ہے کوئی بتلا نہیں سکتا
اوجِ نظر اس نور کو دکھلا نہیں سکتا آغوشِ تصور اسے ٹھہرا نہیں سکتا
یہ علم اسی ذات کو ہوگا کہ وہ کیا ہے ہم صرف یہ سمجھے ہیں وہ بے مثل خدا ہے

اگرچہ اس کی ذات کی نسبت کچھ سمجھا یا کہا نہیں جا سکتا تاہم اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ کوئی چیز اور کوئی جگہ اس سے خالی نہیں ؎

خورشید درخشاں میں چمک تیری ہے اور گوہر مرصع میں دمک تیری ہے
ہیں کون و مکاں نور سے تیرے پُر نور ہر ذرۂ تاباں میں چمک تیری ہے

باوصف اس بات کے کہ اس کی نہ کوئی شکل ہے نہ کوئی جسم نہ کوئی رنگ ہے نہ رُوپ وہ ذرّے ذرّے میں کوہ و دشت میں چپّے چپّے میں جلوہ نما ہے ؎

تنہا نہ اُسے اپنے دلِ تنگ سے پہچان ہر باغ میں ہر دشت میں ہر رنگ میں پہچان
بے رنگ میں بارنگ میں نیرنگ میں پہچان منزل میں مقامات میں فرسنگ میں پہچان
نت روم میں اور ہند میں افرنگ میں پہچان ہر راہ میں ہر ساتھ میں ہر سنگ میں پہچان
ہر عزم ارادے میں ہر آہنگ میں پہچان ہر دھوم میں ہر صلح میں ہر جنگ میں پہچان

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

جب وہ مالک ہرجائی ہے۔ ہر جگہ موجود ہے تو اس سے واصل ہونے کے لئے کیا طریقہ ہے؟ کس طرح سے وہ جانا جا سکتا ہے؟ انسان کے پاس مادی اشیاء کی ماہیت کو جاننے کیلئے سب سے بڑا ذریعہ اس کی عقل و دانش یا بدھی ہے لیکن ؎

جب اہلِ ہوش کہتے ہیں افسانہ آپکا — سُن سُن کے مسکراتا ہے دیوانہ آپکا

پھر کیا اس کی ذات کی پہچان زیادہ لکھنے پڑھنے سے یا کافی علم حاصل کرنے سے ہو سکتی ہے۔ دنیا کی باقی چیزوں کی اصلیت تو علم حاصل کرنے سے معلوم ہو جاتی ہے لیکن اس مدعا کو علم بھی پورا نہیں کرتا۔ وہ کہاں تک لے جاتا ہے ؎

علوم دینوی کے بحر میں غوطے لگانے سے
زباں گو صاف ہو جاتی ہے : دل طاہر نہیں ہوتا (اکبر)

بلکہ زیادہ پڑھنا لکھنا اور اس ذاتِ پاک کی پہچان کے لئے زیادہ علم حاصل کرنا بعض دفعہ اُلٹے نتائج پیدا کرتا ہے۔ یعنی ؎

بڑھتا جاتا ہے جس قدر علم بشر — کرتے جاتے ہیں تنگ خیالات ہیں گھر
ہوتی جاتی ہے دھندلی اتنی فضا — جتنی کہ وسیع ہوتی جاتی ہے نظر

تو پھر شاید فلسفہ دان لوگ اپنے فلسفہ کے زور سے اسکو جان سکتے ہیں۔ کیونکہ فلسفہ واقعی بال کی کھال نکالتا ہے بڑی باریکیوں تک لے جاتا ہے بات کی تہ کو پہنچنے کے لئے مدد کرتا ہے تو پھر کیا اس ذات کی پہچان فلسفہ سے ہو سکتی ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ وہ بیچارا ادھر اُدھر ہی بھٹکتا ہے جیسے کہا ہے ؎

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں — ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

دلیل ایک زبردست ہتھیار ہے۔ جو بات اور کسی طرح سے سمجھ میں نہ آئے وہ

دلیل سے سمجھی جا سکتی ہے جس مسئلہ کی تائید میں دلیل پیش کر دیجائے وہ حل ہو جاتا ہے تو کیا دلیل سے اس بھگوان کو جان سکتے ہیں ایسا بھی نہیں کیونکہ ؎

دلیلیں دل میں پیدا نورِ باطن کر نہیں سکتیں
کواکب کی شعاعیں رات کو دن کر نہیں سکتیں

بلا شبہ اس راہ میں نہ تو عقل کام دیتی ہے نہ ہی دلیلیں فلسفے۔ ذہنی اور عقلی پھیلاؤ اس منزل کے ساتھی بنتے ہیں۔ ان سے تو اس ذات باری کو عار ہے۔ جو چالاکی اور ہوشیاری سے اس دربار میں داخل ہونا چاہے۔ وہ دخل نہیں پا سکتا۔ تو پھر وہاں داخلہ کس طرح ہوتا ہے؟ کب وہ ذات علی اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے ؎

سب سے سب باہر ہوئے وہم و خرد ہوش و تمیز
خانۂ دل میں تم آئے ہم نے پردہ کر دیا (اکبر)

جب تک نری عقل سے کام لیا جاتا ہے اس وقت تک اس تجلّی کے سامنے ایک ڈراپ سین رہتا ہے۔ پردہ پڑا رہتا ہے۔ لیکن جس وقت سالک سب سہارے چھوڑ کر کہتا ہے۔ اے میرے مالک میری عقل مجھ کو کام نہیں دیتی۔ عقل نے مجھے پریشان کر دیا۔ دماغ چکرا گیا۔ میں اب عقل و دماغ کا پھیر دسہ چھوڑتا ہوں۔ تو آپ ہی اپنے فضل و کرم سے اس پردے کو ہٹا۔ تب کیا ہوتا ہے ؎

چشم خرد سے عار تھا حُسنِ حیا پسند کو عقل نے آنکھ بند کی اس نے حجاب اٹھا دیا

اس بازار کا، اس منڈی کا۔ اس منزل کا اصول ہی مختلف ہے جہاں دنیا کے اندر زیادہ عقلمند آدمی زیادہ کامیاب ہوتا ہے وہاں اس راہ پر کیا حال ہے ؎

دیوانہ ہے اس راہ میں جو دیوانہ نہیں ہے عاقل وہی ہوتا ہے جو عاقل نہیں ہوتا

اس ذات لطیف کی دید سے بہرہ ور ہونے کیلئے پہلے تو ہوشیاری کو چھوڑنا

ہوگا پھر وہ نظر پیدا کرنی ہوگی۔ وہ بصیرت حاصل کرنی ہوگی جس سے اس نور کی جھلک دیکھی جا سکے ؎

جہاں جلوے سے اس محبوب کے یکسر لبالب ہے
نظر پیدا تو کر اوّل تماشا دیکھ "قدرت" کا

ہم اس ذات باری سے دور نہیں۔ وہ ذات ہم سے دور نہیں۔ تعارف کی ضرورت ہے۔ تعارف کے لیے خواہشِ صادق کی ضرورت ہے ؎

اگر ہے دید کی خواہش نگاہِ شوق پیدا کر
نہ تو باہر ہے عالم سے نہ وہ بیرون ہے دنیا سے

وہ آنکھ کہ جس سے اس ذات کے جلوے دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ باہر والی نہیں۔ وہ تو باطن میں ہے۔ باہر کی آنکھیں دنیاوی چیزوں میں لگائے رکھنے سے باطن کی آنکھ وا نہیں ہوتی۔ ان باہر کی آنکھوں کو دنیا کی طرف سے ہٹانا ہوگا پھر چشم بصیرت اپنا وظیفہ خود عمل میں لائے گی ؎

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی   ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

باطن کی آنکھ کو کھولنے کے لئے سب سے پہلے یہ لازمی ہے کہ انسان خودی سے پاک ہو۔ جب تک وہ اپنے آپ کو دیکھتا رہے گا۔ تب تک باطن کی آنکھ کو بند رہے گی۔ اس میں اندر دیکھنے کی صلاحیت پیدا نہ ہوگی۔ وہ اس قابل نہ ہوگی کہ "تجلی" کو دیکھ سکے ؎

ملا ہے ہم کو یہ مضمون کسی کی چشم بینا سے
کہ چھوڑی جس نے خود بینی اسے سب کچھ نظر آیا

اس کے بعد ایک اور زبردست پٹی اس آنکھ پر رہ جاتی ہے۔ اور جب تک وہ نہ اترے چشم باطن وا نہیں ہوتی۔ وہ پٹی ہے غیریت کی۔ دوئی کی۔ یہ پٹی

ایسی مضبوط اور سیاہ رنگ کی ہے کہ اس میں سے تو اس نور کی ایک شعاع بھی داخل نہیں ہو سکتی جب تک یہ پردہ علیحدہ نہ کیا جائے تب تک دیدار ناممکن ہے ؎

خوب ڈھونڈا خوب دیکھا کچھ نظر آیا نہیں　　　آج تک اپنے میں ہم نے آپ کو پایا نہیں
چشم ظاہر بیں سے تو دیکھا نہیں جاتا ہے یار　　　تم نے بھی اے دل کی آنکھو اسکو دکھلایا نہیں
ہو میسر کیونکہ اس پردہ نشیں کا دیکھنا　　　ہے جو پردہ درمیاں وہ اس نے اٹھوایا نہیں

بھائی یہ بات تو پتھر کی لکیر سمجھو۔ سوال آپ نے ٹھیک اور سو فیصدی درست کہ جب تک غیریت دل میں رہے گی جب تک ہندو مسلمان سکھ عیسائی کا خیال دل کے اندر قائم رہے گا۔ جب تک کافر اور ملیچھ کا بھاو دل میں بیٹھا رہے گا۔ جلوۂ الٰہی کا دیکھنا ناممکن! ناممکن!! سراسر ناممکن!!! ایک زندگی میں کیا لاکھوں زندگیوں میں ناممکن ہے

چشم حق بیں کو جہاں میں کفر سے کیا کام ہے
ہر صنم خانہ نظر میں کعبۂ اسلام ہے　　　(برق)

ہاں ان غیریت کے خیالات کو دل میں مضبوط کرنے سے اور ان کو عمل میں لانے سے شاید سرکاری نوکریاں کچھ زیادہ مل جائیں۔ کونسل اور کمیٹی کے اندر ایک آدھ ممبری اور حاصل ہو جائے۔ یا چند ٹکڑے روٹی کے زیادہ ہاتھ آجائیں۔ لیکن مالک کی دید؟ توبہ توبہ!! نورِ الٰہی کی جھلک تو ان خیالات کے آتے ہی کوسوں دور جا پڑتی ہے۔

یہ دو تو متضاد باتیں ہیں۔ ان میں بُعد المشرقین ہے یہ ضدین ہیں ؎

دُور کر دل کی کدورت محو ہو دیدار میں　　　آئینہ کو بس صفائی نے دکھایا رُوئے دوست

دل کے اندر ایسی صفائی ہونی چاہیئے کہ اس میں دُوئی کی میل ذرا بھی نہ رہے۔ یعنی ہر ایک انسان کے اندر اسی مالک کا جلوہ نظر آئے۔ غیریت کا نام و نشان نہ رہے۔ آئینہ دل کے اوپر دوئی کا ذرا سا بھی زنگ نہ رہ جائے۔ کیونکہ ؎

جمع ہیں افشارِ عالم ایک ہیں　　　شکل کے سب اور ان برہم ایک ہیں

ہو وے کب حدت میں کثرت سے خلق   جسم دو جاں گو دو ہیں پر ہم ایک ہیں
مالک نے تو ایک ہی شبد سے ایک ہی "کن" کے کہنے سے سب کو پیدا کیا ہے
ہم اپنی جہالت سے یا خود غرضی سے خواہ کسی قسم کی تمیزیں کھڑی کر لیں سے
جب دونوں کی خلقت ہوئی اک کُن کی صدا پر
پھر شیخ میں کیا ہے جو برہمن میں نہیں ہے؟   (احمد)

جب یہ دُوئی اور غیریت کی پٹی بالکل اُتار کر علیحدہ پھینک دی جائے۔ اور اپنے دل کو چشمۂ محبت بنا لیا جائے۔ تب ہم اُس ذات پاک کے دیدار کے اہل بن سکتے ہیں جسکا نام رحمان یعنی رحیم مطلق اور محبت جاوید۔ جب اس طور سے تیاری ہو گئی۔ یعنی زمین طیار ہو گئی۔ تو پھر مزید تردّد کی ضرورت ہے۔ ایسے وسائل اختیار کرنے چاہئیں۔ کہ جن سے وصالِ باری حاصل ہو سکے۔ اس کے متعلق جو کچھ کتب مقدسہ میں پڑھا ہے۔ اور پاک ہستیوں سے سُنا ہے وہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ اس تجلّی کے دیدار حاصل کرنے کے لئے کوئی مقررہ شاہراہ نہیں۔ نہ کوئی مخصوص سڑک ہے کہ جس کی نسبت یہ کہا جائے کہ اُسی راستہ یا سڑک پر چلنے سے ہی اس منزلِ مقصود تک رسائی ہو سکتی ہے۔ جو کچھ دل کے متعلق اوپر عرض ہوا۔ اگر وہ حالت حاصل ہو جائے۔ تو اس کے بعد مالکِ برتر خود ہی اپنے وصال کی راہ دکھاتا ہے۔ یعنی انسان کا اپنا آئینہ دل اگر صاف ہو جائے تو وہ خود بخود رہبری کرتا ہے۔

اکثر لوگ اس بات کے شاکی ہوتے ہیں کہ مدّتیں گذر گئیں۔ نماز پڑھتے، پُوجا اور سندھیا باقاعدہ کرتے۔ مالک کی اُستتی یعنی حمد و ثنا کرتے۔ دُعا اور پرارتھنا کرتے۔ لیکن پھر بھی طمانیت قلبی حاصل نہیں ہوئی۔ جو مردانِ خدا اس راہ پر گامزن ہوتے ہیں۔ وہ وثوق سے فرماتے ہیں۔ کہ یہ ناممکن ہے۔ کہ

نماز یا پُوجا ٹھیک طور پر ادا کی جائے اور اس دیا تو مالک کے دربار میں عرضداشت درست طور پر کی جائے۔ اور پھر وہ نتیجہ خیز ثابت نہ ہو۔ وہ فرماتے ہیں کہ اصل میں مقصود دنیاوی مفاد ہوتا ہے۔ ہماری پُوجا یا نماز حقیقی نہیں ہوتی۔ اس سے دنیاوی خواہشیں پوری کرنی مطلوب ہوتی ہیں۔ ایک مثال سنیئے:۔

حکایت۔ ایک صاحب استطاعت آدمی نے تین شخص ملازم رکھے اور انکو خاص کام سپرد کیا۔ ان میں سے ایک نوکر تو صبح اُٹھتے ہی اپنے آرام و آسائش کی پروا نہ کرتا ہُوا اُس کام میں لگ جاتا۔ مالک کے آنے سے پیشتر سب کام درست کر لیتا اور مالک کے آنے پر نہایت عزت سے پیش آتا۔ اور اس کی ہر طرح سے خدمت بجا لاتا۔ دوسرا نوکر کام تو سب ٹھیک ٹھاک کر دیتا۔ اسمیں کسی قسم کی کمی نہ رہنے دیتا لیکن مالک کے آنے پر اس کی خاص پرواہ نہ کرتا۔ اُسے صرف یہی خیال رہتا کہ میرا فرض کام کو ٹھیک طور کرنا ہے نہ کہ مالک کی بیجا خوشامد کرنا۔ تیسرا آدمی مالک کے بتائے ہوئے کام کی طرف دھیان بھی نہ دیتا۔ لیکن جب مالک وہاں پہنچتا۔ تو اس کی بڑائی کرنا شروع کر دیتا۔ کہ آپ حاتم ثانی ہیں۔ آپ راجہ ہرش چندر ہیں۔ آپ کی دھاک سارے زمانہ میں بیٹھ گئی ہے۔ آپ کا کوئی ہمسر نہیں۔ مالک قدرتی طور پر پہلے آدمی کو بہت زیادہ پسند کرتا تھا۔ دوسرے کو اس سے کم اور تیسرے کو محض خوشامدی ٹٹو اور باتونی آدمی سمجھتا تھا۔

ہماری پُوجا یا نماز عام طور پر تیسرے ملازم کی سی ہوتی ہے ہم محض مالک کی حمد و ثنا کرتے ہیں لیکن اس کے سپرد کئے ہوئے کام کی طرف توجہ نہیں دیتے دونو عمل اگر ساتھ ساتھ ہوں تو مالک کی پُوری پُوری خوشنودی حاصل ہو سکتی ہے۔ تبھی سچی راحت مل سکتی ہے۔ ہماری آستِک، ہماری پرارتھنا اور ہماری پوجا وسندھیا کے نتائج اسی وقت ہی ہماری خواہش کے مطابق حاصل ہو سکتے ہیں جب ہم ساتھ ساتھ

اپنے مالک کے احکام کی بھی پابندی پوری تعمیل کر کے اس کی خوشنودی حاصل کریں ؎

ہمیں لازم ہے سچے صانع برحق کے قائل ہوں
رضا جوئی میں اس کی جان سے اور دل سے مائل ہوں

کوئی پوجا پاٹ نماز نیک نتائج پیدا نہیں کر سکتی - اگر دل میں غیریت ہے - یا دل میں نفرت کا جذبہ موجود ہے - یعنی جب تک ہر ایک انسان کو ایک ہی خالق کی مخلوق سمجھ کر اسکو محبت اور الفت کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے اور بغیر تمیز ذات و ملت کے ہر ایک انسان کی خدمت کیلئے دل نہ اٹھے تب تک سب پوجا اور نماز اکارت جائیگی -

وصالِ یاری کی منزل مشکل سے مشکل بھی ہے اور آسان سے آسان بھی جلوہ الہیٰ کا نظارہ دُور سے دُور بھی ہے اور نزدیک سے نزدیک بھی مشکل اور دُور تو اُن لوگوں کیلئے ہے جو اپنے دل میں انسان اور انسان کے درمیان فرق سمجھتے ہیں - اور بعض شریعتوں کے اختلاف کی وجہ سے ایک انسان سے رغبت اور دوسرے سے نفرت رکھتے ہیں - آسان اور نزدیک اُن کے لئے ہے - کہ جن کا دل محبت کا چشمہ بن گیا ہے اور اس میں سے پریم کی دھاریں نکل کر مالکِ کل کے ہر ایک بندے پر پڑتی ہیں - خواہ وہ ہندو ہے یا مسلمان بھنگی ہے یا چمار مشرقی ہے یا مغربی - کوئی بھی طریقہ کوئی بھی سادھن کوئی بھی سمادھی یا مراقبہ اس مالک کی دید کیلئے مفید ثابت ہو سکتا ہے لیکن ابتدائی شرط صفائے قلب اور دُوئی کا دُور کرنا ہے - سب سے پہلے دل کو گناہ اور نفرت سے پاک کرنا چاہیئے - اس مالکِ برتر کی رضا مندی حاصل کرنے کے لئے سب سے زیادہ ضرورت اخلاص و ارادت اور صدق نیت کی ہے - مالکِ علیٰ کی رضا یہ ہے - کہ ہم جھوٹ نہ بولیں - جھوٹے معاملات نہ کریں - ہر ایک انسان کو اپنا بھائی سمجھیں کسی دوسرے کے حقوق پر چھاپہ مارنے کی کوشش نہ کریں کسی کو نقصان نہ پہنچائیں - کسی کی دل آزاری نہ کریں - جھگڑے نہ خریدیں - شرارت سے باز رہیں

اگر ان تمام احکام کی پیروی ہم ٹھیک طور پر کریں۔ تو ہمارے اپنے معاملات بھی درست طور پر چلتے رہیں۔ اور ہماری پوجا اور نماز بھی ہمارے لئے سودمند ثابت ہو۔ اور اس طرح سے ہم اپنے مالک کی خوشنودی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں جب مالک اس طرح سے خوش ہوتا ہے۔ تو اپنی کریمی صفات سے اپنے تک رسائی کے وسائل خود بخود اپنے بندے کے دل میں ڈال دیتا ہے۔ لیکن اول صفائیے قلب لازمی شرط ہے ؎

ہے اگر شوقِ جمال اس کا تو اس کو صاف کر
یہ جو ہے دل کا پُر از زنگِ کدورت آئینہ

دل سے غیریت اور نفرت کی کدورت ہٹ جانے پر اس مالک کی دید کا عکس ہر طرف پڑنے لگتا ہے ؎

ہر سمت سے ہو سایہ فگن یار کی صورت آئینۂ خاطر میں اگر کچھ بھی جلا ہو

وہ مالکِ علیٰ تو اپنے سچے بندوں سے وصال کرنے کے لئے بیتاب رہتا ہے۔ اس کا بندہ اگر صدقِ دلی اور خلوص سے ایک قدم بھی اس کے ملنے کیلئے اُٹھاتا ہے تو مالک دس قدم آگے بڑھتا ہے لیکن کمی اور خامی اپنے ہی اندر ہے ؎

تیرے کرم میں نہیں کچھ کمی کریم ہے تو مرا قصور ہے جھوٹا امیدوار ہوں میں

تو بس اس بات کو اچھی طرح سے ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔ کہ دعا اور نماز پوجا اور پرارتھنا کے ساتھ ساتھ دوسری شرط بھی لازمی ہے۔ کہ جس کا اوپر ذکر ہوا ہے یعنی صفائیے قلب اور غیریت کا دور کرنا اولاً ضروری ہیں۔ بعض اصحاب صرف اس بات کے قائل ہوتے ہیں۔ کہ ؎

ہوئی ہیں کشوریں مفتوح خاصوں کی دعاؤں سے
اُلٹ جاتے ہیں تختے اولیاؤں کی دعاؤں سے

دُعا حقیقت میں ایسی ہی طاقت رکھتی ہے۔ دعا کی چھپی ہوئی طاقت بے اندازہ ہے۔ دعا کے اثرات وہم وگمان میں بھی نہیں آ سکتے۔ سچے دل سے نکلی ہوئی دعا کیا کچھ نہیں کر سکتی۔ کون سی آفت نہیں ٹال سکتی۔ کونسی مصیبت رفع نہیں کر سکتی۔ کون سے رنج و آلام کا دارُو نہیں بنتی۔ کون سی دولت کے لئے اکسیر کا کام نہیں دیتی - اور کونسا مقصد اس کے احاطہ سے باہر ہے۔ لیکن دعا اسی وقت اثر پذیر ہوتی ہے۔ کہ جب یہ مقولہ بھی ہمارے پیش نظر رہے ؎

ہمیشہ جانچتے رہنا کہیں ناحق نہ ہو جائے   دل دانا ہوس کے رنگ میں احمق نہ ہو جائے

یہ دیکھنے کے لئے کہ کس حد تک دل کے آئینے کی کدورت صاف ہو چکی ہے اور کہاں تک وہ جلوۂ الہی کو دکھانے کیلئے تیار ہو چکا ہے۔ تمثیل ذیل سے واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک اہلکار ترقی سے محروم کیا گیا ہے اُس سے وجہ دریافت کرنے پر وہ اپنے دل کی حالت کے مطابق مفصلہ ذیل جوابات میں سے کوئی ایک جواب دے گا۔

۱۔ آجکل فرقہ دارانہ رَو جاری ہے۔ مخالف فرقہ کے لوگ ہم لوگوں کو کہاں ترقی لینے کا موقعہ دیتے ہیں۔ وہ تو سب کچھ اپنوں کو دیتے ہیں۔

۲۔ ان دنوں آپا دھاپی کا معاملہ ہے۔ لوگ اپنی اپنی پارٹی والوں کی مدد کرتے ہیں۔ اور ہم جیسے آدمی پیچھے پھینکے جاتے ہیں۔

۳۔ یہ زمانہ سفارشوں کا ہے جس کی سفارش چل گئی۔ وہ آگے ہو گیا جسکی کوئی سفارش نہیں۔ اس کو کس نے پرسد کہ بھیا کون ہو؟

۴۔ بھائی قسمت کا پھیر ہے۔ حق تو میرا ہے افسر بھی خوش ہیں۔ لیکن قسمت ہی یاوری نہیں کرتی۔ بدقسمتی کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔

۵۔ ترقی وغیرہ کے معاملات مالک کے ہاتھ میں ہیں۔ رنج و راحت وہی دیتا ہے

مجھے بھی ترقی دیدے تو اس کے خزانہ میں کوئی کمی تو نہیں آتی۔ لیکن شاید مولی کریم مجھ کو اس لائق نہیں سمجھا۔

٦۔ مالک برتر میری بہتری کو بہتر جانتا ہے۔ ترقی نہ ہونے میں میری بھلائی ہے اسی لئے مجھکو ترقی نہیں دی گئی۔ ترقی ہونے میں ضرور میرا نقصان ہوگا۔ اس لئے مالک نے مجھے اسی جگہ رکھا ہے۔ یقیناً میری بھلائی ترقی کے نہ ہونے میں ہے۔

٧۔ میرا فرض ہے اپنے فرائض کو احسن طور سے سرانجام دینا۔ نتیجہ کی فکر مجھ کو نہیں وہ میرے مالک کو ہے ؎

فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما کارسازِ ما بفکرِ کارِ ما

٨۔ سب ہستیوں کے اندر ہی تو میرے مالک کا جلوہ رونق افروز ہو رہا ہے جسکو بھی ترقی ملی ہے اسکے اندر بھی وہی میرا مالک ہے اسکی ترقی سے میں کم خوش نہیں ہوں میرے کسی بھی بھائی کی ترقی ہونا میرے ترقی یاب ہونے کے مترادف ہے۔

یہ انسانی قلب کی حالت درجہ وار بیان ہوئی ہے جس شخص کا آخری جواب ہوتا ہے اور صدق دلی سے ہوتا ہے اور اس میں دکھاوے یا مایوسی یا بناوٹ کی شمولیت بھی نہیں ہوتی۔ اس شخص کا دل تجلی کے دیدار حاصل کرنے کیلئے تیار ہو چکا ہے۔ اور دیگر جوابات دینے والے بھائیوں کا دل عین اسی تناسب سے قابل اصلاح ہوتا ہے جس سلسلے میں جوابات عرض ہوئے ہیں۔

جو لوگ دیدارِ حق کے شائق ہیں ان کے لئے دنیاوی چیزوں کی طلب تو بہت ہی گھٹیا چیز ہے۔ بلکہ جنت اور سورگ کا طالب ہونا بھی کوئی اعلیٰ مقصد نہیں۔ کیونکہ کہا ہے ؎

دنیا طلبا چہ گویند رنجوری عقبیٰ طلبا چہ گویند مزدوری

مولا طلبا کہ داغ مولا داری در ہر جہاں مظفر و منصوری

طالب دنیا کو سگ۔ طالب عقبیٰ کو سوداگر اور طالب حق کو مرد کہا گیا ہے۔

طالبِ مولیٰ کی تو اس کے پانے کے لئے اس قدر زبردست خواہش ہونی چاہیئے کہ جیسے داؤ دی نے کہا ہے ؎

عاشق معشوق ہوگیا عشق کہا دے سوئے داؤد اس معشوق کا اللہ عاشق ہے

تلاش حق میں اپنے آپ کو یعنی اپنی خودی کو بالکل بھلا دینا ہوگا۔ اور میں اور میری کے جھوٹے ادعا کا سر قلم کرنا ہوگا۔ اس مالک سے واصل ہونے کے لئے یہ حالت پیدا کرنی ہوگی ؎

تُو کو اتنا مٹا کہ تُو نہ رہے اور تجھ میں دُوئی کی بُو نہ رہے

پھر جب اُس خودی کو دُور کرکے نماز یا پوجا ادا کی جائے گی تو کیا حالت پیدا ہو جائے گی ؎

دیا ہم نے جو اپنی خودی کو مٹا، وہ جو پردہ سا بیچ میں تھا نہ رہا
رہا پردے میں اب نہ وہ پردہ نشیں کوئی دوسرا اسکے سوا نہ رہا

لیکن ایسے حقیقی طالب بہت کم ملتے ہیں۔ فی زمانہ بہت جگہ تو دکھاوا ہے یا اگر خواہش ہے بھی تو بہت کمزور۔ کمزور تو خواہ کسی قسم کی ہو۔ کوئی مفید مطلب پھل نہیں دیتی۔ یہ بات تو نہیں کہ طالبانِ حق کالعدم ہیں۔ لیکن ؎

چاہن ہارے سکھ سمپتی کے جگ میں بلت گھنیرے
کوئی ایک ملت کہوں پرکھی ہنگر وگر سب ہیرے

یعنی دنیاوی آرام و آسائش اور زر و مال کے طالب تو دنیا کے اندر بہتیرے ملتے ہیں۔ لیکن کوئی سچا طالبِ حق کہیں کہیں ملتا ہے۔ ہم نے سارے شہر اور جنگل دیکھ بھال لئے ہیں۔

سچے طالبانِ حق اپنے مقصد کو پانے کی خواہش میں اسقدر محو ہو جاتے ہیں کہ ان کے دل کے اندر صرف وہی خواہش غالب آتی ہے اور اسکے دیدار کے لئے

اس قدر بیقرار ہو جاتے ہیں۔ کہ اس دیدار کا نقشہ ہر وقت دل میں باندھ کر ان کی یہ عالت ہوتی ہے کہ جو ایک ہندی شاعر نے بیان کی ہے ؎

کا ہن جھئے پران نے پران بھئے کا ہن نے
جھیئے میں نہ جانی پرے، کا ہن ہے کہ پران ہے

ترجمہ:۔ جلوۂ الہیٰ نے میرے سانسوں کی شکل اختیار کر لی ہے اور میرے سانس جلوۂ الہیٰ سے مل گئے ہیں۔ میں اب اپنے اندر یہ تمیز نہیں کر سکتا۔ کہ جلوہ الہیٰ موجود ہے یا میرے سانس:۔

"میں" خودی کا دوسرا نام ہے اور "تو" کے اندر بے خودی ہے جس نے اپنی "میں" کو اپنے پیارے پریتم کی "تو" میں ملا دیا۔ خودی کو بیخودی کے اندر ڈبو دیا اسی کو اس آب حیات کے پینے کا موقع ملتا جب تک کچھ خواہش رکھ کر انسان اپنی "میں" کو زندہ رکھتا ہے اسوقت تک اس تجلی کے دیدار سے محروم رہتا ہے۔ ہونا یہ چاہیئے کہ ؎

مجھ میں سما جا اس طرح تن پران کا جو طور ہے
جس میں نہ پھر کوئی کہے میں اور ہوں تو اور ہے

دیدار حق کے مقابلہ میں باقی سب چیزیں پھیکی ہونی چاہئیں۔ بلکہ دوسری چیز کی طرف نگاہ دوڑانا یا ان کو خیال میں لانا ہی گناہ ہو۔ ہم بولیں۔ تو اسی کی بات سنیں تو اسی کی کہانی دیکھیں تو اسی کا جلوہ کسی اور طرف دھیان ہی نہ جائے ؎

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے
کہ ہر شئے میں جلوہ تیرا ہو بہو ہے

ایسی زبردست خواہش پیدا ہونے پر اور باقی دنیا دی اشیاء کی خواہشات اصلا ترک کر کے آئینہ دل کے صاف ہونے پر لازمی طور سے اس مالک کی تجلی کے دیدار ہونگے اور پھر مسرت و راحت کی کوئی حد نہ رہے گی۔ سرور یا دید حاصل ہوگا۔ زندگی کا مقصد

پورا ہوگا۔ اور اس کے بعد کسی اور چیز کی خواہش ہی نہ رہے گی۔ اس وصال کو حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو ذاتِ الٰہی میں غرق کرنا چاہیے۔ ایک مثال سنیئے:۔

حکایت۔ تین پُتلے نہانے کو گئے۔ ان میں سے ایک کھانڈ کا تھا۔ دوسرا کپڑے کا۔ تیسرا پتھر کا۔ تینوں پانی میں داخل ہوگئے۔ کھانڈ والا تو وہیں پانی کے ساتھ ہی مل گیا۔ دوسرا کپڑے کا باہر آیا لیکن کچھ پانی اپنے ساتھ لایا۔ تیسرا پتھر کا ویسے کا ویسا باہر آ گیا۔ جو تھوڑا بہت پانی لگا تھا وہ بھی جھٹ سوکھ گیا۔

طالبانِ حق کو کھانڈ کا پتلا بنکر اس ذاتِ باری کے ساتھ ہی مل جانا ہوگا کپڑے کا بننے میں بھی کچھ کچھ فائدہ ہے لیکن پتھر کا بننے میں محرومی ہی محرومی ہے۔ یہ پتھر کے انسان وہ انسان ہیں۔ جو لذّاتِ دنیا کے پیچھے دوڑنے والے ہیں انکو کوئی جج اثیر تھے۔ کتھا یا وعظ۔ تلاوتِ قرآن یا دید اور گورو بانی کا پاٹھ کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ نہ ہی خشک پوجا، پاٹھ یا سندھیا، نماز کوئی گن کر سکتی ہے؟

دیدارِ حق کے لئے سعی کرنے میں انتظار نہیں کرنا چاہیئے۔ جو آدمی خیال کرے کہ فلاں فلاں دنیاوی باتیں پوری ہوجائیں۔ یا فلاں فلاں کام کر لئے جائیں اپنی بیٹوں کی شادی ہوجائے۔ یا ملازمت سے پنشن مل جائے۔ یا اپنا کاروبار اپنے بیٹوں کے سپرد کر لیا جائے یا عمر بڑی ہوجائے تب مالک کے ملنے کیلئے کوشش کی جائیگی ایسے لوگ غلطی پر ہیں۔ دنیا اور دنیاوی دھندے کبھی ختم نہیں ہوتے ایسے انسانوں کی وہی مثال ہے کہ جو دریا پہ نہانے کے لئے جائیں۔ لیکن اسبات کا انتظار کریں کہ دریا کی لہریں جب ختم ہوجائیں تب اشنان کیا جائے۔ ایسے لوگوں کے نہانے کا وقت کبھی آ ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ نہ کبھی دریا کی لہریں بند ہوں۔ نہ وہ وقت آئے۔ دنیاوی تعلقات تو انسان کی ریاضت میں اس طرح مخل رہتے ہیں جیسے ایک لڑکی کی چوڑیاں ایک لڑکی جس نے چوڑیاں پہنی ہوئی ہوں۔ وہ اگر دھان کوٹنے بیٹھے۔ تو

اُس کی چوڑیوں سے شور متواتر ہوتا رہتا ہے۔ اگر لڑکی اس شور کو بند کرنا چاہتی ہے تو اسے ایک ایک کر کے سب چوڑیوں کو ختم کر کے صرف ایک چوڑی رکھنی پڑیگی اسی طرح سے باقی سب تعلقات سے بالاتر ہو کر اُسی ایک ذات کو ہی سامنے رکھنا پڑیگا۔ دنیاوی لذات سے مکمل طور پر دل اور حواس کو ہٹا لینے سے ہی مقصد براری ہوگی ؎

چشم بند و گوش بند و لب ببند گر نہ بینی نورِ حق بر من بخند

ترجمہ:۔ آنکھ، کان اور زبان کو بند کر۔ پھر تجھے اگر نورِ الٰہی کے دیدار نہ ہوں تو میرا مذاق اڑا۔

جو شخص لذاتِ دنیا میں راحت محسوس کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہی ہے۔ جیسے گرمی میں کوئی پنکھے کے نیچے بیٹھ کر یہ خیال کرے کہ گرمی چلی گئی۔ یا اعضا میں درد ہونے سے افیون کے استعمال سے عارضی آرام پا کر یہ سمجھے کہ جسم کا عارضہ چلا گیا۔ دنیاوی چیزوں میں آرام اور راحت اسی طرح سے عارضی اور معمولی درجے کے ہوتے ہیں مستقل اور حقیقی راحت ذاتِ باری سے واصل ہونے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ سرورِ مطلق یا پورن آنند اسی چشمہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔

جیسے اُوپر عرض ہوا۔ اس ذات سے وصال پانے کے لئے کوئی شاہراہ نہیں ہے۔ جو لوگ اس بات کے مؤید ہیں کہ کوئی خاص ایک ہی راستہ اس منزل پر پہنچنے کا ہے یا ایک ہی طریقہ اس مدعا کے حصول کا ہے وہ بھول پر ہیں۔ ایک ہی شہر کو جانے کے کئی راستے ہوتے ہیں۔ جو شخص اس شہر کے مغرب کی طرف کھڑا ہے وہ مشرق کی طرف چلنے سے ہی وہاں پہنچ سکیگا۔ جو مشرق کی طرف کھڑا ہے وہ بجانب مغرب گامزن ہونے سے ہی ٹھیک مقام پر پہنچے گا۔ اگرچہ ان ہر دو انسانوں کا رُخ متضاد اطراف میں ہے۔ تاہم وہ درست راستے پر چل رہے ہیں اور دونوں ہی منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں گے ایسے ہی جو شخص شہر کے جنوب کی طرف ہے اسے شمال کی جانب

چلنا ہوگا۔ اور شمال والے کو جنوب کی طرف۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔ اب اگر یہ لوگ اپنے اپنے راستے کو درست ثابت کرنے اور دوسرے کی سڑک کو غلط جتلانے کی کوشش کریں۔ تو وہ کس طرح حق بجانب ہوں گے۔ دنیا میں اکثر مذہبی معاملات کے متعلق اسی قسم کی بحث چلتی ہے جس سے مفصلہ ذیل نقصانات ہوتے ہیں۔

۱۔ اپنی راہ کھوٹی ہوتی ہے۔ منزل دُور کی دُور رہ جاتی ہے۔

۲۔ دوسروں کی شریعت میں نقص نکالنے سے عیب بینی کی عادت پڑ جاتی ہے۔

۳۔ اپنی بات کو درست ثابت کرنے کے لئے سخن پروری۔ خودی۔ خودستائی۔ ریا اور جھوٹ کی بدعادت کا شکار رہنا پڑتا ہے۔

۴۔ باہمی نفرت اور غیرت کے جذبات بڑھتے ہیں جس سے دلی سکون چلا جاتا ہے

۵۔ ایک دوسرے کی کتب مقدسہ اور بزرگانِ دین کے لئے احترام کم ہوتا ہے۔

۶۔ لڑائی فساد تک نوبت پہنچ کر دوامی عناد قائم ہو جاتا ہے۔ باہمی نزاع و تکرار رہنے سے زندگی بے لطف اور دغدغہ کی ہو جاتی ہے۔

۷۔ عقلِ سلیم کبھی حاصل نہیں ہوتی۔

۸۔ اس زندگی کا مقصد و مطلب فوت ہو جاتا ہے۔ اور زندگی ایک طور سے تباہ ہو جاتی ہے۔ منشیہ جنم جو بڑی مشکل سے ملتا ہے نشپھل ہو جاتا ہے۔

حقیقت بین لوگ ان تکراروں اور مباحثوں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔ بلکہ چپ چاپ اپنی راہ پر چلے جاتے ہیں۔ اور آخرکار منزل پر پہنچ کر ہی رہتے ہیں۔ لفظی بحث بوجہ کم عقلی اور نامکمل آگاہی کے ایسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ ان اندھوں کی جنہوں نے ایک ہی وقت ایک ہاتھی کو چھوا۔ ایک اندھے نے پاؤں چھوئے ایک نے کان۔ ایک نے سونڈ۔ اور ایک نے دانت۔ ایک نے پشت۔ ہاتھی نکل جانے کے بعد وہ ایک دوسرے سے ہاتھی کا حلیہ بیان کرنے لگے۔ پاؤں چھونے والے نے

کہا کہ وہ ستون جیسا تھا۔ دانت چھونے والے نے کہا کہ لوکدار بھالے جیسا تھا۔ سونڈ چھونے والے نے ضد کی وہ سانپ جیسا تھا۔ کان چھونے والے نے کہا کہ وہ چھاج جیسا تھا۔ پُشت چھونے والے نے اصرار کیا کہ وہ چبوترے جیسا تھا اس بحث میں تکرار ہوگئی۔ اور آخر کار سر پھٹول تک نوبت پہنچی۔ آجکل ہماری بحث پروردگار عالم کے متعلق اسی قسم کی ہے۔ ہمارا نامکمل علم۔ ہماری محدود عقلیں اس مکمل رب العالمین اور ہمانڈ پتی کے جاننے کے نااہل ہیں۔ جو لوگ حقیقتاً اس کے وصال اور اس کے دیدار کے خواہش مند ہیں انہیں اس فضول قیل و قال میں کبھی نہ پڑنا چاہیئے کہ وہ کیا ہے؟ کیسا ہے؟ کہاں ہے؟ ان بے فائدہ باتوں میں اپنا تضیع اوقات ہرگز نہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ یہ جان کر کہ ایک منزل پر پہنچنے کے لئے کئی راستے ہوتے ہیں۔ دوسروں کے راستوں کے متعلق معترض نہ ہو کر، خاموشی سے اور استقلال سے باقاعدگی سے اور خوشی اور امید بھرے دل سے اپنے راستہ پر بغیر ادھر اُدھر دیکھے چلتے رہنا چاہیئے۔ البتہ منزل طے کرتے وقت اگر مفصلہ ذیل امور کا خاص طور پر خیال رکھا جائے تو جلد ہی مقصد براری ہو سکتی ہے :-

۱- مالک کا خیال دل سے کبھی نہ بھولے۔ کھاتے، پیتے، چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ہر وقت دل میں اس کا دھیان رہے۔

۲- مالک کی موجودگی ہر جگہ ہر وقت ہر ایک چیز میں محسوس کی جائے۔

۳- دل کے اندر غیریت کے خیال نہ آنے دئے جائیں۔

۴- اپنی منزل یعنی اپنے پیارے پریتم سے واصل ہونے کا خیال ہمیشہ مدِ نظر رکھا جائے اس خواہش کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے۔

۵- خیالات ہمیشہ پاکیزہ رکھے جائیں۔ سب کا بھلا سوچا جائے۔ سب کے بھلے کیلئے دعا کی جائے اور سب کی بھلائی کے ساتھ اپنی بھلائی وابستہ سمجھی جائے۔

۶۔ کوئی خیال یا کلام یا کام ایسا نہ ہو۔ کہ جو مالکِ کل کی ناراضگی کا باعث ہو۔
۷۔ نیک اور پاک دل انسانوں کی صحبت اختیار کی جائے۔
۸۔ سب انسانوں کو محبت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ بلکہ ہر ذی روح کو پریم درشٹی سے دیکھا جائے۔ غریبوں اور مصیبت زدہ انسانوں کے ساتھ ہمدردی کی جائے اور انکی مدد کی جائے۔ خدمتِ خلق کا شیوہ اختیار کیا جائے۔
۹۔ دنیا اور دنیاوی چیزوں سے زیادہ جی لگانے کے نقصانات پر ہمیشہ غور کیا جائے۔ کیونکہ دنیاوی تعلقات کو بڑھانا کانٹوں میں الجھنے کے مترادف ہے۔
۱۰۔ حقیقی راحت دنیاوی چیزوں میں نہیں ہے بلکہ حقیقی راحت کا چشمہ وہ پربھو پرماتما ہی ہے۔ یہ بات پختہ طور پر ذہن نشین کر لی جائے اور اس یقین میں کمی نہ آئے۔
۱۱۔ موت یقینی ہے اور نہ جانے کس وقت آجائے۔ یہ خیال دل سے نہ بھلایا جائے اس لئے جلد سے جلد نکو کاری اور ذکرِ باری کا توشہ اکٹھا کرنے کی کوشش جاری رکھی جائے۔ یہاں سے کوچ کی طیاری مکمل رکھی جائے۔
۱۲۔ اخلاق اور روحانیت کو اونچا کرنے والی کتابوں کا مطالعہ رکھا جائے۔
۱۳۔ غرور اور غصہ سے پرہیز کیا جائے۔ اگر کوئی چیز دوسروں کی نسبت اچھی یا زیادہ ملی ہے۔ تو اس کے لئے مالک کا فضل جان کر اس کا شکر منایا جائے۔
۱۴۔ قناعت سے دل کو پُر کیا جائے۔ لالچ سے کسی کا حق چھیننے یا حرام مال حاصل کرنے کا خیال تک بھی نہ کیا جائے کسی دوسرے کو اگر بہتر یا زیادہ چیز ملی ہے تو اس کے لئے حسد یا کینہ نہ کیا جائے۔ بلکہ اس شخص کو مالک کی زیادہ پسندیدہ ہستی سمجھ کر اس کے لئے زیادہ عزت اور وقار کا بھاو رکھا جائے۔
۱۵۔ راستی پر ثابت قدم رہ کر رہا اور جھوٹ سے پرہیز کیا جائے۔
۱۶۔ عفو اور رحم کے نیک جذبات دل میں پیدا کئے جائیں۔

۱۷۔ کسی کو درشت کلامی یا دلآزاری سے دُکھ نہ دیا جائے بلکہ خیال سے بھی بُرائی نہ سوچی جائے۔ بدخیالی سارے عیبوں کی جڑ ہے اس سے پرہیز لازمی ہے۔

۱۸۔ غیبت، بدگوئی یا بُرے الفاظ نہ سُنے جائیں۔ نہ ہی زبان سے کہے جائیں۔

۱۹۔ اپنی زبان پر قابو رکھا جائے زبان سے کوئی جھوٹا، سخت یا کڑوا کلام نہ بولا جائے بلکہ شیریں کلامی سے کام لیا جائے۔ زبان کی مٹھاس نعمت خدا ہے۔

۲۰۔ چلتے وقت حتی الوسع نظر نیچی رکھی جائے۔ اور آنکھوں پر اور خیال پر قابو رکھا جائے اگر کسی بُری طرف اتفاقاً نظر اُٹھ بھی جائے تو دوبارہ اس طرف نہ جا سکے۔

۲۱۔ ہر ایک انسان کی خوبی کی طرف ہی دیکھا جائے۔ اس کے عیبوں پر ہرگز نگاہ نہ ڈالی جائے۔ عیب بینی سے دل ناپاک اور غلیظ ہو جاتا ہے۔

۲۲۔ زیادہ ہجوموں، میلوں اور سوسائیٹیوں میں شامل ہونے سے پرہیز کیا جائے وہاں اکثر دلی انتشار پیدا ہوتا ہے۔ بدصحبت ملتی ہے۔

۲۳۔ خوراک صاف ستھری، اندازہ کی اور نیک خیالات کو پیدا کرنے والی کھائی جائے۔ دُودھ، سبزی اور پھلوں کا استعمال زیادہ کیا جائے۔

۲۴۔ اپنی کمائی میں سے مقررہ حصہ نیک کاموں، غریبوں اور یتیموں کی امداد کے لئے خرچ کیا جائے۔ خیرات اور زکوٰۃ لازمی ہے۔ البتہ خیرات دیتے وقت اہل نااہل کا خیال رکھ لیا جائے۔ نااہل کو خیرات دینا بجائے فائدہ کے نقصان کرتا ہے۔

۲۵۔ مذہبی کتابوں کے فرمان اور دیگر بزرگوں کے قول از بر کئے جائیں اور جب کبھی موقعہ ملے ان پر غور کیا جائے۔ گھر کے اندر بھی جا بجا ایسے اقوال لکھ کر گتوں پر چسپاں کر کے آویزاں کئے جائیں۔ تاکہ ہر وقت اُن پر نظر پڑتی رہے۔

اِنسان اور اُس کا دِل

ظرف ناپاک ہے تو اس میں ہے ہر شے ناپاک
دل نہیں صاف تو کیا خاک عبادت ہوگی

انسان کا دل عجوبۂ روزگار ہے۔ اس کی فلاسفی اور اسکا مطالعہ اگر بعید از فہم نہیں تو ازحد پیچیدہ ضرور ہے اس کے اندر متضاد طاقتیں چھپی ہوئی ہیں۔ اگر یہ کمزور ہے تو گیدڑ سے بھی ڈرپوک ہے اور ایک چیونٹی بھی اس پر غالب آجاتی ہے لیکن اگر یہ طاقت کو سنبھال لے تو بڑے بڑے ہاتھیوں اور خونخوار شیروں کو بھی مقابلہ میں پچھاڑ دیتا ہے۔ اس میں لالچ آجائے تو ایک تانبے کے پیسے کے لئے اپنے آقا کو مصیبت میں گرفتار کرا دیتا ہے لیکن اگر اپنی سُدھ بُدھ رہے تو لاکھوں کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ اپنی منزلت سے باخبر نہ ہو۔ تو ذلت کے گڑھے میں گرا دیتا ہے۔ اپنی شکتی سے آگاہ ہو جائے تو آسمان پر چڑھا دیتا ہے۔ غافل رہے تو غلامی کی زنجیروں میں پھنسا دیتا ہے۔ ہوشیار ہو جائے تو تخت شاہی دلا دیتا ہے۔ بے ہمت ہو جائے تو کاسۂ گدائی دے کر در بدر پھراتا ہے۔ سنبھل جائے تو اپنے پاؤں پجواتا ہے۔ ہمت ہار دے تو ناکامی اور نامرادی کے گڑھے میں گراتا ہے۔ ہوش مند ہو تو کامیابی اور ترقی کا باعث بنتا ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ دل کی کمزوری میں نقصان اور دُکھ ہے اور اس کی طاقت میں فائدہ اور سُکھ۔ کبیر صاحب نے اسی لئے کہا ہے کہ ؎

من کے ہارے ہار ہے من کے جیتے جیت!

لہذا یہ بات قابلِ غور ہے کہ کس طرح سے دل کو کمزور نہ ہونے دیا جائے۔ اور اس کی طاقت کو کس طرح بڑھایا جائے۔ تاکہ یہ زندگی کو کامیاب بنا دے۔

دل کا خاصہ ہے کہ جس چیز کی طرف مائل ہوتا ہے اسی کا ہو رہتا ہے۔ بلکہ وہی بن جاتا ہے۔ مثلاً جب دل پر غصہ غالب آجاتا ہے تو یہ آگ کی طرح بھڑک اُٹھتا ہے۔ لیکن جب اس کے اندر سکون ہو۔ تو ٹھنڈے اور میٹھے پانی کی طرح ہوتا ہے۔ جب اس میں نفرت کی عادت جڑ پکڑ لے تو پتھر کا سا سخت اور تلوار کی طرح تیز ہوتا ہے۔ لیکن جب ہمدردی اور اُلفت کے ساتھ میل کرتا ہے۔ تو مکھن کا سا نرم اور پھول کا سا نازک بن جاتا ہے۔ جب یہ عیش و عشرت میں پھنسا تو عیش کا ہی روپ بن جاتا ہے۔ جب عبادت میں لگے تو عبادت کا پتلا بن جاتا ہے۔

اس لئے یہ لازمی ہے کہ اس کے مشغلے ایسے ہوں جو انسان کے لئے مضر نہ ہوں۔ بلکہ مفید ہوں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ حواسِ انسانی کے اندر دل سردار ہے۔ باقی سب حواس اس کے تابع فرمان ہیں جس اندری کے ساتھ یہ لگ جائے وہی اپنا کام کر سکتی ہے۔ باقی بچاری دم بخود رہتی ہیں۔ اور پھر جونسی حس کو یہ اپنا کام کرنے کا حکم دے۔ اُس کی مجال نہیں۔ کہ پس و پیش کرے یا نافرمانی کرے۔ اگر آنکھوں کو حکم کرے کہ فلاں فلاں نظارے کو یا فلاں طرف کو دیکھنا ہے۔ تو وہ چُپ چاپ اسی طرف لگ جاتی ہیں یہی حال کان اور زبان کا بھی ہے قس علیٰ ہذا۔ یعنی باقی حواس کے متعلق اسی طرح سمجھ لیجئے۔ غرضیکہ اس کے ہاتھ میں سارے حواس کی نکیل ہے۔ ان کو جس طرف چاہے لے جا سکتا ہے یعنی اچھی طرف یا بُری طرف۔ اس کا حکم اٹل ہوتا ہے اور سب حسوں کو ماننا پڑتا ہے۔

کچھ آپ ہی گرا کے آپ ہی گھبراتا ہے کہتا ہے کچھ آپ ہی آپ سنتا ہے

اے دردؔ ہمیشہ یہ دلِ دیوانہ کیا کچھ ادھیڑتا ہے کیا بنتا ہے

جیسے فوج کے اندر کمانڈر اگر خوب تجربہ کار۔ تربیت یافتہ۔ جنگ آزمودہ۔ اور موقع شناس ہو تو فوج کا فتحمند ہونا لازمی ہے۔ اسی طرح سے انسان کا دل اگر سدھا ہوا اور تربیت یافتہ ہو۔ تو باقی حواس کو ساتھ لے کر انسان کے لئے کامیابی کا باعث بنتا ہے۔ ورنہ کارزارِ زندگی میں ہزیمت دلاتا ہے اور پسپا کرتا ہے۔ اپنشد کے اندر لکھا ہے کہ جس انسان کا من قابو میں ہو۔ اسکے حواس سدھائے ہوئے گھوڑے کی طرح اس پیکرِ انسانی کے رتھ کو آرام سے لے جاتے ہیں لیکن جہاں دل قابو میں نہ ہو۔ تو شریر گھوڑوں کی طرح حواس اس رتھ کو کسی نشیب یا گڑھے میں جا گراتے ہیں۔ اور اسکو چکنا چور کر دیتے ہیں۔ دل کو حواس کے گھوڑوں کی لگام سے تشبیہ دی گئی ہے جس طرح گھوڑے لگام کے بس ہو کر چلتے ہیں۔ ایسے ہی حواس دل کے تحت ہو کر کام کرتے ہیں۔ اس لئے جو انسان اس لگام کو مضبوطی سے پکڑے رکھتا ہے ڈھیلا نہیں ہونے دیتا۔ وہ دنیا کے اندر بھی آرام پاتا ہے اور اپنی عاقبت بھی سدھار سکتا ہے لیکن جو انسان اس باگ ڈور کو قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ اس کی تباہی اور بربادی میں کوئی شک ہی نہیں۔ بے قابو من جو غضب ڈھاتا ہے۔ وہ بیان سے باہر ہے ؎

اسپ ہو آزاد سرپٹ قید ہو تا ہے سوار   اسپ ہو مطلق عناں حیران رہتا ہے سوار
جانِ من آزاد کرنا چاہتے ہو آپ کو،   کرتے ہو آزاد کیوں پھر آستیں کے سانپ کو

روکنے سے من کے مل جاتی ہے راحت سربسر
وار کر پھینکوں میں اس پر دو جہاں کا مال و زر

ہمارے بزرگوں نے اس حقیقت کو خوب سمجھا ہوا تھا۔ پرانوں میں لکھا آتی ہے کہ ایک دفعہ راجہ پریکشت نے اپنی سلطنت کے تمام پنڈتوں اور ودوانوں کو بلایا۔ کہ کوئی ایسا طریقہ بتاؤ کہ جس سے پانچ منٹ کے اندر عرفان کے راز معلوم ہو جائیں۔ انہوں نے عرض کیا۔ کہ راجن! یہ چیز کچھ آسان نہیں۔ کئی زندگیاں گذر

جاتی ہیں۔ اور پھر بھی وہاں تک رسائی نہیں ہوتی۔ بڑی کڑی تپسیا اور ریاضت کی ضرورت ہے۔ یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ لیکن ان کی ساری دلیلوں کے باوجود راجہ اپنی ضد پر قائم رہا۔ آخر سوامی سُکھ دیو جی تشریف لائے۔ انہوں نے پوچھا۔ کہ نریش آپ کیا چاہتے ہیں مجھ سے بھی ذرا اسکا ذکر کیجیئے شاید میں آپکی مدد کر سکوں؟

راجہ۔ مہاراج میں پانچ منٹ کے اندر گیان حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

سوامی جی۔ تو آپ گیان حاصل کرنے کا عوضانہ دے سکیں گے؟

راجہ۔ میں اپنا راج پاٹ گھر بار حتیٰ کہ اپنی زندگی اس کے عوض دینے کو تیار ہوں۔

سوامی جی۔ آپ تو پانچ منٹ کہتے ہیں۔ ہم ایک منٹ کے اندر آپ کی خواہش پوری کریں گے۔ لیکن جو چیز ہم مانگیں یا دلانی چاہیں ہمیں جلدی دینی ہو گی۔

راجہ۔ منظور۔ جو کچھ میرے پاس ہے وہ حاضر کرنے کو تیار ہوں۔

سوامی جی۔ سوچ لو۔ غور کر لو۔ پھر اگر نہ دے سکے تو جھوٹے ٹھہرو گے۔

راجہ۔ میں نے خوب سوچ لیا ہے اچھی طرح سے وچار کر لیا ہے۔ میں ہر ایک قربانی کے لئے تیار ہوں۔ آپ میری خواہش پوری کریں۔

سوامی جی۔ اچھا تو طیار ہو جاؤ۔ ہم وہ چیز مانگنے لگے ہیں۔ خبردار!

راجہ۔ ہاں فرمایئے۔ لیکن وہ چیز میرے پاس ہونی چاہیئے۔ اور مجھے گیان بھی ساتھ ہی ساتھ ملنا چاہیئے۔ اس میں دیر نہ لگے دونوں باتیں ایک ساتھ ہوں۔

سوامی جی۔ بیشک وہ چیز تمہارے پاس ہے اور جونہی اسے حوالہ کرو گے گیان کی گنگا میں ڈبکیاں لگاؤ گے۔ یہ ہم وعدہ کرتے ہیں۔

راجہ۔ بس ٹھیک ہے فرمایئے۔ میں نے کیا چیز حاضر خدمت کرنی ہے۔؟

سوامی جی۔ راجہ سُنو! وہ چیز تمہارے پاس اسوقت موجود ہے۔ جونہی ہم مانگیں اور جس کے حوالہ کرنا چاہیں بغیر تامل دے ڈالنا۔ ورنہ معاہدہ منسوخ۔

راجہ بخوف حیرانی اور خوشی کے ملے جلے خیالات کے اندر مستغرق ہے۔ خوف اس لئے کہ نہ معلوم کیا مانگا جائے گا۔ حیرانی اس لئے کہ وہ کونسی ایسی قیمتی شے ہے کہ جو میرے پاس اس وقت موجود ہے اور خوشی اس لئے کہ گیان کی پراپتی ہوگی) ہاں مہاراج ٹھیک ہے اب جلدی کیجئے۔ میرا یہ شوق اتنا بڑھ گیا ہے کہ مزید انتظار ممکن نہیں۔

سوامی جی۔ اے راجن خبردار! اپنا دل اُس پرم پتا پرماتما کے حوالہ کر دو اس لمحہ کے بعد کوئی خیال اپنی طرف سے نہ اُٹھانا۔ کوئی کام اس دل سے نہ لینا اس سیکنڈ کے بعد تمہارا دل تمہارا نہیں۔ یہ اسی مالک پربھو کا ہے۔ مالک جو کام اس سے لینا چاہے لے۔ تم ہرگز اسے اپنے کام میں نہ لانا۔ بلکہ اپنا ہی نہ سمجھنا۔

راجہ نے ویسا ہی کیا۔ اور اسکی دلی مراد بر آئی۔ یہ کتھا ہے لیکن حقیقت پر مبنی ہے۔ بھگوان کرشن نے گیتا کے نویں ادھیائے میں فرمایا ہے :-

"اے انسان! اپنا دل مجھ میں لگا۔ میرا ہی بھگت بن۔ میری ہی پوجا کر۔ مجھ کو نمسکار یا سجدہ کر۔ اس طرح سے اپنے آپ کو میرا سہارا لے کر میری طرف لگا کر تو مجھ سے ہی واصل ہو جائیگا۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں" اسی لئے کہا ہے ؎

نشاں پاتے ہیں پہلے جو نشاں اپنا مٹاتے ہیں
خود اپنا ناش کر کے بیج پھر کھِل پھول پاتے ہیں

دل کی یکسوئی میں۔ دل کو قابو کرنے میں ہی ساری کامیابی کا راز ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا۔ کہ جس کام کی طرف دل مائل نہ ہو۔ وہ سرانجام پائے۔ عبادت اور ریاضت بھی تبھی بار آور ہو سکتی ہے۔ جب دل کو یکسوئی حاصل ہو جائے ورنہ اگر دل ہی دوسری جانب راغب رہتا ہے تو نیک نتائج حاصل نہیں ہوتے ؎

برزباں تسبیح و دل در گاؤ خر   ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

ترجمہ :- زبان سے اللہ اللہ کرنا لیکن دل میں اپنی گائے اور گدھے کے متعلق

خیالات رکھنا کب سود مند ہو سکتا ہے۔

پس دل کو قابو کئے بغیر کوئی بندگی۔ کوئی بھگتی، کوئی ریاضت کسی کام کی نہیں۔ دل پر پہلے اس قدر تسلط جمانا ہوگا کہ وہ بالکل تابع فرمان ہو جائے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ دل مزے اڑائے جہاں چاہے کھل کھیلے اور زندگی بھی کامیاب ہو۔ عاقبت بھی ٹھیک ہو جائے۔ یہ دونوں متضاد باتیں ہیں۔ میل نہیں کھا سکتیں۔ ایک کے ہوتے دوسری کا حاصل کرنا ایسی ہی ہے جیسے ایک نیام میں دو تلواریں رکھنے کی کوشش کرنا۔ یا آگ اور پانی کو یکجا رکھنے کا تردد کرنا ہے۔

خدا خدا بھی کرے اور خودی کا دم بھی بھرے بڑا فریبی ہے، جھوٹا ہے وہ خدائی کا

ہم خرما و ہم ثواب ہو دونوں باتیں بیک وقت نہیں ملتیں ہیں

مزے دنیا کے بھی تم چاہتے ہو دولت دیں بھی

تمہیں تو چاہیئے اے شوخ میٹھا بھی سلونا بھی

اگر دل قابو میں نہ ہو۔ دل پر فتح نہ پائی ہو تو سو نصیحتیں سنو کتنا سنو وعظ سنو مندر جاؤ مسجد جاؤ۔ کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ ریت میں سے تیل نکالنے کی کوشش ہے۔ زندگی کا سارا راز اسی دل پر قابو پانے میں ہے۔

ہم نے اول سے پڑھی ہے یہ کتاب آخر تک ہم سے پوچھے کوئی ہوتی ہے عبادت کیسی!

جبکہ قابو نہیں اپنا دل اپنے ناصح وعظ بھی کام نہیں کرتی نصیحت کیسی؟

کہیں بھگوے کپڑے پہن کر سادھو بنے، کہیں کرتے اور کرپان لگا کر سنگھ بنے۔ کہیں سفید پوشش پہن کر گرجے [illegible] کر سید [illegible] کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن اصل حقیقت [illegible] صاحب نے بیان کی ہے

[illegible]

[illegible]

گنگا اور جمنا میں غوطے لگانے سے ہتری امرت سر میں اشنان کرنے سے آب زمزم کے چکھنے سے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر یہ اندر کا بندر ویسے ہی ناچ نچا رہا ہے ؎ نہائے دھوئے کیا بھیا جو من کا میل نہ جائے

مین سدا جل میں رہے دھوئے باس نہ جائے

یعنی اگر من کی میل دور نہ کی جائے۔ تو باہر کے نہانے دہونے سے کیا بنتا ہے۔ جیسے مچھلی ہمیشہ پانی میں رہتی ہے۔ لیکن اس کی لبساند پانی کے ساتھ دہونے سے بھی نہیں جاتی۔ بنتی تو کہا ہے ؎

دل چہ آلودست از حرص و ہوا کے شود مکشوف اسرار خدا

صد تمنا در دلت اے بوالفضول کے کند نور خدا در دل نزول

ترجمہ:۔ جب دل دنیاوی لالچ اور خواہشات سے میلا ہے تو اس میں مالک ازلی کے بھید کیسے ظاہر ہو سکتے ہیں۔ اے نادان! جس وقت تک دل میں سینکڑوں دلی آرزوئیں موجود ہیں اسوقت تک اس نور مطلق کی تجلی دل میں کیسے دخل پا سکتی ہے۔

باہر کی صفائیوں۔ باہر کے بناؤ۔ بیرونی اڈمبر۔ ظاہری بناوٹیں لمبی ڈاڑھی پیشانی کے تلک اور محراب۔ سر پر لمبی چوٹی یا کیس منزل مقصود تک نہیں پہنچا سکتے۔ اگر بناؤ کرنا ہے تو دل کا کرو۔ اگر سنگار کرنا ہے تو اسی کا کرو۔ ورنہ دکھاوے کے سب ڈھونگ لا حاصل ہیں ؎

خانہ دل ہے سیاہ اس کی سیاہی دور کر کیا سفیدی سے عمل کرنا ہے تو اپنا سفید

مالک کل انہی شخصوں سے محبت کرتا ہے جن کے دل صاف ہیں جن کے دل آلودگی سے پاک ہیں۔ قرآن شریف کی سورت توبہ کے رکوع نمبر ۱۳ میں لکھا ہے کہ وہ مالک ارض و سما پاکیزہ دل انسانوں کو پسند کرتا ہے ان سے ہی محبت کرتا ہے وہی اسکے پیارے بننے کا فخر حاصل کر سکتے ہیں۔ پھر مشکوٰۃ میں رسول کریمؐ سے

ایک حدیث ہے کہ پروردگار نہ تو تمہاری صورتوں اور شکلوں کا خیال کریگا۔ نہ تمہارے زر و دولت کا موازنہ لے گا۔ بلکہ اگر وہ دیکھے گا۔ تو تمہارے دلوں کی پڑتال کریگا یا تمہارے اعمال کی سکھمنی صاحب میں آتا ہے۔ کہ

جا کا من ہوئے سگل کی رینا ہر ہر نام تِن گھٹ گھٹ چینا
من اپنے تے بُرا مٹا نا پیکھے سگل سرشٹی ساجنا

ترجمہ:۔ جس کے دل کے اندر سے خودی اور تکبّر دُور ہو کر انکساری آگئی ہے اسے ہر ایک انسان کے اندر اپنے مالک کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ جس نے اپنے دل کی میل اور غیریت کو رفع کر دیا ہے۔ وہ ساری کائنات کو دوست کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس بات کو تو ہر ایک سمجھدار انسان قبول کرتا ہے کہ دل پر قابو پانے کے فوائد بے انداز ہیں۔ لیکن اسکو قابو کیسے کیا جائے۔ بڑی کوشش کی جاتی ہے۔ تب بھی یہ پارے کی طرح کہیں چین سے نہیں ٹھہرتا۔ اس کی تھرتھراہٹ برابر لگی رہتی ہے۔ یہ سوال بلاشبہ بڑا اہم ہے۔ یہی سوال گیتا میں ارجن نے بھگوان کرشن سے کرتے ہوئے کہا تھا۔ کہ اے بھگوان! اس دل کا قابو کرنا ایسا ہی ناممکن ہے۔ جیسے ہوا کو مٹھی میں بند کرنا۔ بھگوان کرشن نے اس سوال کی اہمیت کو مانتے ہوئے فرمایا۔ کہ یہ درست ہے کہ دل کا قابو کرنا ایک مشکل بات ہے۔ لیکن ناممکن نہیں۔ اور پھر بتایا کہ یہ دل دو طریق سے بس میں آسکتا ہے

۱۔ ابھیاس یعنی لگاتار کوشش کرنا

۲۔ ویراگ یعنی دنیاوی چیزوں سے تعلق توڑنا۔

پہلے ہم کوشش کو لیتے ہیں۔ کہ وہ کوشش کس شکل میں ہو سکتی ہے اس کیلئے مفصلہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا مفید ہو سکتا ہے۔ جو کچھ یہاں عرض کیا جائیگا یہ فرض نہ کر لینا چاہیئے۔ کہ اسکے علاوہ اور کوئی طریقہ ہی نہیں۔ طریقے کئی ہیں جو سب سے

فائدہ اٹھانا چاہے اُٹھا سکتا ہے۔ غرض تو مقصد حاصل کرنے سے ہے۔ ذرائع کوئی بھی برتنے جا سکتے ہیں۔ اپنی اپنی شریعت اپنی اپنی طریقت اپنے اپنے خیالات کے مطابق جو طریقہ زیادہ مفید دکھائی دے اسکا استعمال کرنا چاہیئے۔ مقصد دل کی چنچلتا اور دل کی تھرتھراہٹ کو دور کرنا ہے۔ وسائل خواہ کوئی برتنے جائیں۔

ا۔ سب سے پہلے دل کی صفائی ضروری ہوتی ہے جس میل کو دور کرنا ہے وہ کونسی ہے۔ "گناہ اور نفرت کی"۔ زمانہ ماضی میں جو اعمال گناہ اور نفرت کے زیر اثر کئے جا چکے ہیں۔ اور ان کا جو اثر دل پر بیٹھا ہے۔ اس کو دور کرنا اور آئندہ کے لئے گناہ اور نفرت کے خیالات پاس نہ آنے دینا۔ اس غرض کے لئے ان کے مقابلہ کے نیک اوصاف کو ہر وقت پیش نظر رکھنا لازمی ہے۔ ایک کمرہ میں اگر اندھیرا ہو۔ اور ایک انسان اس کو دور کرنے کا خواہشمند ہو تو اگر وہ چاہے کہ دیواروں پر یا کمرے کے اندر جو اندھیرا ہے اس کو ڈنڈے مار کر باہر نکال دے تو اس کو سوائے ناکامی کے کچھ ہاتھ نہیں آئیگا۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ اندھیرے کی ضد یعنی روشنی کو لایا جائے۔ تو اندھیرا خود بخود بھاگ جائیگا۔ اسی طرح سے دل کے اندھیرے یعنی گناہ اور نفرت کو دور کرنے کیلئے ہم کو پوترتا اور پریم کی جوت جگانے کی ضرورت ہے۔ چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے جاگتے سوتے کھاتے پیتے نہاتے دھوتے غرضیکہ ہر وقت یہی خیال کرنا چاہیئے۔ کہ میرے اندر پاکیزگی اور محبت کے جذبات آرہے ہیں۔ میں طہارت اور الفت کے آب زمزم سے گناہ اور نفرت کے سابقہ بد اثرات کو دھو رہا ہوں جب مالک کے دربار میں دست بدعا ہونا ہو تو اس سے بھی انہی چیزوں کی طلب کی جائے۔ اس مالکِ ارض و سما سے دعا میں دنیاوی چیزوں کا مانگنا ایسا ہی ہے کہ جیسے ایک سمندر کے پاس پہنچکر کہ جس کے اندر موتی ہی موتی ہوں۔ پانی کے چند قطرے طلب کرنا۔ یا جیسے ایک بڑے شہنشاہ سے خاک کی مٹھی مانگنا۔ سابقہ برے اثرات کی وجہ سے بار بار ناپاک خیالات اندر داخل ہونا چاہیں گے

اور دل کا چونکہ اُن سے تعلق پیدا ہو چکا ہے وہ ان سے ہم آغوش ہونے کیلئے دوڑ یگا۔
لیکن دل کو اس وقت پھٹکار دینی چاہیئے۔ اور فوراً پاکیزگی اور پریم کے زبردست سانچے
سے اس کو روک دینا ازبس لازمی ہے۔ ایسے انسان کو جو حقیقتاً نیک سیرت اور سب
سے محبت کرنے والے ہوں۔ ان کے نیک اوصاف کو اور ان کے نیک اعمال کو نگاہ
کے سامنے لانا چاہیئے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نفرت اور غیریت کے خیالات کو دور کئے بغیر تو
ایک سیڑھی بھی چڑھنا محال ہے۔ ایک قدم بھی آگے رکھنا مشکل ہے ؎

کبر و حسد و بخل و نفاق و کینہ ! اوصاف بشر طبیعت دیرینہ
ہرگز بمقام ہیچ مردے نرسی تا زیں ہمہ پاک نسازی سینہ

ترجمہ۔ غرور۔ حسد۔ تنگ دلی۔ نفاق اور کینہ مدت سے انسانوں کے پیچھے
پڑے ہوئے ہیں۔ اے انسان! تو کسی اچھے مقام پر ہرگز نہیں پہنچ سکتا جب
تک ان عیوب سے اپنے دل کو صاف نہ کرلے۔

موجودہ زمانہ میں ان بدخصائل نے ہر جگہ خصوصاً اس ملک میں بہت غلبہ پالیا ہوا
ہے جس کی وجہ سے اس وطن کا نور ہو چکے ہیں اسلئے اس طرف زیادہ توجہ اور دھیان دینے
کی ضرورت ہے۔ جوں جوں گناہ اور غیریت کے اثرات زائل ہوتے چلے جائیں گے اور
ان کی جگہ نیکی اور محبت کے اثرات قائم ہوتے جائیں گے دل کی چلبلاہٹ اسکی چنچلتا اور
بقرار اہٹ اسکی بےچینی۔ اسکی گو دھاپنداز خود ختم ہوتی چلی جائیگی۔ غیریت اور نفرت کے
جذبات آگ کی مانند ہیں۔ کہ وہ تپش اور جلن پیدا کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے اُلفت اور
محبت کے خیالات ٹھنڈے پانی کی طرح ہیں کیونکہ وہ سکون اور طمانیت پیدا کرتے ہیں۔

۲۔ دوسرا طریقہ یا سادھن دل کی تار کو ایک جگہ ٹھہرانا ہے۔ بعض محققین اس کے لئے کسی
بیرونی مقام پر مثلاً سامنے کسی شفاف اور گول چیز پر نظر جمانے کی نصیحت فرماتے ہیں۔

لیکن احسن طریقہ آنکھیں بند کرکے دل کی تار کو اپنے دل کی جگہ یا پیشانی پر یا سر کی کھوپڑی کے پچھلے حصے کی طرف جاتا ہے۔ دونوں پر دو چیزوں کا خیال باندھا جائے یا تو نہایت خوبصورت کنول کے پھول کا اور یا جلتی ہوئی شمع کی لو کا جس کی روشنی کی مقدار کو زیادہ بڑھاتے جانا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر الگ ہونے کے کسی نام کا ورد کیا جائے۔ تو زیادہ مفید ہے۔ لیکن تار کا جمائے رکھنا زیادہ ضروری ہے تاکہ دل کو یکسوئی حاصل ہو۔ یہ احساس مقررہ وقت پر مقررہ عرصہ کے لئے صبح سویرے چھ بجے وقت یا اس سے پہلے کرنا بہت مفید ہوتا ہے۔ پہلے تھوڑے وقت کے لئے شروع کیا جائے۔ پھر جیسے جیسے اس میں جی لگے وقت کو بڑھایا جائے لیکن یہ یاد رہے کہ اور لگاتار۔

۳۔ جب بھی انسان فارغ ہو۔ خواہ کہیں ہو لیٹے بیٹھے جب بھی دل اٹھے اس وقت پیارا کا جو بھی نام پیارا لگتا ہو۔ اسکا سانس کے ساتھ ساتھ دل ہی دل میں ورد یعنی زبان ہلے نہ ہونٹ۔ سانس کو تیز یا ہلکا کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ سانس اپنی قدرتی رفتار سے چلتا ہے۔ ایکدفعہ سانس کے اندر جاتے وقت ایک دفعہ باہر نکلتے وقت اس نام کا ورد کیا جائے ایک سانس میں کئی بار نام کا ورد کرنے کی بجائے مقصد بالا طریقہ سے جپ کرنا دل کے ٹھہراؤ کے لئے زیادہ سودمند ہوتا ہے۔ جب ہر وقت اس طرح سے سانس کے اندر اور باہر کی رفتار کے ساتھ ورد جاری رکھا جائیگا تو کوئی اور خیال دل میں داخل نہیں ہو سکیگا یہ احساس کوشش کرتے رہنے سے عادت بن جائیگا یعنی خودبخود ہونا شروع ہو جائیگا۔ اور اس طرح سے دل ہر طرح کی بیرونی خیالات سے پاک رہیگا۔ نام خواہ کوئی بھی خواہ رام خواہ کرشن ہو۔ خواہ گوبند ہو۔ خواہ واہگورو۔ خواہ اللہ۔ خواہ رحمان ہو نتیجہ ایک ہی ہوگا۔ البتہ اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ ورد کرتے وقت ہر وقت یہ محسوس کیا جائے کہ اس پاک نام کے ورد سے دل میں پاکیزگی، خوشی اور سرور کی لہریں اٹھ رہی ہیں۔

۴۔ جتنے اوصاف حسنہ ہیں مثلاً محبت۔ الفت۔ نیکی۔ بھلائی۔ خوش معاملگی خوشی

اخلاق، شیریں کلامی، قناعت، پاکیزگی، ان کا کچھ دیر کے لئے علی الصبح بیٹھ کر دھیان کیا جائے اور پھر ہر وقت چلتے پھرتے بھی ایسا ہی کیا جاوے۔ صرف ایک وصف کو ہی ایک وقت میں لینا چاہیئے۔ اس کا ابھیاس کم از کم ایک ماہ تک ہو۔ مثلاً پہلے نیکی لے لیجئے اس کی نسبت انسان سوچے کہ میں تو نیک پروردگار کا بچہ ہوں میں کیسے نیکی سے علیحدہ ہو سکتا ہوں میں نیکی کے ہمیشہ سے وابستہ ہوں۔ دنیا میں ہر جگہ نیکی کام کر رہی ہے۔ سورج اور چاند ہمارے ساتھ نیکی کر رہے ہیں۔ درخت، پھل، پھول، دن رات ہر ایک چیز نیکی کرنے میں مشغول ہے۔ میں بھی ان کا ساتھی ہونگا میں بھی قدرت کا ایک جزو ہوں۔ میرا رویہ بھی قدرت کی باقی چیزوں کے مطابق ہوگا۔ بلکہ میرا قدم نیکی میں ان سے آگے بڑھیگا۔ میں اپنا تن من دھن نیکی کے لئے لگا دونگا۔ میرے مالک کی ذات نیک ہے میری پیدائش اسی ذات سے ہے جیسے جو کچھ سونے کی خاصیتیں ہوتی ہیں وہی سونے کے زیور کی ہوتی ہیں۔ ایسے ہی میں بھی نیک ذات سے نیک ہی پیدا کیا گیا ہوں۔ بیشک میں نیک ہی سوچونگا نیک ہی بولونگا نیک ہی کرونگا۔ نیک ہی دیکھونگا۔ نیک ہی سنونگا۔ نیکی اور میں یکذات ہیں۔ یکرنگ ہیں ہم آہنگ ہیں۔ نیکی مجھ سے اور میں نیکی سے جدا نہیں نیکی میرا ورد ہے۔ نیکی میرا مقصد ہے نیکی میری منزل ہے۔ نیکی میرے جسم کے ایک ایک حصہ میں سرایت کر رہی ہے میرے جسم کا بال بال نیکی سے لبریز ہو رہا ہے۔ نیکی کرنے کیلئے میں ہمیشہ تیار رہونگا۔ نیکوں کی ہی صحبت میں بیٹھونگا۔ نیک ہی مقامات پر جاؤنگا۔ نیک خیالات دینے والی کتابیں ہی پڑھونگا۔ نیکی کا پتلا بن جاؤنگا۔ حتیٰ کہ جب لوگوں نے نیکی کی کوئی زندہ مثال دینی ہوگی وہ میرا نام پیش کرینگے۔ میں خیال سے اور قول و فعل سے نیک ہونے کا ثبوت دونگا۔ جس کام پر میرے مالک نے لگایا ہے۔ اس میں قدم قدم پر نیکی کا نمونہ پیش کرونگا خواہ میں حاکم ہوں یا دکاندار۔ مزدور ہوں یا اہلکار۔ دولتمند ہوں یا غریب۔ میں ہمیشہ نیکی کے قلم سے اور نیکی کے ہاتھوں سے اپنے فرائض کو سرانجام دونگا۔"

اسی طرح سے ایک ماہ تک نیکی کا خیال ہر وقت سامنے رکھا جائے۔ پھر خوش خلقی کو لے لیا جائے۔ پھر شیریں کلامی کو وغیرہ وغیرہ۔ اول تو ایک ہی نیک وصف کے خیالات مضبوطی سے دل پر جمنے سے باقی کے اوصاف خود بخود حاصل ہو جائیں گے۔ یہ آپس میں سب بھائی بند ہیں جب ان میں سے ایک بھی آکر دل میں اپنا پختہ طور پر قیام کر لیتا ہے تب دوسرے اول اول تو اس کے ہاں مہمان کے طور پر آتے ہیں۔ لیکن بعد میں وہ بھی اپنا گھر وہیں بنا لیتے ہیں۔ اور اس طرح سے ان سب کی مکمل بستی بس جاتی ہے۔ چنانچہ جس وقت یہ جذبات اچھی طرح سے جاگزیں ہو جائیں گے تو دل کی اچھل بند ہو جائے گی۔ سکون حاصل ہو جائے گا۔

۵۔ دل اکثر چاہتا ہے کہ اس کا کہنا ہر موقعہ پر مانا جائے۔ لیکن اس کا غلام نہ بننا چاہیے۔ بلکہ اس پر کڑی نگرانی رکھنا چاہیے۔ اور جب بھی وہ کوئی بُری خواہش کرے تو اس کی تعمیل سے انکار کر دینا چاہیے۔ اس کے متعلق ایک حکایت عرض کی جاتی ہے۔

حکایت۔ ایک بزرگ کی روایت ہے کہ باوجود خود ضبطی کی زندگی بسر کرنے کے ایک دن بازار میں چلتے ہوئے ان کا کھجوریں کھانے کو جی چاہا۔ پیسہ تو پاس تھا ہی نہیں۔ اس لئے کھجوریں کہاں سے لے سکتے تھے۔ لیکن گھر پہنچ کر انہوں نے دل کو بڑی کڑی ملامت کی۔ دوسرے دن پھر وہاں سے گذرنے پر ویسی ہی حالت ہوئی۔ تب اس بزرگ نے ایک پیسہ کہیں سے حاصل کر کے کھجوریں خریدیں اور پاس رکھ لیں۔ جب واپس مکان پر آئے تو دل میں کہنے لگے۔ دیکھ اے دل یہ وہی چیز ہے جس کے لئے تو دو دن سے متواتر میرے امن میں خلل ڈال رہا ہے۔ وہ چیز تو اب موجود ہے لیکن تجھ کو ملے گی نہیں کیونکہ اگر میں آج کھجوروں کیلئے تیرا کہنا مان لوں تو کل کو تو حلوہ مانگے گا پرسوں کوئی اور چیز مانگے گا۔ بھلا تیری فرمائشیں بھی کبھی پوری ہو سکتی ہیں۔ ایسا کہکر انہوں نے وہ کھجوریں ایک غریب آدمی کو دے دیں۔ چنانچہ پھر دل کو کبھی ایسی خواہش نہ ہوئی۔ اور

چُپ چاپ زیرِ فرمان رہ کر چلنے لگا۔ برخلاف اس کے اگر اس کی خواہش پوری کر دی جاتی تو وہی مثال ہوتی ہے

یکے بچّۂ گرگ مے پرورید ۔۔۔ چو پروردہ شد خواجہ برہم درید

چو بر پہلوئے جاں سپردہ بخفت ۔۔۔ جہاندیدۂ بر سرش رفت و گفت

چو دشمن بناز و طرب پروری ۔۔۔ ندانی کہ ناچار زخمش خوری

ترجمہ:۔ ایک شخص نے بھیڑیئے کا بچہ پالا۔ جب وہ بڑا ہوا۔ تو اس نے پالنے والے کو پھاڑ کھایا۔ جب اسکو دفنایا گیا۔ تو ایک اہلِ نظر کا وہاں سے گذر ہوا۔ اس نے کہا۔ جو شخص اپنے دشمن کو ناز و نعمت سے پالتا ہے ایک نہ ایک دن اس کے ہاتھوں سے تکلیف اٹھاتا ہے۔

اس لئے اس دل کے کہنے پر نہ چلنا چاہیئے۔ کیونکہ اس کا غلام بننے سے ہر حالت میں ذلت اور خواری ہے شیخ سعدیؒ صاحب فرماتے ہیں ؎

مرو در پئے ہر چہ دل خواہدت ۔۔۔ کہ تمکینِ تن عز و جاں کاہدت

کند مرد را نفسِ امارہ خوار ۔۔۔ اگر ہوشمندی عزیزش مدار

ترجمہ۔ اے انسان دل کی خواہشات کے پیچھے نہ لگنا۔ ورنہ ظاہری عزت اور باطنی منزلت کی خیر نہیں۔ نفسِ امارہ کی پیروی سے انسان ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ عقلمند انسان اس کا کبھی گرویدہ نہیں ہوتا۔

پھر کرنا کیا چاہیئے۔ اس کے متعلق لکھا ہے کہ ؎

نفس را آں بہ کہ در زندان کنی ۔۔۔ ہر چہ فرماید خلاف آں کنی

کامِ نفسِ بد برآوردن خطاست ۔۔۔ زانکہ دشمن را بہ پروردن خطاست

ترجمہ۔ نفس (جو خواہشات کا منبع ہے) کے متعلق تو یہی بہتر ہے کہ اسکو قیدخانہ میں ڈالا جائے اور جو کچھ یہ کہے اس کے خلاف عمل کیا جائے۔ اس بُرے نفس کی

خواہشات کو پورا کرنا غلطی ہے۔ کیونکہ ایک دشمن کو پالنا بڑی بھول ہے۔

کبیر صاحب نے بھی فرمایا ہے۔ کہ

کبیر من گجند ہے آنکس دے دے راکھ

یعنی دل ہاتھی کی مانند ہے۔ اس کو آنکس لگا لگا کر قابو میں رکھنا چاہیئے۔

حضرت داغ دہلوی نے خوب فرمایا ہے ؎

بعد مدت کے یہ اے داغ سمجھ میں آیا وہی دانا ہے کہا جس نے نہ مانا دل کا

مشہور رومن پروفیسر مسٹر ایل۔ اے سینیکا لکھتے ہیں کہ سب سے زبردست اور طاقتور اور شہزور انسان وہی ہوتا ہے جو اپنے دل پر قابو پائے۔ کیونکہ دل اگر قابو میں ہو۔ تو انسان بادشاہ بنا رہتا ہے اور اگر بے قابو ہو تو اسے بڑی ذلت و خواری اٹھانا پڑتی ہے ؎

کبھی لاتا ہے خرابی کبھی کرتا ہے ذلیل بادشاہی ہے اگر دل پہ حکومت رکھے

یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں دل سے بڑا نہ کوئی دوست ہے نہ دشمن۔ اگر یہ بس میں ہے تو اس جیسا دوست نہیں۔ اگر یہ خود مختار ہے۔ تو اس کا سا دشمن بھی کوئی نہیں۔

۶۔ خوراک کا اثر بھی دل کی ہلچل پر بہت ہوتا ہے۔ اس لئے خوراک کے متعلق ان باتوں کا دھیان رکھنا چاہیئے۔

الف۔ دیکھنے میں بھلی معلوم ہو۔ یعنی غلیظ گلی سڑی نہ ہو۔

ب۔ زود ہضم۔ سادہ لیکن خوش ذائقہ اور پسندیدہ نگاہ ہو۔

ج۔ بھوک رکھ کر کھائی جائے معدہ کا ایک تہائی حصہ ضرور خالی رکھا جائے

د۔ صاف مقام پر بیٹھ کر عام لوگوں کی نظر سے بچا کر کھائی جائے۔

ہ۔ غذا نہ بہت گرم ہو نہ بہت ٹھنڈی۔ نہ جلی ہوئی نہ زیادہ بھنی ہوئی۔ نہ زیادہ

خشک نہ کڑوی نہ باسی اور بدبودار۔ نہ زیادہ چرپری۔ نہ زیادہ مرچ مصالحہ والی چٹپٹی۔

و۔ متضاد چیزیں نہیں کھانی چاہئیں۔ یعنی جن کی آمیزش سے کیمیائی اثر کے باعث ایک قسم کا زہر بن جاتا ہے مثلاً دودھ اور کھٹائی۔

ز۔ ایسی چیزیں ہرگز نہ کھانا چاہئیں۔ جو دل میں جوش پیدا کریں۔ کیونکہ ان کے استعمال سے طبیعت میں غصہ بڑھتا ہے اور غصہ دل کے قابو کرنے میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔

ح۔ اصولاً غذا ایسی ہونی چاہیئے۔ جو جسم کی پرورش تو صحیح طور پر کرے مگر جذبات سفلی کو مشتعل نہ کرے اور اس میں VITAMINS (وٹامن) صحیح اور موزوں اندازے پر ہوں۔ کوئی خاص وٹامن بہت زیادہ یا کم نہ ہوں۔

ط۔ سب سے آخری مگر سب سے ضروری بات یہ ہے کہ جو کچھ بھی کھایا جائے وہ جائز طریقہ سے کمایا جائے۔ ایمانداری۔ سچی محنت اور نیک نیتی سے پیدا کی ہوئی روزی سے ہی اندرونی صفائی حاصل ہو سکتی ہے۔

منو بھگوان نے بہت قسم کی صفائیاں لکھی ہیں۔ مثلاً جسم کی صفائی۔ کپڑوں کی صفائی۔ گھر کی صفائی وغیرہ۔ لیکن آخر میں لکھا ہے۔ کہ سب سے ضروری اور سب سے اعلےٰ صفائی کمائی کی ہے۔ کمائی میں اگر آلودگی یا ناپاکیزگی ہوگی۔ تو دل کبھی درست نہیں ہو سکتا جتنی پاکیزہ کمائی ہوگی اتنا ہی زیادہ دل پاکیزہ ہوگا۔

۷۔ بہت زیادہ بولنا نہیں چاہیئے۔ بہت زیادہ باتیں کرنے کے کئی نقصانات ہیں۔ کیونکہ

اوّل۔ بہت زیادہ بولنے میں آدمی کئی باتیں بناوٹی۔ مبالغہ آمیز۔ جھوٹی، خود ستائی کی یا دوسروں کی عیب جوئی کی کہہ جاتا ہے۔ جو بڑا بھاری عیب ہے۔

میں بتا دوں آپ کو اچھوں کی کیا پہچان ہے
وہ ہیں خود اچھے جو اوروں کو نہیں کہتے بُرا

دوم۔ انسان کے ہر ایک عضو میں ایک بجلی بھری ہوئی ہے۔ وہ جس حد تک قائم رکھی جائے۔ اسی قدر صحت کے لئے، دل پر قابو پانے کے لئے اور خیالات کی یکسوئی حاصل کرنے کیلئے بڑی مفید ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ بجلی ہاتھ، آنکھ اور زبان میں ہوتی ہے۔ مسمریزم اور ہپنا ٹزم کے جتنے ابھیاس ہیں وہ ان تینوں اعضا سے کئے جاتے ہیں۔ جب بھی کوئی روحانی ابھیاس کرایا جاتا ہے۔ تو اس میں بیٹھنے کے لئے سب سے پہلی بات یہ ہوتی ہے کہ ہاتھ سیدھے رکھو یعنی ہتھیلی اوپر کی جانب ہو۔ آنکھیں بند کرو۔ اور خاموش بیٹھو۔ اس کی غرض یہی ہوتی ہے کہ وہ بجلی یک جا ہو سکے۔ اس لئے بعض ہادی اس بات کی ہدایت فرماتے ہیں کہ چلتے وقت مٹھی بند کرکے چلنا چاہیئے۔ کیونکہ کھلی ہوئی انگلیوں سے چلنے میں بجلی ضائع ہو جاتی ہے آنکھیں بھی نیچی کرکے چلنا چاہیئے۔ ہاں قدرت کے نظاروں کو دیکھنے میں کوئی ہرج نہیں۔ بلکہ وہ ضرور دیکھنے چاہئیں۔ کیونکہ وہ اس بجلی میں افزونی کرتے ہیں۔ جو لوگ اپنی آنکھوں سے بُرے نظارے دیکھتے ہیں۔ انہیں باور رکھنا چاہیئے۔ کہ وہ اپنے جسم کی بجلی آنکھوں کے ذریعہ ضائع کرتے ہیں۔ ایسے ہی زیادہ بولنے والے کی بجلی زبان کے ذریعے خارج ہوتی جاتی ہے آپ نے پڑھا اور سُنا ہے کہ بہت سے بزرگ مثلاً مہاتما گاندھی ہفتے میں کم از کم ایک دن مکمل خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ حال ہی میں ایک اخبار کے ایڈیٹر کی بابت بتایا گیا تھا۔ کہ وہ سال میں ایک ماہ خاموشی کا برت لیتا ہے۔ اس عرصہ میں وہ اپنا کام ایڈیٹری کا اور دوسرا بھی کرتا ہے اور اپنی ضروریات یا خیالات کو لکھ کر یا اشاروں سے سمجھا دیتا ہے لیکن زبان سے کچھ نہیں کہتا۔ اس نے اپنے تجربہ کی بنا پر لکھا ہے کہ ایک ماہ کی خاموشی کے بعد اس کے خیالات میں زیادہ

یکسوئی۔ دل میں زیادہ طاقت اور سکون اور حافظہ میں زیادہ قوت آ جاتی ہے ؎

خموشی لعل ہے ورج دہن میں مت کھونا ۔ جو بات چیت ہے چاندی خموشی ہے سونا

اکثر مہاتما اور بزرگ لوگ کم بولتے ہیں وہ بلا وجہ نہیں۔ اس کے اندر بھی ایک راز ہے کہ زیادہ بولنے سے دل میں بہت ہلچل اٹھتی ہے۔ تبھی تو کہا ہے ؎

جو ہوا کامل وہ کرتا ہے خموشی اختیار ۔ ماہِ نو جب بدر ہوگا بے زباں ہو جائیگا

انگلستان کے مشہور مصنّف مسٹر ڈبلیو بین لکھتے ہیں کہ خاموشی دل کا سکون ہے اور روح کے لئے وہی درجہ رکھتی ہے جو جسم کے لئے نیند۔ یہ روح کی خوراک اور تفریح ہے۔ یہ ایک بہت بڑا وصف ہے اس سے انسان کی جہالت ڈھکی رہتی ہے۔ راز افشا نہیں ہوتے جھگڑے کھڑے نہیں ہوتے اور انسان گناہ سے بچتا ہے۔ تبھی تو کہا ہے ؎

خموشی معنیٔ دارد کہ در گفتن نمے آید ۔ لبطبعم ہیچ مضمون بہ زلب بستن نمی آید

ترجمہ۔ خاموشی میں ایسے معنی پنہاں ہیں جو احاطۂ بیان میں نہیں سما سکتے۔ میری سمجھ میں چپ رہنے سے زیادہ اچھا مضمون اور کوئی نہیں۔

رسولِ کریمؐ کا فرمان ہے کہ میں تمہارے لئے بہشت میں مقام دلانے کا ضامن ہوں۔ اگر تم دو باتوں کا عہد کرو۔ اول یہ کہ جو عضو تمہاری دو رانوں کے درمیان ہے اسکو قابو میں رکھو۔ اور دوم یہ کہ جو عضو تمہارے دو ہونٹوں کے درمیان ہے اس پر تسلط رکھو۔

امریکہ کی مشہور مصنفہ مسز ایس جے ہیل لکھتی ہیں۔ کہ ہمارے پاکیزہ ترین خیالات کی عبادت گاہ خاموشی ہے ؎

یاد دارم از صدف ایں نکتۂ سربستہ را ۔ سینہ ہا را خاموشی گنجینۂ گوہر کند

ترجمہ: سیپی نے جو یہ راز کی بات بتائی وہ مجھے یاد ہے کہ خاموشی دلوں کو موتیوں کا خزانہ بنا دیتی ہے۔

ایک دانا نے لکھا ہے کہ دل کو درست رکھنے کے لئے یہ اصول بناؤ کہ جہاں نہ جانے سے کام چل سکے۔ وہاں نہ جاؤ۔ جس بات کے نہ کہنے سے کام چل سکے وہ نہ کہو۔ جس چیز کے نہ ہونے سے کام چل سکے اس کے حاصل کرنے کی کوشش مت کرو۔ جس کام کے نہ کرنے سے دفع الوقتی ہو سکتی ہے۔ وہ نہ کیا جائے۔

۸۔ ایک اور بات جو دل پر فتح پانے میں ممد ہوتی ہے وہ اچھی اچھی کتابوں کا پڑھنا ہے۔ مذہبی اور اخلاق آموز کتابوں کا مطالعہ از بس مفید ہوتا ہے۔ گندے ناول یا عشقیہ قصے کہانیاں پڑھنا بہت مفید ہے۔ غضب یہ ہے کہ جہاں دیکھو۔ دکانوں پر، سٹیشنوں پر، گاڑیوں میں، میلوں پر اور دیگر مجمعوں کے موقعوں پر لوگ اپنے چند پیسوں کی خاطر قوم کے نوجوانوں کے اخلاق بگاڑنے والے ناول اٹھائے پھرتے ہیں۔ کوئی ایسا قانون ہونا چاہیئے۔ کہ جو چھاپہ خانہ ایسی بیہودہ اور مخرب اخلاق کتابیں چھاپے یا جو آدمی بیچے اس کے لئے سزا ہو جس طرح سے سیاسی مضامین کی کتابوں کے متعلق قانون ہے۔ ایسا ہی کڑا قانون[1] ان غلاظت اور بد اخلاقی کے پلندوں کے بارہ میں تیار ہونا چاہیئے۔ جب تک ایسا قانون نہیں بنتا تب تک سوسائٹی کو یہ کام اپنے ہاتھ میں لینا چاہیئے۔ پلیٹ فارم پر اور اخبارات میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالی جائے۔ اور پبلک کو اس کے مضر اثرات سے آگاہ کیا جائے۔ سوسائٹی ایسی کتابیں چھاپنے والے پریسوں کا اور بیچنے والے دکانداروں کا بائیکاٹ کرے میرا اپنا خیال ہے کہ جس قدر بد اخلاقی تھیٹر، سینما اور ناولوں نے اس ملک میں پھیلائی ہے۔ شاید ہی کسی اور چیز نے اتنی پھیلائی ہو۔ اگر میرے بس کی بات ہو۔ تو یک لخت سب سینما تھیٹر بند کر دئے جائیں۔ اور گندے ناول جہاں کہیں ہو جلا دئے جائیں۔

[1] موجودہ قانون اس بارہ میں ڈھیلا ہے۔

اور آئندہ کیلئے حکماً بند کر دئے جائیں۔ ان کا موجودہ رُوپ نہایت گھناؤنا ہے۔

سر ڈوگلڈ زبیرلڈ لکھتے ہیں کہ سب سے قابل قدر ساتھی کتاب ہے لیکن وہ کتاب کو جو خوب غور سے منتخب کی گئی ہو۔ ایسی کتاب زندگی کی بہترین دوست اور بہترین صلاح کار مشیر ہوتی ہے

۹۔ اپنے دل کو عبادتگاہ سمجھ کر اس کے اندر مالک کے جلوے کی پرستش کی جائے۔ تو اس سے بھی دل کے سکون میں بہت امداد ملتی ہے۔ یہ بات محض فرض کر لینے کی ہی نہیں۔ درحقیقت انسانی دل کے اندر جلوۂ ربی ہے۔ کبیر صاحب نے فرمایا ہے ؎

جیوں تِل ماہیں تیل ہے جیوں چقمق میں آگ ۔۔۔ تیرا سائیں تجھ میں جاگ سکے تو جاگ
برچھ جو ڈھونڈھے بیج کو بیج برچھ کے ماہیں ۔۔۔ جیو جو ڈھونڈے پیو کو پیو جیو کے ماہیں

ترجمہ۔ جیسے تلوں میں تیل ہوتا ہے اور چقماق پتھر میں آگ ہوتی ہے۔ اسی طرح اے انسان! تیرا مالک تیرے اندر موجود ہے۔ اگر تو اس کو دیکھ سکتا ہے تو دیکھ۔ درخت جو اپنے بیج کو تلاش کرتا ہے۔ بیج تو درخت کے اندر ہی موجود ہے۔ اسی طرح سے انسان جو اپنے مالک کو ڈھونڈتا ہے وہ تو اس کے اندر ہی ہے۔

پھر سُندر کوی نے کہا ہے ؎

آپ ہی کے گھٹ میں پرگٹ پرمیشور ہے ۔۔۔ تاہیں چھاڑ بھُول نر دُور دُور جات ہے
کوئی دَورے دوارکا کوئی کاشی جگن ناتھ ۔۔۔ کوئی دَورے متھرا کوئی ہردوار نہات ہے
کوئی دَورے بدری کوئی وِشنم پہاڑ چڑھے ۔۔۔ کوئی تو کیدار جات من میں سہات ہے
سُندر کہت گورو دیو دیئے دیہ نین ۔۔۔ دُور ہی کے دُور ہیں اندر دکھات ہے

ترجمہ:۔ انسان کے اندر پرمیشور موجود ہے اس کو چھوڑ کر غلطی سے انسان دور جاتا ہے۔ کوئی دوارکا نگری کو دوڑتا ہے۔ کوئی کاشی اور جگن ناتھ۔ کوئی متھرا نگری

کو اور کوئی ہردوار جا کر اشنان کرتا ہے۔ کوئی بدری نارائن کو جانے کے لئے سخت پہاڑوں پر چڑھتا ہے۔ اور کوئی کیدار ناتھ جا کر خوش ہوتا ہے۔ لیکن سُندر کوی جی فرماتے ہیں۔ کہ پیر و مرشد نے ہم کو چشم بصیرت دے کر بغیر دور جانے کے اندر ہی اس کے دیدار کرا دئے ہیں۔

رسُولِ کریم ؐ کا فرمان ہے کہ

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ (مُسلم)

ترجمہ: جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا۔ بیشک اس نے اپنے مالک کو پہچان لیا۔

گورو گرنتھ صاحب میں ذیل کا واک آیا ہے:۔ دھناسری محلہ ۹

کاہے رے من کھوجن جائی
سرب نواسی سدا الیپا توہی سنگ سمائی
انک رہاؤ
پُہپ مدھ جیوں باس بست ہے مکر ماہیں جیسے چھائی
تیسے ہی ہر بسے نرنتر گھٹ ہی کھوجو بھائی
باہر بھیتر ایکو جانو ایہہ گور گیان سنائی
جن نانک بن آپا چینے مٹے نہ بھرم کی کائی

ترجمہ: اے دل تو کیوں باہر تلاش میں سرگرداں ہے۔ وہ حاضر و ناظر اور ہمیشہ بے لوث مالکِ کُل تو تیرے اندر ہی سمایا ہوا ہے۔ جیسے پھولوں میں خوشبو ہوتی ہے اور جیسے شیشے میں عکس ہوتا ہے ایسے ہی وہ مالک انسان کے باطن میں ہے۔ اس لئے اندر ہی کھوج کرنی چاہیئے۔ پیر و مرشد نے یہ رمز بتائی ہے کہ وہ مالک اندر اور باہر ایک سا ہی ہے۔ گورو نانک دیو جی فرماتے ہیں۔ کہ اپنے

اندر پہچاننے بغیر جو عمر بھر کی کائی دل پر جمی ہوئی ہے وہ دُور نہیں ہو سکتی۔

مولانا رومؒ نے اس بات کو بہت ہی خوبی سے فرمایا ہے ؎

قُفل را بگشا کہ مالِ بیکراں درکفِ خود آر از گنجِ نہاں
کاندراں لعل و گُہر بسیار ہست از متاعِ لُولوئے شہوار ہست
ہر چہ مے خواہی ز گنجِ بے شمار آیدت در دست اے عالی تبار

ترجمہ :- اپنے اندر کا تالا کھول اور وہاں کے پوشیدہ خزانہ سے بے اندازہ دولت اپنے قبضہ میں لے۔ تیرے اندر لعل و گوہر کی بڑی بھاری کان ہے۔ بڑے قیمتی موتیوں سے اٹی پڑی ہے۔ اے عالی نژاد اندر سے بے شمار خزانہ تیری حسب خواہش تیرے قبضہ میں آسکتا ہے۔

ایک اُردو شاعر نے اس نکتہ کو اور بھی خوبصورتی سے واضح کیا ہے ؎

حیران ہوں نہایت آخر یہ خبط کیا ہے کس دوست گمشدہ کو جنگل میں ڈھونڈتا ہے
تجھکو طلب ہے جسکی دونوں ہیں اس سے خالی دروازہ کھول دل کا دَیر و حرم میں کیا ہے
کرتا ہے جبّہ سائی کیوں مقبروں پہ غافل تو دل کی زندگی کو مُردوں سے مانگتا ہے
دل ہے تو سب کہیں ہے ورنہ کہیں نہیں ہے کیا خوب قول تیرا اے جوشِ بے نوا ہے
کس نیند میں ہے نبدے اندر تیرے خدا ہے!

اس لئے اپنے دل کو ایک نہایت پاکیزہ مسجد سمجھو۔ اس کے اندر نورِ الٰہی کا مقام پہچانو۔ اور جو کام کرو۔ اس کا دھیان کر کے کرو۔ جو کھاؤ اس کی نذر کر کے کھاؤ۔ جو پیو۔ اس کی بھینٹ کر کے پیو۔ جوں جوں یہ مشق بڑھتی جائے گی دل کا مقام حقیقتاً پاک و طہور بن جائیگا۔ اور اس پر کوئی پراگندگی یا آلودگی کے خیالات جگہ نہ پا سکیں گے۔ حتیٰ کہ بالآخر حقیقی سکون و طمانیت حاصل ہو جائیگی۔

۱۰- ایک اور بات جس سے اس مقصد کو مدد مل سکتی ہے وہ صحت اور طاقت

کو ٹھیک رکھنا ہے۔ کمزور آدمی کا دل بھی کمزور ہوتا ہے۔ اور اس میں بہت گڑبڑ رہتی ہے۔ توانا اور مضبوط آدمی کا دل کچھ سا دھن کرنے سے جلدی قابو میں آجاتا ہے۔ اس لئے جسمانی طاقت کو حاصل کرنے اور برقرار رکھنے کے لئے ہمیشہ کوشش کرنا چاہیئے انگریزی مثل ہے :-

A SOUND MIND IN A SOUND BODY

یعنی تندرست جسم کے اندر ہی تندرست دل رہ سکتا ہے۔ صحت کو برقرار رکھنے کے لئے روزانہ ورزش، صفائی، کھلی ہوا میں رہنا، پوری نیند لینا۔ خوراک کے متعلق احتیاط رکھنا وغیرہ ضروری اصول ہیں۔ طاقت کو قائم رکھنے کے لئے انسان کو برہم چریہ کا دھیان رکھنا چاہیئے۔ علم طب کے ماہرین بتاتے ہیں کہ جو خوراک کھائی جاتی ہے اس کا پانچ دن میں رس تیار ہوتا ہے۔ پھر پانچ دن میں خون بنتا ہے۔ پھر ہڈی۔ گوشت۔ چربی وغیرہ تیار ہو کر پینتیس ۳۵ دن کے بعد ویریہ یا منی کی شکل میں آتا ہے۔ یعنی اتنے کیمیائی تغیرات کے بعد یہ رسوں کا رس حاصل ہوتا ہے اور اس لئے یہ ایک نہایت قابل قدر چیز ہوتی ہے بعض کتابوں میں اسکو "جلال" اور "تیج" کے نام سے پکارا گیا ہے کیونکہ واقعی اس کے رہنے سے ہی جسم میں تیج اور جلال قائم رہ سکتا ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس قیمتی چیز کو بڑی بے دردی سے ضائع کرتے ہیں۔ اور بڑی لاپروائی سے اس خزانے کو لٹاتے ہیں جن جن شرمناک طریقوں سے اس دُرِ بے بہا کو پھینکا جاتا ہے۔ اس کے لکھنے سے نہ صرف شرم آتی ہے۔ بلکہ رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ بہرحال جہاں تک ہو سکے اس کی حفاظت لازم ہے۔ جو شخص اوائل عمر سے ہی اس کی مکمل حفاظت کر سکیں وہ مبارک ہیں۔ لیکن ایسے خوش قسمت لوگ بہت کم ملتے ہیں۔ بہرحال جس وقت بھی یہ بات سمجھ آجائے مبارک ہے۔

۱۱ - ایک اور طریقہ دل کے ٹھہراؤ کے لئے یہ ہے کہ انسان اپنے ہر ایک کام میں

باقاعدگی رکھے۔ اٹھنا، سونا، کھانا وغیرہ جو بھی روزانہ زندگی کے کام ہیں۔ ان کے اندر پوری پوری باقاعدگی ہو۔ اپنے اخلاق اور برتاؤ میں باقاعدگی ہو۔ ایسا کرنے سے دل بھی باقاعدگی کے اصول میں بندھ جاتا ہے۔ اور اپنی من مانی کارروائی نہیں کرا سکتا بلکہ تابع فرمان ہو کر چلتا ہے۔ باقاعدگی کی نسبت حضرتِ غالب نے بہت خوب کہا ہے ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے ۔۔۔ مرے گر دیر میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

یعنی باقاعدگی عمل کا وہ درجہ ہے کہ اس پر عمل پیرا رہنے والا اگرچہ بت خانہ میں مرنے والا برہمن بھی ہو تب بھی اپنی باقاعدگی کے باعث وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اسکو کعبہ میں دفنایا جائے۔

۱۳۔ ایک آخری لیکن نہایت ضروری طریقہ جو سکونِ دل حاصل کرنے کے لئے عرض کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہر ایک انسان کو دوست کی نگاہ سے دیکھا جائے جس کسی سے بھی واسطہ پڑے۔ خواہ وہ کسی ذات، کسی ملت، کسی رنگ کا ہو۔ اس کو اپنا ہم جنس بھائی اور خیر خواہ سمجھا جائے۔ حضرتِ رند نے کہا ہے ؎

رند مشرب ہوں میرا مہر و محبت ہے طریق ۔۔۔ نہ مسلماں سے کاوش نہ خلش ہندو سے

زندگی کے دن کیسے گزارنے چاہئیں۔ اور کن خیالات کو دل میں رکھ کر ہر ایک انسان سے برتاؤ کرنا چاہیئے۔ اُسی شاعر نے کہا ہے ؎

برہمن برہمن سمجھے مسلماں اہلِ ایماں ہیں ۔۔۔ بسر کر اس طرح سے زندگی گبر و مسلماں میں

جن لوگوں کا مختلف شریعتوں کی وجہ سے باہمی اختلاف ہے اور اسی لئے وہ آپس میں برسرِ پیکار رہتے ہیں یا جھگڑے کرتے ہیں۔ یا ایک دوسرے کو محبت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے ان سے کہہ دینا چاہیئے ؎

یہ میرے سامنے شیخ و برہمن کیا جھگڑتے ہیں ۔۔۔ اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہوں دونوں کا قائل ہوں

ہیں تو اپنے ذاتی تجربہ سے عرض کر سکتا ہوں۔ کہ اس قسم کا نقطۂ نگاہ رکھنا انتہا مسرت افزا اور انتہا لطف اندوز ہوتا ہے کہ جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں انسان کو اپنے اپنے گھر کے جھگڑے کیا کم ہیں۔ کہ وہ بے وقوفی سے یہ مزید قضیئے سہیڑ کر اپنی زندگی کو عذاب میں ڈالے ہیں تو اکبر کے اس قول کا بالکل قائل ہوں کہ ؎

عنایت مجھ پہ فرماتے ہیں شیخ و برہمن دونو — موافق اپنے اپنے پاتے ہیں میرا چلن دونو
ترانے میرے ہم آہنگ دیر و کعبہ میں یکساں — زباں پہ میری بوز دل ہوتی ہے حمد و بھجن دونو

جو انسان ایسی نگاہ رکھے کہ سب کو بھائی اور دوست سمجھے۔ اس زندگی میں تو وہ اس کا ثمر دلی طمانیت کی شکل میں پاتا ہے۔ لیکن موت کے بعد بھی ؎

دوستی تھی مجھے ہر اک سے گئے تا درِ قبر — دوش پہ نعش میری گبر و مسلماں لے کر

سمجھئے ہو آج کل کے یہ فرقہ وارانہ جھگڑے کس بات کے ہیں۔ کیا ان کا باعث دھرم اور ایمان کا پیار ہے؟ ہرگز نہیں۔ کیا قوم کی خدمت؟ مطلق نہیں۔ کیا شریعت سے انس؟ بالکل نہیں تو حقیقت کیا ہے۔ خاقانیٔ ہند ذوق نے اسکو یوں بیان کیا ہے ؎

کیسا مومن کیسا کافر کون ہے صوفی کیسا رند — سارے بشر ہیں بندے حق کے سارے یہ شر کے جھگڑے ہیں

اور یہ صرف بارہ طریقے عرض ہوئے ہیں۔ اور بھی بہت سے ہیں۔ لیکن اگر ان میں سے چند ایک پر بھی عمل کیا جائے تو دلی مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ انسانی دل فطرتاً نادان بے سمجھ بچے کی طرح ہوتا ہے بات بات پر مچلتا ہے۔ بات بات پر ضد کرتا ہے روٹھتا ہے منتا ہے۔ روتا ہے ہنستا ہے۔ اس کی یادداشت بے شک بڑی ہے۔ لیکن بھول کا بھی پتلا ہے۔ کبھی ڈرانے سے ڈر جاتا ہے کبھی محض پیار پچکار سے راہِ راست پر لگ جاتا ہے۔ اس کا حال اچھا ہو تو ماضی و استقبال کا آئینہ ہے اور اگر گرد و کدورت سے دب جائے تو بے خبری، بے خردی، بدباطنی اور بدعملی کا مجسمہ ہے۔

انسان اور اس کے خیالات

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

دنیا کے اندر ہزاروں قسم کی طاقتیں ہیں۔ مثلاً جسمانی طاقت۔ دولت کی طاقت رشتہ داروں کی طاقت۔ قانون کی طاقت۔ بادشاہ کی طاقت۔ فوج کی طاقت۔ یہ ساری طاقتیں اپنے اپنے دائرہ میں اپنا کافی زور دکھاتی ہیں۔ لیکن دنیا کی سب طاقتوں سے بڑھ کر ایک طاقت ہے جسکو "خیال کی طاقت" کہتے ہیں۔ خیال کی طاقت سے زیادہ زبردست اور تیز کوئی طاقت نہیں، ریل گاڑی، موٹر، جہاز اور طیارے بڑی رفتار سے دوڑ لگاتے ہیں ان سب سے بڑھ کر ہوا کی رفتار ہے۔ اس سے بھی زیادہ روشنی کی رفتار ہے۔ جو کہ ایک سیکنڈ میں ۱۸۶۰۰۰ میل کی رفتار سے جاتی ہے لیکن آپ سنکر حیران ہونگے کہ اگر خیال کی طاقت کو ٹھیک طور پر بڑھایا جا دے تو خیال ۸۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ (آٹھ پدم) میل فی سیکنڈ کی رفتار سے جا سکتا ہے یہ سب دنیا خیال کا ہی نتیجہ ہے دنیا کی پیدائش کے متعلق لکھا ہے کہ خالق ازلی نے خیال کیا کہ میں ایک سے زیادہ ہو جاؤں۔ بس اسی خیال کا نتیجہ ہی یہ ساری کائنات ہے دنیا کے اندر اور بھی جتنی چیزیں دکھائی دیتی ہیں وہ سب خیال کے ہی کرشمے ہیں۔ مثلاً جتنے مکانات ہیں وہ ان کے مالکوں اور تعمیر کنندوں کے خیال کا نتیجہ ہیں۔ باغ کے اندر پودے۔ پھل میوے اور پھول وغیرہ مالی کے خیال کا نتیجہ ہیں۔ رنگا رنگ کے خوبصورت کپڑے بننے والوں کے خیال کا نتیجہ ہیں۔ ریل کا انجن۔ تار ٹیلیفون

ہوائی جہاز وغیرہ ان کے موجدوں کے خیال کا نتیجہ ہیں۔ سامان حرب بھی خیال کی ہی پیدائش ہے۔ غرضیکہ دنیا کے اندر جس چیز کو دیکھئے خواہ قدرت کی پیدا کی ہوئی ہے۔ خواہ انسان کی۔ ان سب کی ابتدا ایک خیال سے ہی ہے۔

خیال کی تیزی اور طاقت کی نسبت اوپر عرض ہو چکا ہے۔ یہ طاقت ہر ایک انسان کے اندر موجود ہے اس کو جتنا چاہے وہ بڑھا سکتا ہے اور اسے جدھر چاہے لگا سکتا ہے۔ اور اسی طاقت کے ذریعہ جو کچھ وہ بننا چاہتا ہے بن سکتا ہے۔ یہ سب کچھ اس طاقت کے استعمال پر منحصر ہے دنیا کے اندر بعض انسانوں نے اس خیال کی طاقت کو استعمال کر کے بڑی بڑی ایجادیں کیں۔ جو دنیا کو فائدہ پہنچا رہی ہیں۔ اور بعض نے زہریلی گیسیں اور کلدار توپیں بھی اسی خیال کی طاقت سے بنا ڈالیں۔ جن سے دنیا کے اندر تباہی مچ رہی ہے۔ اسی طاقت کے خیال سے لوگ فرشتے اور دیوتے بن گئے اور اسی خیال کی طاقت سے شیطان کے بڑے بھائی بن گئے۔ یہ طاقت مسلمہ ہے۔ اس کا جیسا استعمال کیا جائیگا۔ اس کا ویسا ہی نتیجہ حاصل ہوگا۔

ہر ایک کام کرنے سے پہلے اس کا نقشہ خیال کی شکل میں بندھتا ہے اور اس نقشے کے بننے کے بعد ہر ایک کام کا آغاز ہوتا ہے۔ فرض کیجئے ایک لکڑی کا ٹکڑا ہے ایک بڑھئی اسکو دیکھ کر اپنے دل میں ایک الماری کا نقشہ باندھتا ہے۔ جو اس ٹکڑے سے تیار کی جا سکتی ہے۔ پھر اس نقشے کے مطابق لکڑی کو چیر کاٹ کر اپنے خیال کو عمل کی شکل میں لے آتا ہے۔ ایک انسان کے پاس روپیہ ہے وہ دل میں خیال کرتا ہے کہ اس سے ایک خیراتی ہسپتال یا ایک یتیم خانہ بنوا دیا جائے۔ پس اس روپیہ کے ذریعہ وہ اپنے خیال کے نقشے کو عملی شکل دیدیتا ہے ایک چور یا ایک قاتل اپنے خیال میں چوری یا قتل کا ارادہ کرتا ہے اور پھر کئی ذریعے استعمال کر کے اس خیال کو عملی جامہ پہنا دیتا ہے۔ غرضیکہ اچھے یا برے کام دنیا میں جتنے بھی ہو رہے ہیں خیال

کی طاقت کا ہی نتیجہ ہیں۔ ان کا مفید یا نقصان دہ ہونا۔ اچھا یا بُرا ہونا اس نقشے پر منحصر ہے کہ وہ انکو عملی شکل میں لانے سے پہلے خیال کی شکل میں باندھ گیا۔ ایک مثال سنیئے:۔

حکایت:۔ ایک متمول آدمی لاولد تھا۔ اسکا بھتیجا اپنے چچا کی جائیداد پر آنکھ رکھتا تھا۔ انجام کار بھی وہ دولت اس کے چچا کے فوت ہونے پر اسی کے حصہ میں آتی۔ لیکن اسکی خواہش انتظار کے راستہ میں حائل تھی۔ اپنی خواہش کو فی الفور پورا کرنے کیلئے اس کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا۔ کہ چچا کی زندگی کا فوراً خاتمہ کیا جائے۔ بس وہ خیال زور پکڑنے لگا۔ دن رات وہ اسی دھن میں رہتا تھا۔ ایک رات وہ سویا ہوا خواب کے اندر انہی خیالات کے زیر اثر بڑبڑانے لگا۔ اس کی ایک بہن تھی جو ایک نہایت پاک ضمیر لڑکی تھی۔ وہ جاگ رہی تھی۔ وہ اپنے بھائی کی آواز سنکر چونکتی ہوگئی اور دھیان سے سننے لگی۔ اس نے اپنی بڑبڑاہٹ میں کہا " ہاں ہاں میں چچا کو زہر دونگا۔ اس کو راہیے ملک عدم کرونگا جو دولت ہاتھ آئیگی۔ اس میں سے کچھ خرچ کر کے قتل کو چھپا لونگا"

بہن کی حیرت کی حد نہ رہی۔ وہ کچھ دنوں سے بھائی کو غیر معمولی اضطراب کی سی حالت میں دیکھتی تھی۔ آج اسکو پتہ لگ گیا۔ کہ اسکی کیا وجہ ہے۔ بہن کے دل میں ایک خیال اُٹھا کہ "چچا کی زندگی بچانا چاہیئے" بھائی کو وہ کچھ کہنا نہیں چاہتی تھی۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ لالچ سے اندھا ہو کر پہلے اسکو ہی ٹھکانے لگا دے اور پھر اپنے ناپاک ارادے میں کامیاب ہو۔ لڑکی ہر وقت اپنے بھائی کی حرکات و سکنات کی احتیاط سے نگرانی کرنے لگی۔ ایک دن اسکا چچا بیمار ہو گیا۔ لڑکے نے یہ موقعہ غنیمت جانا۔ اندر جا کر اپنے آپ سے کہنے لگا۔ "پاپ اور گناہ انسان کو پاگل بنا دیتے ہیں" ہاں بس یہ کافی ہوگا۔ موقعہ بھی اچھا ہاتھ لگا ہے۔ ہاں اب میں چلتا ہوں" لڑکا ایک پڑیا جیب میں ڈال کر اس اپنے خیال کی تکمیل کے لئے اپنے چچا کی زندگی پر ہاتھ صاف کرنے کو روانہ ہوا۔ بہن نے بھی یہ الفاظ سُن لئے وہ بھی آنکھ بچا کر اس کے پیچھے پیچھے اپنے خیال کی تکمیل کے لئے

چل پڑی۔ لڑکے نے جاکر چچا سے کہا کہ میں ایک بڑی فوری اثر دکھلانے والی دوائی لایا ہوں۔ اور ایک گلاس میں گھول کر اپنے چچا کو پلانے لگا۔ لڑکی جھٹ اندر داخل ہوئی اور گلاس کو ہاتھ مار کر زمین پر گرا دیا۔ لڑکا کچھ تو گناہ کی آگ سے پہلے ہی جل چکا تھا۔ کچھ اس واقعہ کے ناز یبانہ سے اور کچھ آنے والی مذمت کے خیال سے ایسا متاثر ہوا کہ زمین پر بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اور پھر نہ اٹھ سکا۔ اس آدمی کو اپنی بھتیجی سے سارے واقعات سے آگاہی ہوئی۔ اس نے اپنی حیات میں ہی لڑکی کو وارث قرار دیکر سب جائیداد اس کے حوالے کر دی۔

یہ قصہ بڑا سبق آموز ہے اور خیال کی طاقت کو اس کے نتائج کو اچھی طرح سے واضح کرتا ہے۔ دیکھیئے لڑکے کے خیال بدلنے کیا صورت پکڑی اور اس کی کیا سزا اسے ملی۔ بخلاف اس کے لڑکی کے نیک خیالات نے کیا شکل اختیار کی اور اسکو کیا اجر ملا۔ اسی طرح سے دنیا میں ہر ایک خیال خیال کرنیوالے کیلئے نیک و بد نتائج پیدا کرتا ہے خیالات کی پاکیزگی انسان کی ترقی کا باعث بنتی ہے اور خیالات کی ناپاکی گراوٹ کا باعث بن جاتی ہے دل کے اندر ایک نیکی اور بدی کا پیمانہ لگا ہوا ہے۔ ایک نیک خیال کے دل میں آتے اس آلے کا پارہ چڑھ جاتا ہے اور ایک بد خیال کے آنے سے وہ پارہ نیچے کی طرف گر جاتا ہے۔

ہمارے بزرگ اس راز سے بخوبی واقف تھے اور ہمارے مذہبی پیشوا بھی خیال کی طاقت کو اچھی طرح سے سمجھتے تھے۔ اس لئے ہماری مذہبی کتب مقدسہ کے اندر جگہ جگہ یہ احکام ملتے ہیں۔ کہ انسان ہمیشہ اپنے خیالات پاکیزہ رکھے۔ خیالات کی پاکیزگی صحت جسمانی کے لئے بڑی لازمی ہے جسم کے اندر سب سے ضروری اور اہم کام خون کا دورہ ہے۔ دل پھیپھڑے وغیرہ جتنے اعضائے رئیسہ ہیں وہ خون کے بنانے اور اسکو صاف کرنے میں لگے رہتے ہیں جہاں خون کے اندر کوئی نقص آیا۔ اسی وقت کئی قسم کے امراض لاحق ہو جاتے ہیں اگر خون کا دورہ باقاعدہ رہے تو جسم تندرست رہتا ہے۔ خون کے دورہ میں اندازہ سے زیادہ تیزی ہوتی

جاہیئے۔ یہ سست رفتاری، مقررہ رفتار میں کمی ہونے سے جسم کمزور ہو جاتا ہے۔ اور تیزی ہونے سے خون میں زیادہ گرمی ہو جاتی ہے۔ زیادہ گرمی ہو جانے کی وجہ سے جسم میں جلن پیدا ہو جاتی ہے یہ علمِ طب کا ایک مسلّمہ اصول ہے۔ ماہرینِ علمِ طب نے تجربوں سے ثابت کیا ہے کہ جس وقت انسان کے اندر شہوت، غصّہ اور نفرت کے جذبات کام کر رہے ہوں۔ تو اس کا خون تیزی سے چکّر کھانے لگتا ہے۔ جس کی وجہ سے خون میں اُبال آتا ہے۔ اور جسم میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ کئی قسم کی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ اس لئے لازمی ہے کہ خون کے دورہ کو باقاعدہ رکھا جائے۔ اور کوئی ایسی حالت پیدا نہ ہونے دی جائے۔ کہ جس سے اس میں کمی یا بیشی واقع ہو۔ اچھے یا بُرے خیالات کا اثر دل پر پڑتا ہے۔ دل کی حرکت کا اثر خون پر پڑتا ہے اگر خیالات نیک ہونگے تو دل سکون اور شانتی میں رہ کر خون کے دورہ کو باقاعدہ رکھے گا۔ لیکن ناپاک خیالات کے آتے ہی نفرت، غصّہ اور کمینہ پن کے جذبات دل کے اندر عود کریں گے۔ جس کی وجہ سے دل کی دھڑکن تیز ہو جائے گی اور اسی تناسب سے خون کے دورہ کے اندر تیزی آجائے گی۔ جس کے نتائج بد اوپر عرض ہو چکے ہیں لہٰذا صحتِ جسمانی کو درست رکھنے کے لئے بھی خیالات میں پاکیزگی رکھنا نہ صرف مفید بلکہ ضروری اور لازمی ہے۔

خیالات کی پاکیزگی درازیٔ عمر کا بھی ذریعہ ہوتی ہے۔ یہ کسی اور جگہ بھی عرض ہوا ہے کہ عمر کا تعلق سانسوں سے ہوتا ہے جسقدر آہستہ آہستہ سانس کی رفتار ہو گی اسی قدر عمر لمبی ہو گی اور جسقدر سانسوں میں تیزی ہو گی اتنی ہی عمر میں کمی ہو گی۔ سانس آہستہ آہستہ تبھی چلتا ہے اگر خون کا دورہ تیز نہ ہو۔ اس کا انحصار خیالات کی پاکیزگی پر ہوتا ہے۔ لہٰذا درازیٔ عمر کے لئے بھی خیالات کو پاکیزہ رکھنا نہایت لازمی ہے۔ اس بات کو جتلانے کے لئے کہ سانس کی آہستگیٔ رفتار سے عمر کا تعلق ہے نقشۂ ذیل کا ملاحظہ خالی از لطف نہ ہو گا:۔

نمبر شمار	نام جاندار	تعداد سانس فی منٹ	اوسط عمر سال
۱	خرگوش	۳۸	۸
۲	کبوتر	۳۶	۸
۳	بندر	۳۲	۱۲
۴	کتا	۲۹	۱۴
۵	بکرا	۲۴	۲۳
۶	گھوڑا	۱۹	۵۰
۷	انسان	۱۶	۱۰۰
۸	ہاتھی	۱۲	۱۱۰
۹	سانپ	۸	۱۲۰
۱۰	کچھوا	۵	۱۵۰

پچھلے دنوں رسالہ "پریت لڑی" میں ایک بزرگ کا حال شائع ہوا جو ہندوستان کا سب سے لمبی عمر والا انسان سمجھا گیا تھا۔ اس کا نام چوہدری پرمانند ذات راجپوت ساکن پنڈوری خورد تحصیل پسرور ضلع سیالکوٹ تھا۔ اسکی عمر ایک سو چالیس برس کی تھی۔ اس کے چار بیٹے تھے سب سے چھوٹا لڑکا چالیس سال کا تھا یعنی وہ چوہدری صاحب کی سو سال کی عمر میں پیدا ہوا تھا چوہدری صاحب کی دوسری بیوی بھی ضعیف ہو کر کام کاج سے عاجز ہو چکی تھی جب اس بزرگ سے اسکی درازئ عمر کے اسباب پوچھے گئے تو اس نے بتایا کہ

۱۔ میں نے ہمیشہ صبح کو چھاچھ اور مکھن کا استعمال کیا۔ اور شام کو عام طور پر ماش کی دال سے روٹی کھائی۔

۲۔ گوشت بہت کم کھایا۔

۳۔ بغیر بھوک کے کبھی کھانا نہیں کھایا۔

۴ - اپنے کھیتوں کا چکر لگانا روزانہ معمول تھا جو کہ قریب چار میل کا سفر ہو جاتا تھا
۵ - نہ میں کبھی بیکار رہا ہوں - نہ جسم کو نقصان اور تکلیف پہنچا کر کام کیا ہے -
۶ - سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میں نے کبھی غصہ، کینہ اور حسد کو دل میں جگہ نہیں دی -
اس زندہ مثال سے آپ اچھی طرح سے سمجھ سکتے ہیں کہ درحقیقت خیالات کی پاکیزگی انسان کی صحت اور لمبی عمر کا باعث ہوتی ہے -

سب لوگ خوشی کے طالب ہیں - وہ چاہتے ہیں کہ وہ ہر وقت خوش رہیں - ان کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی نسخہ نہیں کہ وہ اپنے خیالات کو پاک رکھیں -

انسان کا چہرہ اس کے دل کا عکس ہوتا ہے - خدا پرست اور خدا کا خوف رکھنے والے انسانوں کے چہرے پر کیوں جلال اور مسکراہٹ ہوتی ہے ؟ اس لئے کہ ان کے دل میں پوترتا اور شانتی ہوتی ہے اور اسی کا عکس ان کے چہرے پر نمایاں ہوتا ہے جو لوگ خوشی حاصل کرنے کیلئے ہزار ہا کوششیں کرتے ہیں - زر و مال لٹاتے ہیں - کلبوں میں جاتے ہیں سینما تھیٹر اور دیگر کھیل تماشے دیکھتے ہیں وہ اس سہل اور سستے نسخے کا استعمال فرمائیں - اگر دلی مراد پوری نہ ہو - تو میرا ذمہ - مشکل یہ ہے کہ بغض و حسد کے خیالات تو اپنے دل میں جاگزیں رہتے ہیں اور پھر شکایت ہوتی ہے کہ دنیا دکھوں کا گھر ہے - یہ دنیا نہ دکھوں کا گھر ہے نہ سکھوں کا - نہ یہ دوزخ ہے نہ جنت - یہ انسان کے خیالات ہی ہیں جو کہ اسکو دوزخ کی بھٹی بھی بنا دیتے ہیں اور بہشت کی تفریح گاہ بھی ؎

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنم دنیا وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

حقیقت یہ ہے کہ جس انسان کے اپنے خیالات نیک ہیں - اسکو سب ہی لوگ اچھے دکھائی دیتے ہیں - اور ہر ایک چیز سے وہ خوشی حاصل کر سکتا ہے لیکن جس کے خیالات فاسد ہیں اُسے سب کچھ ہی ایسا دکھائی دیتا ہے ؎

ہے بُرا تُو ہی نظر آیا اگر تجھکو بُرا تُو ہی اچھا ہے تجھے معلوم گر اچھا ہُوا

اس دنیا کے اندر اپنے ہی دل کے خیالات کا نقشہ کھچ جاتا ہے۔ اپنے وچاروں کا ہی فوٹو اُترتا ہے۔ دنیا بجائے خود نہ بُری ہے نہ اچھی۔ جو اس کو جس خیال سے دیکھیگا ویسی ہی نظر آئیگی ؂

بُرے کو سب بُرا اچھے کو سب اچھا ہے دنیا میں اس آئینہ میں جو جیسا ہے ویسا عکس اُترتا ہے

ایک اور ذریعہ خوشی حاصل کرنے کا زیادہ دوست بنانا ہے۔ دوستوں سے بھی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ جتنے انسان کے دوست زیادہ ہونگے اتنی ہی زیادہ خوشی ہوگی۔ فردوسی نے بھی تو کہا ہے کہ ع تُو تا خاک بابی ہمہ دوست دار

ترجمہ:۔ اے انسان! جب تک تو زندہ ہے سب کو اپنا دوست بنا تا جا!

دوست کیسے بن سکتے ہیں؟ اپنے خیالات سے ؂

میں نے پوچھا کہ چاہتے ہو مجھے سُن کے وہ بولے یوں اُدھر دیکھو
مجھ کو تم چاہتے ہو کتنا کچھ اپنی چھاتی پہ ہاتھ دھر دیکھو

یہی کسوٹی ہے اگر دوستوں کی تعداد بڑھا کر اپنی خوشی میں اضافہ کرنا منظور ہو تو اپنے خیالات کی لہر کی رَو کو نیکی کی طرف لگانا چاہیئے۔ غیریت۔ نفرت۔ دُوئی کے خیالات دوستوں کی تعداد کو کم کرتے ہیں۔ اسی لئے خوشی بھی اسی تناسب سے کم ہوتی ہے۔ ہمارے دل کے خیالات کیسے ہونے چاہئیں ؂

ایک خالق کے بشر سب ایک ہونے چاہئیں ایک والد کے پسر سب ایک ہونے چاہئیں
دو نہیں اہلِ نظر سب ایک ہونے چاہئیں ہند کے نورِ نظر سب ایک ہونے چاہئیں
ایک ہو جائیں تو خود ہی ایک اپنا ہو گیا خیال یہ چھوڑا ہے جب سے بخت اپنا سو گیا

ہر لحاظ سے نیک خیالات کا رکھنا لازمی ہے کسان جو کہ اچھی پیدا وار کا خواہشمند ہوتا ہے وہ دو باتوں کی خاص احتیاط رکھتا ہے ایک تو زمین اچھی طرح سے

طیار ہو۔ دوسرے بیج اچھے سے اچھا بویا جائے اگر دو تو باتیں ہیں۔ اور پھر پانی بھی وقت پر مل جائے۔ تو پیداوار اعلیٰ درجہ کی اور بہتات سے ہوتی ہے۔ جو اوّل تو کسان کی خوشی کا باعث بنتی ہے اور دوسرے اسکی تمام ضروریات کو پورا کرتی ہے۔

انسانی زندگی بھی ایک کھیتی ہے۔ کسان کی طرح ہر ایک انسان بھی اپنی زندگی کے درخت کے میٹھے پھل اور اچھی پیداوار حاصل کرنے کا طلبگار ہے لیکن اس کیلئے نہ تو اچھی زمین تیار کرتا ہے اور نہ اچھا بیج بوتا ہے۔ اس کھیتی کی زمین ہے انسان کا دل اور اسکے اندر بیج بویا جاتا ہے خیالات کا۔ اگر دل کو اچھی طرح سے طیار کر لیا جائے۔ (جسکے متعلق ایک علیحدہ باب میں عرض کیا گیا ہے) اور اس میں نہایت پاکیزہ خیالات کا بیج بو یا جائے اور پھر عبادتِ الٰہی اور محبت انسانی کا پانی دیا جائے تو اس میں نیک اعمال کے ایسے خوبصورت شیریں اور خوش ذائقہ پھل آئیں گے۔ کہ جسکے لُطف سے پہلے تو اسی دنیا میں انسان مسرت حاصل کریگا۔ اور پھر عاقبت میں اسکے نزدیک کوئی دُکھ یا رنج نہیں آئیگا۔ بلکہ وہ ان مقامات اور درجات کے حاصل کرنے کا مستحق ہوگا۔ کہ جو مالک کونین نے اپنے پیارے بندوں کے لئے مخصوص کئے ہوئے ہیں۔

کوئی عمارت مضبوط نہیں کہی جا سکتی۔ کوئی درخت دیر تک کھڑا نہیں رہ سکتا۔ اگر اس کی بنیاد یا جڑ کمزور ہو۔ اگر بنیاد پکی ہو۔ تو عمارت بھی قائم رہ سکتی ہے جڑ مضبوط ہو تو درخت بھی ہوا کے جھونکوں سے گر نہیں سکتا۔ اسی طرح انسانی زندگی کی بناء اور اس درخت کی جڑ انسان کے خیالات ہیں اگر خیالات نیک ہیں۔ تو زندگی کی عمارت پختہ ہوگی اور زندگی کا درخت اپنی جگہ پر مضبوطی سے قائم ہوگا۔ دنیاوی جھکولے اس پر کچھ اثر نہیں کرینگے۔ وہ اس زندگی کی کشمکش میں ڈانواں ڈول نہیں ہوگا۔ مخالف واقعات کو دیکھ کر ایک معمولی انسان گھبرا اُٹھتا ہے اُنکو دُکھ اور مصیبت کا نام دیکر واویلا کرنے لگتا ہے مگر ایک نیک خیال انسان کو جب اس قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔ تو وہ

انہیں اپنے مالک کا کھیل سمجھ کر اپنے لئے ایک امتحان اور آزمائش خیال کرتا ہے۔ اپنی نیکدلی اور نیک خیالی کے ذریعہ اس آزمائش میں پورا اُترتا ہے۔ نہ صرف ان حادثات کو بغیر تکلیف ماننے کے گذار دیتا ہے۔ بلکہ اُن کے اندر بھی ایک راز دیکھتا ہے اور اُن سے سبق حاصل کرتا ہے۔ کسی ہندی کوی نے کہا ہے ؎

بھلو بُرو جو آت ہے کاٹ لیت ہیں دوئے
گیانی کاٹے ہنس کر اگیانی کاٹے روئے

یعنی تکلیف کا زمانہ ہر ایک آدمی پر آتا ہے اور گذر بھی جاتا ہے لیکن دانا اسے ہنس کر گذار لیتا ہے اور نادان رو پیٹ کر نکالتا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ تکالیف کے وقت میں خوش رہنے کی کوشش تو کی جاتی ہے لیکن پھر بھی دُکھ دبا لیتا ہے۔ اس کی وجہ نیک خیالات کی کمی ہے اگر نیک خیالات کے بہتے ہوئے پانی سے دل ہمیشہ دُھلا ہوا ہے۔ تو یہ گرد اس پر جم نہیں سکتی جب ایسی صورت ہو تو نیک خیالات کی رَو کو اور بڑھانا چاہیئے۔ نیک خیالات کے رہنے سے انسان کی عقل ٹھیک ٹھیک رہبری کرتی ہے۔ اور نیک و بد کی تمیز بتاتی ہے۔ جب سیات کا پورا پورا علم انسان کے دل میں ہو جائے۔ تو کیسا بھی وقت آ پڑے وہ اپنا فرض نہیں بھول سکتا۔ اور اس وقت کو نہایت خوش اسلوبی سے شانتی کے ساتھ سکونِ دل سے نکال لیگا۔ لیکن یہ سب کچھ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب انسان کے دل میں ہمیشہ نیک ہی خیالات جاگزیں رہیں ایسی حالت اپنے لئے حاصل کرنے کے واسطے وقتاً فوقتاً اپنی پڑتال خود کرنا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ میرا تعلق نیک خیالی[1] سے کہاں تک قائم ہو چکا ہے کس حد تک کمی ہے کہیں میں کسی کے لئے بُرا تو نہیں سوچتا کبھی سے بُرائی کیلئے میرا دھیان تو نہیں جاتا کسی کو نقصان پہنچانے کیلئے کوئی جذبہ تو دل میں نہیں اُٹھتی۔ اگر نہیں تو سمجھنا چاہیئے کہ خوش قسمتی میں کوئی شک نہیں لیکن اگر بغض و عناد دشمنی اور نفرت و غیرت کے خیالات اُٹھتے ہیں تو علی الصبح اُٹھ کر اپنے مالک سے اس قسم کی دعا مانگنی چاہیئے۔ یہ دُعا پوری عقیدت اور اعتقاد سے روز جاری رکھی جائے جب تک کہ پورے

[1] خیال۔

طور پر ھڑا دیر نہ آئے۔

"اے میرے مولیٰ! تیری قدرت کے اندر ہر ایک چیز خوش ہے ہر ایک چیز دوسرے کا بھلا کرنے کیلئے بنی ہے۔ تیری قدرت کی ایک بھی چیز نہیں جو صرف اپنی ہی غرض پوری کرنے کیلئے بنی ہو۔ میں بھی تیری کائنات کی ایک حقیر ناچیز ہستی ہوں۔ مجھے بھی اپنی قدرت کی دیگر چیزوں کا سا بنا دے۔ میں بھی سدا خوشی سے سرشار رہوں۔ ہمیشہ دوسروں کی بہتری اور بھلائی کے خیالات اپنے دل میں رکھوں۔ جو خیالات کبھی کبھی ایسے آتے ہیں کہ جن کا مقصد خود غرضی۔ انتقام ضرر رسانی۔ دل آزاری ہوتا ہے ان کو میرے دل سے نکال دے۔ میں پاکیزگی کا پتلا بننا چاہتا ہوں میں ایک بھی ناپاک خیال دل میں رکھنا نہیں چاہتا میں چاہتا ہوں کہ میرا جسم میرا مال میرا دل تیرے احکام کے مطابق تیرے بندوں کی خدمت کیلئے وقف ہو جائے میرے دل میں ہمیشہ ہی نیک خیالات جاگزیں رہیں میں کوشش کرتا ہوں کہ ناپاک خیالات میرے نزدیک نہ آئیں لیکن پھر بھی وہ وقتاً فوقتاً اپنا حملہ کر ہی دیتے ہیں صرف تیری رحمت اور تیری عنایت سے میں اپنے اس ارادے میں کامیاب ہو سکتا ہوں۔ پاکیزگی کا چشمہ، پونرتا کا ماخذ طہارت کا منبع تو تو ہی ہے تجھی سے یہ چیزیں مل سکتی ہیں اسلئے میں تیرا سہارا ڈھونڈتا ہوں میری مدد فرما۔ اور میں سچے دل سے تیرے قدموں پر گر کر گڑ گڑا کر یہ التماس کرتا ہوں کہ میری اس مؤدبانہ التجا کو میری اس عاجزانہ گذارش کو شرف قبولیت عطا فرما اور ساری ناپاکی، گندگی اور آلائش کو دور کر کے مجھے نیک خیال اور پاکیزگی کا مجسمہ بنا دے۔"

اس طرح سے باقاعدہ مالک حقیقی کی جناب میں التجا کرنے سے دلی مدعا حاصل ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اپنی روزانہ زندگی میں قدم قدم پر نگاہ ڈالتے رہنا واجب ہے کہ کہیں سے بد خیالات کا حملہ نہ ہو جائے صحبت کا خاص طور پر خیال رکھنا لازم ہے ؎

صحبت صالح ترا صالح کند ۔ صحبت طالح ترا طالح کند

ترجمہ۔ اے بھائی نیک صحبت تم کو نیک بناتی ہے اور بد صحبت بد بناتی ہے۔

انسان کے خیالات صحبت سے اچھے یا برے بن جاتے ہیں صحبت سے ہی وہ نیک یا بد بن جاتا ہے ؎

انسان یہ بھلا ہے جو صحبت بھلی ملے   لیکن یہی بُرا ہے جو صحبت بُری ملے

کبیر صاحب نے بد صحبت سے بچنے کے لئے ایک معرکہ کی بات کہی ہے ؎

گر پئے پربت شکھر تے مرئیے دھرنی منجھار   سنگ بُرا نہ کیجئے بوڑو کالی دھار

ترجمہ:- پہاڑ سے گر کر مرنا۔ زمین میں دھنس کر مرنا اچھا۔ سمندر کی کالی دھار میں ڈوب کر مرنا بمقابلہ اس کے کہ انسان صحبت بد اختیار کرے۔

بُری صحبت کا اثر لازمی طور پڑتا ہے۔ زیادہ نہیں تو کچھ نہ کچھ تو ضروری اپنا رنگ دکھاتا ہے ؎

ہر کہ با دوناں نشیند ہمچوں دوناں دوں شود   ہر کہ با ابلاں نشیند عقل او افزوں شود

اسپ را با خر ببندی مدتے یکجا بہم   رنگ شاں ہمگوں نگردد خوئی شاں ہمگوں شود

ترجمہ:- جو کمینے آدمیوں کی صحبت میں بیٹھتا ہے وہ خود بھی کمینہ ہو جاتا ہے۔ جو نیک انسانوں کی صحبت اختیار کرتا ہے اس کی عقل تیز ہو جاتی ہے۔ اگر ایک گھوڑے کو گدھے کے پاس کافی عرصہ تک باندھا جائے تو وہ اگرچہ ہمرنگ نہ ہونگے لیکن ہم خو ضرور ہو جائینگے۔

ایک اور چیز جس کا خیالات پر براہ راست اثر پڑتا ہے خوراک ہے خوراک کے متعلق دو باتوں کا مدِّ نظر رکھنا ضروری ہے اول یہ کہ دھرم کی کمائی ہو۔ حلال کی روزی ہو۔ جسے پیدا جو مشقت سے کریں کمائیں کھائیں   لیں اپنی کمائی کے عوض نیک دعائیں

حلال کا لقمہ خیالات کی پاکیزگی میں کافی مدد دیتا ہے کہا ہے کہ جیسا اَن ویسا من یعنی جیسا کھائیں دل کے خیالات ویسے ہی ہونگے جیسی کہ خوراک۔ دوسری بات خوراک کے متعلق قابل ترجیح ہے کہ ایسی چیزیں نہ کھائی جائیں کہ جو جسم کے اندر زیادہ گرمی اور جوش پیدا کریں۔ یعنی زیادہ گرم مصالحہ یا چٹپٹی چیزیں کھانا نقصان دہ ہے گوشت کھانا بھی مفید نہیں لیکن اگر کسی کو گوشت کھانا ضروری خیال کیا جائے تو اسکے اثرات کو زائل کرنے کیلئے بہت زیادہ عبادت و ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بنگال میں ایک سومنگ سوامی ہوئے ہیں۔ وہ خدا رسیدہ بزرگ تھے لیکن گوشت کا استعمال بھی

کرتے تھے وہ یہی کہا کرتے تھے۔ کہ اس کے اثر کو بڑی زبردست عبادت سے ہٹانا چاہیئے
چونکہ ہر ایک آدمی اتنی زبردست ریاضت نہیں کرسکتا۔ اس لئے گوشت خوری بھی جسم کے
اندر گرمی پیدا کر کے سکونِ دل میں ہلچل مچا کر نیک خیالی کے رستہ میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے
لاہور کے بہت سے ماہر ڈاکٹر صاحبان نے ایک مشترکہ بیان اخبار "ٹربیون" لاہور
مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۳۸ء کو نکالا تھا۔ کہ ہماری متفقہ رائے ہے کہ :-

(الف) خوراک میں گوشت، انڈے اور مچھلی جس قدر ممکن ہوسکے کم کئے جائیں۔

(ب) صبح کے وقت ایک گلاس دودھ یا لسی کا پیا جائے۔

(ج) حتی المقدور چائے سے پرہیز کیا جائے

(د) ایریٹڈ واٹر یعنی لیمن سوڈا کا استعمال جہاں تک ممکن ہوسکے کم کیا جائے۔

(ہ) بازار کا دودھ اور بازار کی مٹھائیوں سے پرہیز کیا جائے سکولوں اور کالجوں
کے منتظمان کو اس بارہ میں خاص احتیاط کرنا چاہیئے۔

(و) بسیار خوری ہر حالت میں ممنوع ہے ایک وقت میں بہت سی چیزیں کھانے میں
شامل نہ کی جائیں۔ کیونکہ اس سے خواہ مخواہ زیادہ خوری ہوجاتی ہے۔ آج کل جس
قسم کے دعوتی کھانے دیئے جاتے ہیں۔ وہ صحت کے لئے نہایت مضر ہیں۔

زیادہ کھانے سے ہر حالت میں پرہیز لازمی ہے۔ اس سے صحت پر اور خیالات پر
برا اثر پڑتا ہے۔ لیکن ہمارا تو یہ حال ہے کہ ؎

جان بھی جائے گر خرابی سے ہاتھ اٹھے گا نہ اس رکابی سے

کرنا کیا چاہیئے۔ اس کے متعلق حالی صاحب فرماتے ہیں کہ ؎

کھانے تو بہت میسر آئے ہیں ہمیں جو دیکھ کے حکیم کے کھائے ہیں ہمیں
سب سے لذیذ تھے وہ کھانے اے بھوک جو تو نے کبھی کبھی کھلائے ہیں ہمیں

بھگوت گیتا کے چھٹے ادھیائے میں آتا ہے کہ نہ تو زیادہ کھانے سے ہی بہتری ہوتی ہے اور

نہ ہی بہت کم کھانے سے۔ اندازہ سے کھانا پینا ہی بہبودی کا باعث ہوتا ہے ؎

باندازہ خور زاد اگر آدمی | چنیں پُرشکم آدمی یا خُمی
نہ دارند تن پروراں آگہی | کہ پُر معدہ باشد زحکمت تہی
دو چشم و شکم پُر نہ گردند ہیچ | تہی بہتر ایں رودہ پیچ پیچ

ترجمہ:۔ انسان اگر کھانے کے اندازے پر چلے تو ایسا آدمی آدمی ہے۔ مگر جو پیٹ بھرنے میں لگا رہے وہ آدمی نہیں بلکہ مٹکا ہے۔ محض جسم کا خیال رکھنے والوں کو اس بات کی خبر نہیں کہ معدہ ٹھونس لینے سے عقل باقی نہیں رہتی۔ آنکھ اور پیٹ کبھی بھرتے نہیں پیچیدار انتڑیاں خالی رکھنی ہی اچھی ہیں۔

جو انسان خود اپنی بہتری کے لئے کمربستہ ہو جاتا ہے۔ خود نیک خیال بننے کا ارادہ باندھ لیتا ہے اس کی قدرت بھی مدد کرتی ہے۔ قدرت کے اندر کرہ ہوائی میں جو بھی لفظ بولا گیا ہے۔ یا جو بھی خیال کسی انسان کے دل میں آتا ہے موجود ہے۔ لیکن ہمارے اردگرد ہر طرف ہر قسم کے خیالات موجود ہیں۔ دنیا میں ہر قسم کے خیالات کے آدمی ہیں۔ جنہوں نے نیک خیالات اپنے دل میں رکھے ہیں انکے وہ نیک خیالات بھی اور جنہوں نے بدخیالات رکھے ہیں۔ ان کے بدخیالات بھی کرہ ہوائی میں موجود ہیں۔ انسان کا دل انکو حاصل کرنے کیلئے ریڈیو (ریسیونگ سٹ) کا کام دیتا ہے۔ جیسے ریڈیو کے ڈائل پر مختلف جگہ سوئی گھمانے سے وہ مختلف مقامات کے بولے ہوئے الفاظ کی گرفت کر لیتا ہے اُسی طرح انسان کا دل بھی خیال کی سُوئی کو مختلف جگہ پر رکھنے سے مختلف قسم کے خیالات کی گرفت کر لیتا ہے خیالات کا ذخیرہ تو جیسا دیدہ عرض ہوا ہمارے گرد وپیش بے اندازہ مقدار میں موجود ہے جس وقت انسان اپنے خیال کی سوئی نیک خیالی کے مقام پر کر لیتا ہے تو اسوقت نیک خیالات کی لہر اسکے اندر کرہ ہوائی سے آنا شروع ہو جاتی ہے اور اس طرح سے اسکی نیک خیالی کو ترقی دینے کیلئے مددگار رہتی ہے۔ برخلاف اسکے جس وقت انسان اس سُوئی کو بدخیالی کے مقام پر گھما دیتا ہے تو بدخیالات کی آمد شروع

ہو جاتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں کرہ ہوائی کے اندر بدخیالات پیش پیش ہیں اس لئے ان کی رو بڑے شدّ ومد سے آتی ہے۔ اندریں حالات لازم یہ ہے کہ انسان اپنے دل کی سوئی کو بدخیالی کے مقام پر ہرگز نہ جانے دے۔ وہ سوئی بڑی تیز اور لرزاں ہے۔ جیسے قطب نما کی سوئی کا رُخ شمال کی طرف رہتا ہے اُسی طرح فطرتی طور پر دل کی سوئی کا میلان بدخیالی کی طرف رہتا ہے۔ انسان کوشش کرے کہ یہ اُدھر سے باز رہے تاکہ اسکا رُخ ہمیشہ نیک خیالی کے مقام کی طرف رہے ایسا کرنے سے قدرت بھی مدد کرتی ہے اور آخر کار اس سوئی کا لرزنا اور اسکی تیزی ختم ہو جاتی ہے اور وہ بالکل ساکن ہو کر نیک خیالی کے مقام پر ٹھہر جاتی ہے پھر انسان اپنی زندگی کے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے کیونکہ کرۂ ہوائی سے نیک خیالات ہی اُسے ملتے ہیں۔

خیالات کے اثرات کے متعلق ہمارے بزرگوں نے بڑی چھان بین کر کے اپنے تجربات کو قلمبند کیا ہے۔ ہر ایک خیال خواہ چھوٹا ہو۔ خواہ بڑا۔ اپنی نوعیت کے لحاظ سے مختلف اثر رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ مختلف قسم کی چیزوں کا مختلف قسم کے رنگوں کا خیال کرنے سے مختلف قسم کا اثر پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً :۔

الف۔ پیلے یا زرد رنگ کا دھیان کرتے رہنے سے انسان کی عقل میں ترقی ہوتی ہے

(ب) نیلے رنگ کا دھیان کرنے سے طمانیت اور صحت بڑھتی ہے۔

(ج) ہرے یا سبز رنگ کا دھیان کرنے سے زر و مال کی ترقی کے سامان پیدا کرنے کے لئے اچھے اچھے ذرائع سوجھتے ہیں۔

(د) سُرخ رنگ کا دھیان کرنے سے طبیعت میں تیزی اور جوش پیدا ہوتا ہے

اس بات کا تجربہ کہ مختلف چیزوں کا خیال کرنے سے مختلف قسم کے خیالات پیدا ہوتے ہیں اس بات سے کر لینا چاہیئے کہ آپ نے کسی آجکل کے اپٹوڈیٹ فیشنیبل جنٹلمین کے کمرہ میں صنفِ نازک کی تصویروں کو دیکھا ہے اور ایک پرانی قسم کے سادھارن آدمی کے گھر میں نیک انسانوں کی تصویروں کا ملاحظہ کیا ہے۔ اب ایک وقت میں

آپ کو ایک کمرہ کی یاد آتی ہے اور دوسرے وقت میں دوسرے کی۔ تو غور کیجیے کہ ہر دو حالتوں میں کتنا فرق ہے۔ اس لئے حتی الوسع بُرے نظارے۔ بُری تصویریں بُرے کھیل تماشے دیکھنے سے باز رہنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ سب نیک خیالی کے مخالف اور دشمن ہیں۔ گھر کے اندر کہیں فحش تصویریں نہ لگانا چاہئیں۔ برخلاف اس کے نیک آدمیوں کی نیک بزرگوں کی تصویریں ضرور لگانا چاہئیں۔ خاصکر وہاں کہ جس جگہ انسان بیٹھ کر عبادت یا پُوجا کرتا ہو یا سوتا ہو۔ گھر میں اچھی تصویروں کی کتابیں رکھنا چاہئیں جن کو بچے دیکھیں اور شروع سے ہی ان کے اندر نیک خیالی کے جذبات پیدا ہوں۔ اچھے اچھے مقولے کتبوں پر پینسل کر کے لٹکانے چاہئیں۔

تھیٹر اور سینما کے کھیل بلاشبہ بدخیالی کا منبع ہیں اور نیک خیالی کے سخت دشمن۔ انگلستان کے مشہور مصنف مسٹر ایچ مور لکھتے ہیں "کہ مجھے اس بات کے کہنے میں ذرہ بھر بھی دریغ نہیں۔ کہ تھیٹر وغیرہ انسانی تباہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ گو وہ دل کو لبھانے والے ہوتے ہیں۔ لیکن جتنا زیادہ دل کو لبھاتے ہیں۔ اتنے ہی زیادہ خطرناک ہیں۔ بائبل دنیا کے اندر ہر جگہ موجود ہے۔ لیکن تھیٹروں کے اندر تو اس کا سکّہ ہے۔ ایک تھیٹر کے ناٹک کی کتاب کا اور انجیل مقدس کا اتنا ہی فرق ہے کہ جتنا اندھیرے اور روشنی کا۔ اگر کوئی آدمی کسی طرح سے ناٹک کی کتاب کو اچھا کہنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو اسے ایک دم انجیل مقدس کو رد کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ یہ دونوں متضاد چیزیں ہیں"

کیسے صریح اور زوردار الفاظ میں ان بدخیالی کے اڈوں کی مذمت کی گئی ہے کاش کہ میرے تھیٹر اور سینما کے شوقین بھائی ان الفاظ کو پڑھ کر ان پر پورا پورا دھیان دیں اور ان بداخلاقی کے اڈوں سے پرہیز کریں۔

مغربی فلاسفروں اور مصنفوں نے "خیالات" کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ بڑی معنی خیز باتیں ہیں۔ ان کا بھی ملاحظہ فرمایئے:-

ا۔ سکاٹ لینڈ کے بیسویں صدی کے مصنف جی میکڈ انلڈ لکھتے ہیں کہ تمہاری زندگی کا لطف تمہارے خیالات کی نوعیت پر منحصر ہے اس لئے خبردار رہو۔ اور دھیان رکھو کہ وہ خیالات جو نیکی اور معقولیت کے منافی ہوں۔ تمہارے دل میں جگہ نہ پائیں۔

۲۔ انگلستان کا مشہور پادری سیلی پوٹس لکھتا ہے کہ بدخیالات شیروں اور بھیڑیوں سے بھی بڑھکر خونخوار ہوتے ہیں۔ انسان درندوں سے تو بچ کر بھی نکل سکتا ہے لیکن خیالاتِ بد سے پہلو نہیں بچا سکتا۔ البتہ بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ جیسے پیالے کے لبریز ہونے پر اس میں اور گنجائش نہیں رہتی۔ اسی طرح اپنے دل کے جام کو نیک خیالات سے بھر لو تاکہ اس میں بدخیالات کو داخل ہونے کی گنجائش ہی نہ رہے۔ لوگ بداعمالی کی زیادہ مذمت کرتے ہیں۔ لیکن اس کی اصلی عِلّت اور اسکے خاص سبب کے خلاف جس سے طبیعت میں اسکا بیج بویا جاتا ہے کوئی زوردار آواز نہیں اٹھاتے۔ یعنی بدخیالات کے خلاف۔

۳۔ انگلستان کے ایک اور انیسویں صدی کے پادری لکھتے ہیں کہ نیک خیالات تمہارے بڑے معزز اور قابلِ قدر مہمان ہیں ان کا دل سے خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ ان کی خوب آؤ بھگت اور تواضع کرنا چاہیئے۔ اور ان کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لانا چاہیئے۔ کیونکہ یہ گلاب کے پھول کی پنکھڑیوں کی طرح اگر اپنے دماغ کے کوزے میں رکھ لئے جائیں۔ تو بڑی بھینی بھینی خوشبو دیتے رہتے ہیں۔

۴۔ انیسویں صدی کا سکاٹ لینڈ کا شاعر چارلس میکے لکھتا ہے کہ تیر ہوا میں سے گذرتا ہوا شاید اپنا نشان نہ چھوڑ جاتا ہو۔ لیکن ایک بدخیال اپنا نشان اسی طرح سے چھوڑ جاتا ہے جیسا کہ سانپ اپنی لکیر۔

گیتا کے دوسرے ادھیائے میں بھگوان کرشن نے اس سلسلہ کو جس سے کہ ایک بدخیال انسانی تباہی کا باعث بنتا ہے اسی طرح سے بیان فرمایا ہے۔ "انسان بدخیالات کو اپنے اندر پیدا کرکے دنیا کی لذّت میں پھنس جاتا ہے۔ لذات خواہشات کو بڑھاتی ہیں خواہشات

کے پورا نہ ہونے پر غصّہ پیدا ہو جاتا ہے۔ غصّہ کی حالت میں انسان بھلے بُرے میں تمیز نہیں کر سکتا۔ اور اس صورت میں انسان کو سب پڑھے اور سُنے ہوئے پاک کلام اور نیک احکام بھول جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اس کی عقل ماری جاتی ہے اور عقل کے مارے جانے سے انسان تباہی کے گڑھے میں گر جاتا ہے۔

بدخیالی کے بد اثرات اس سے بخوبی واضح ہوتے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ انسان کی گمراہی، ذلت، خواری، گراوٹ اور تباہی کی بنیاد خیالات کے ذریعہ ہی پڑتی ہے کبیر صاحب نے ایک موقعہ پر کیا اچھا کہا ہے:" کہ میں بد انسان کے ساتھ تو جو سلوک کرونگا وہ بعد میں دیکھا جائیگا۔ لیکن اس کی ماں کو فوراً ہلاک کر دونگا تاکہ وہ کوئی اور اس قسم کا ظالم اور بد آدمی دنیا میں پیدا نہ کرے"۔ مطلب یہ ہے کہ بدی کی جڑ کو اکھاڑ پھینکنا چاہیئے۔ بدی کی ماں کی طرح بدی کی جڑ بدخیالات ہوتے ہیں۔ انکو کلیتہً نکال دینے سے ساری خرابی خود بخود رُک جاتی ہے۔ پانی کے بہاؤ کو درمیان سے بند کرنے کی بجائے اس کے نکاس پر روکنا چاہیئے۔ انگریزی زبان میں ایک کتاب ہے رائٹ تھنکنگ (RIGHT THINKING) اس کے اندر خیالات کی فلاسفی کو نہایت خوبصورت اور دلپذیر طریق سے بیان کیا گیا ہے اس میں سے چند ایک اقتباسات یہاں عرض کئے جاتے ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ:-

" ہر ایک انسان کی بیرونی زندگی یا دنیاوی زندگی اس کی اندر کی حالت کا ایک عکس ہے۔ مثلاً اگر ایک انسان ہر وقت بیماری، ناکامی اور مفلسی کا خیال کرتا ہے تو لازمی ہے کہ یہ کمزوریاں اس کے اندر ظاہر ہونگی۔ لیکن برخلاف اسکے اگر وہ صحت، کامیابی، خوشی، کثرت اور ترقی کے خیالات دل میں رکھتا ہے۔ تو انہی اوصافِ حسنہ کا وجود اسکے اندر ہوگا۔

" انسان کے زیادہ تر رنج و غم۔ دُکھ اور آلام اُس کے خیالات کا اور اپنے اندر کی سچائی کے ساتھ یکسانیت نہ پیدا کرنے کا نتیجہ ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے لئے بہبودی کی راہ نہیں

نکال سکتا ہے جب تک اندر گڑبڑ رہے گی تب تک بیرونی زندگی میں گڑبڑ لازمی طور پر واقع ہوتی رہے گی لیکن جونہی اندرونی خیالات اور خواہشات میں تبدیلی کر لی جائے گی یعنی ان کی حقیقی جذبات کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کر لی جائے گی۔ ویسے ہی بیرونی زندگی میں نمایاں تغیر آ جائے گا۔ اور انتشار طبع کی بجائے ایک پاکیزہ یکرنگی پیدا ہو جائے گی۔"

" بد خیالات کے اثر سے انسان کے اوصاف نیک مرض رنج ستارہ رگی کنگالی اور مصیبت کی شکل میں تبدیل ہو جاتے ہیں لیکن اگر وہ اپنے مولیٰ کریم اپنے دیا نتدار پروردگار کی طرح سب کی بھلائی کے خیالات کو دل میں جگہ دیتا ہے تو اس کی ساری کمزوریاں اور سارے نقائص خود بخود رفع ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی جگہ مسرت صحت خوشحالی اور طمانیت کے جذبات آ لیتے ہیں اور اتنی خوشی حاصل ہوتی ہے جو احاطہ بیان سے باہر ہے۔

زندگی کے مصائب عام طور پر یہ ہیں۔ غربی۔ تفکرات۔ نادانی۔ بیماری۔ لڑائی۔ رنج وغم۔ دل میں طمانیت کا نہ ہونا۔ دلی خواہشات اور امیدوں کا پورا نہ ہونا وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام مصائب کا باعث صرف ایک ہی ہے یعنی حقیقت سے ناموافقت یا قانونِ قدرت سے مخالفت۔ کیونکہ حق اور اس کی قدرت یہ دونوں خود اور نیز جو کچھ اُن کی اپج ہے۔ وہ دوسروں کے لئے ہے۔ وہ نہ تو خود ہی اپنے لئے ہیں۔ نہ اُن سے پیدا شدہ چیزیں لیس جو انسان اس اصول کے برخلاف سوچتا ہے یا عمل کرتا ہے وہ قدرت کے سامنے ٹکر لیتا ہے۔ اور اسی وجہ سے خود ہی اپنے لئے مصائب و آلام کی پیشوائی کرتا ہے۔ لیکن جس وقت وہ اس اصولِ ازلی سے موافقت پیدا کر لیتا ہے۔ اور اس ہم آہنگی کی وجہ سے یہ کی ساری صعوبتیں تکلیفیں کلفتیں اور رنج وغم ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے۔

خیالات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اول خیالاتِ مثبت۔ دوم خیالات منفی مثلاً کامیابی ترقی اور بھلائی کے خیالات مثبت خیالات ہیں لیکن ناکامی نامرادی اور بدی کے خیالات منفی خیالات ہیں۔ خیالات مثبت زندگی کی عمارت کو اونچا کرتے ہیں اور خیالات

منفی خیالات اس کی جڑ کو کھوکھلا کرتے ہیں اور گراتے ہیں۔جن خیالات سے کچھ حاصل ہوتا ہے وہ ذیل کے نقشہ سے واضح ہوگا۔

مثبت خیالات	نتیجہ	منفی خیالات	نتیجہ
اُلفت	خوشی	نفرت	رنج
ہمدردی	سرور	تنگ نظری	غم
فراخدلی	فارغ البالی	غیر مینہ	سوزِ دل
بھلائی	صحت	تعصب	دلی خلش
خود اعتمادی	ترقی	کم حوصلگی	خوف
حوصلہ	بے خوفی	نکماپن	ناکامیابی
ہمت	کامیابی	نامرادی	تباہی

جو انسان جس جس چیز کو حاصل کرنے کی خواہش کرتا ہے اسی قسم کے خیالات اس پر غلبہ حاصل کرتے ہیں۔ اگر سچے دل سے ان خیالات کو پیدا کرنے کے لئے قدرت کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ تو نیک نتائج کا حاصل ہونا لازمی ہے۔ اس لئے نہایت ضروری ہے کہ ہم مضر نتائج پیدا کرنے والے ہر قسم کے بدخیالات کو نکال دیں۔ اور ان کو خیرباد کہیں۔ ان کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکیں اور نیک خیالات کو ہمیشہ اپنے دل میں جگہ دیں۔ تاکہ ہر قسم کی راحت، فارغ البالی خوشی اور کامیابی کی مسرتوں سے بہرہ ور ہو سکیں۔

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است تو بدیں آرزو مرا برساں

ترجمہ:۔ اے میرے مالک! یہ میری خواہش کیسی نیک ہے۔ تو اس میری مراد کو پورا کر۔ (آمین ثم آمین!)

اِنسان اور اُس کی خواہشات

دنیا کا تردّد تب تک تھا جبتک کہ ہم اسکے طالب تھے
پھری جو نظر غم ہو گئے کم رغبت نہ رہی دنیا نہ رہی

دنیا کے اندر انسان پر بہت سی چیزیں مصیبت لانے والی ہیں۔ لیکن وہ خود بخود متحرک نہیں ہوتیں۔ انسان اپنے آپ ان کو اپنی تکلیف کا باعث بناتا ہے۔ ان اسباب میں ایک بڑا سبب انسان کی خواہشات ہیں بھرتری ہری نے خواہشات کو آگ سے تشبیہ دی ہے یعنی جس طرح آگ ایندھن کے ڈالنے سے کبھی فرو نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح سے انسان کی خواہشات دنیاوی چیزوں کے مہیا کرنے سے کبھی پوری نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ وہ آگ کی طرح زیادہ بڑھتی ہیں۔ اور انسان کی تکلیف کا باعث بنتی ہیں ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے!

واقعی یہ خواہشات انسان کے لئے کبھی چین میسر نہیں ہونے دیتیں۔ چین یا آرام من کے سکون کی حالت ہوتی ہے۔ لیکن جہاں من کے اندر خواہشات کی لہریں اٹھتی ہوں۔ وہاں طمانیت کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔ ایک ہندی کوی نے کہا ہے ؎

ترشنا اگنی پرلے کی ترپت نہ کب ہوں ہوئے
سُر نر دھنی اور رنک سب بھسم کرت ہے سوئے

یعنی خواہشات کی آگ دوزخ کی آگ کی مانند ہوتی ہے اور کبھی سیر نہیں ہوتی جو کوئی بھی اس کی لپیٹ میں آجاتا ہے خواہ فرشتہ ہو۔ خواہ انسان۔ چھوٹا ہو یا بڑا یہ سب

کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے۔

دنیاوی خواہشات نہ صرف اس دنیا میں ہی انسان کیلئے بےچینی کے اسباب پیدا کرتی ہیں۔ بلکہ آنے والی زندگی کی راہ بھی روک دیتی ہیں۔ مشکل تو یہ ہے کہ انسان اپنے سامنے دیکھتا ہے کہ ہزاروں اس کے بھائی اسی تگ و دو میں لگے ہوئے اس دنیا سے چل دئیے اور آخر دم تک ان کی ساری خواہشات کبھی پوری نہ ہوئیں لیکن پھر بھی وہ اس سے عبرت حاصل نہیں کرتا ہے ؎

خواہشیں دنیا کی بار دوش گردن ہوگئیں — رفتہ رفتہ منزل عقبےٰ کی رہزن ہوگئیں
چل سوئے گور غریباں اے حریص مال و زر — دیکھ کتنی آرزوئیں زیر مدفن ہوگئیں

قرآن شریف کے اندر آتا ہے کہ آخرت کے دن مالک عزوجل جہنم کی آگ سے پوچھے گا کہ کیا تو سیر ہو چکی ہے۔ تو وہ جواب دیگی "نہیں! اور لاؤ۔ اور لاؤ" یہی حال خواہشات کی آگ کا ہے۔ جو انسان اس کو روشن کر لیتا ہے۔ وہ کبھی بھی اس کی سیری نہیں کر سکتا۔ ایک ہندی کوی نے لکھا ہے ؎

کٹھے ترشنا ہے ڈاکنی کے جیون کا کال — اور اور لنسدن چہے، جیون کرے بیحال

یعنی یہ خواہشات یا تو ڈائن کے نام سے پکاری جا سکتی ہے یا زندگی کو ختم کرنے والی موت۔ کیونکہ یہ رات دن "اور لاؤ۔ اور لاؤ" ایسا ہی چاہتی ہیں۔ اور زندگی کو بڑی بدمزہ کر دیتی ہیں۔

انسان کو اگر نیچا دکھاتی ہیں اور بڑے بڑے شہزوروں کو زیر کرتی ہیں۔ تو وہ بھی خواہشات ہیں۔ سچ کہا ہے ؎

آنکہ شیراں را کند روباہ مزاج — احتیاج است احتیاج است احتیاج

ترجمہ۔ جو شیر مردوں کو روباہ خصلت یعنی مکار بنا دیتی ہے وہ ضرورت ہے۔ حاجتمندی ہے، خواہش ہے۔"

بھرتری ہری ایک ایسے انسان کی نسبت لکھتے ہیں کہ جو ساری عمر اپنی خواہشات کی آگ کی تسلی کرنے میں کوشاں رہا۔ اور آخر ناکامی کی حالت میں چلا اٹھا "میں نے مال و زر کی ہوس میں زمین کو تہ و بالا کر ڈالا۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر پہنچا۔ سمندر سے پار گیا۔ بڑی سعی اور کوشش سے راجاؤں اور بادشاہوں کو خوش کیا۔ اور متواتر کئی راتوں تک جاگ کر شمشانوں میں بیٹھ کر منتر سدھ کیے۔ لیکن آخر کوڑی بھی ہاتھ نہ لگی۔ اے خواہش! خدا را اب تو میرا پیچھا چھوڑ دے"

واقعی خواہشات کے پیچھے دوڑنے والے انسان کی یہی حالت ہوتی ہے ؎

کہا سکندر نے یوں بحسرت جب آگیا اُس کا وقت رحلت
کہ سہل ہوتی نزع تب ہم پر جو محوِ جاہ و حشم نہ ہوتے
بلندیاں تب نصیب ہوتیں جو پستیوں پر ہو میل دل کا
زمیں کے فتنوں میں گر نہ پھنستے فلک کے جور و ستم نہ سہتے

انسان آرام کا متلاشی ہوتا ہے۔ خوشی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کے لئے جو ذرائع وہ استعمال کرتا ہے وہ غلط ہوتے ہیں۔ انسان یہ سمجھتا ہے کہ فلاں چیز میسر ہو جائے گی تو پھر خوشی کا حصول یقینی ہے۔ لیکن اس خواہش کے پورا ہو جانے پر بھی وہ اپنے اندر کوئی طرب یا خوشی محسوس نہیں کرتا۔ اس کی حالت اُس ہرن کی سی ہوتی ہے کہ جو گرمی کے موسم میں پیاس لگنے پر دور سے چمکتی ہوئی ریت کو پانی سمجھ کر دوڑتا ہوا وہاں پہنچتا ہے۔ لیکن اسکو سوائے گرم ریت کے اور کچھ ہاتھ نہیں لگتا۔ پھر کسی دوسری جگہ ریت کو چمکتا ہوا دیکھ کر دوبارہ اسکو پانی کا دھوکہ ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ بھاگ کر وہاں بھی جا پہنچتا ہے۔ لیکن پھر بھی سوائے مایوسی کے کچھ نصیب نہیں ہوتا۔ آخر اسی طرح گرتا پڑتا جان دے دیتا ہے۔ یہی حالت ان انسانوں کی ہے کہ جو خوشی اور آرام کی امید اپنی خواہشات کی تکمیل میں باندھے ہوئے ہیں۔ خوشی کا سرچشمہ تو انسان کے

اندر ہی موجود ہے لیکن وہ اس کی تلاش کرتا ہے باہر ؎

اے قیس عبث ہے تجھے ناقہ کا تجسس لیلیٰ تو ترے دل میں ہے محمل میں نہیں ہے

بدھ بھگوان اپنے مشہور گرنتھ دھم پد کے اندر لکھتے ہیں کہ "وہی انسان خوشی حاصل کر سکتا ہے کہ جو کسی چیز سے لگاؤ نہیں رکھتا۔ اور اپنی خواہشات کو اپنے قابو میں رکھتا ہے"

ہم اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ مالکِ کل ہماری جملہ حاجات سے بخوبی آگاہ ہے ہر طرح کے آرام و آسائش کے سامان مہیا کرتا ہے۔ وہ اچھی طرح سے جانتا ہے۔ کہ ہمیں کس چیز کی ضرورت ہے اور بخوبی حاجت روائی کرتا ہے ؎

غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

لیکن باوجود اس کے انسان کی تشفی نہیں ہوتی۔ اور کچھ نہ کچھ مزید خواہش کرتے ہی رہتے ہیں۔ اپنی ضروریات کو بلاوجہ بڑھا کر اپنے لئے مصیبت کھڑی کرتے ہیں حقیقت میں انسان کی ضروریات بہت کم چیزوں سے پوری ہو سکتی ہیں۔ لیکن انسان کا خاصہ ہو گیا ہے کہ وہ اپنی ضرورت سے زیادہ ہی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور یہی بات اس کی تکلیف کا باعث بنتی ہے ؎

اپنے بندوں کو دیا ہے جس قدر اللہ نے کچھ نہ کچھ اس کے سوا ہے ہر بشر کی احتیاج

انسان اتنا بے صبر ہے کہ اپنی روزانہ ضروریات حاصل ہونے پر بھی اور ہی اور کی رٹ لگاتا ہے ؎

ملتا ہے روز اس پہ بھی کہتا ہے آدمی کل کا بھی رزق دے مجھے پروردگار آج

انسان کے لئے جو زیادہ تر تکلیف کا موجب بنتی ہے وہ اس کی شہرت اور نام کی خواہش ہے۔ باوجود اس بات کے کہ انسان دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے ناموں کے نام مٹ چکے ہیں ہزارہا مال و زر اور جاہ و حشم والے شہزادے اور شہنشاہ اس دنیا میں

ہو گذرے ہیں۔ اور آج اُن کا کوئی نام تک نہیں جانتا۔ تو پھر نام اور شہرت کی خواہش اس کے دل کے سمندر میں بے اطمینانی کی لہریں پیدا کرنے کے سوا اور کچھ حقیقت نہیں رکھتی ؎

شوقِ شہرت بھی بُرا، زر کی بُری چاہ بھی ہے
نفرت انگیز نظر میں ہوسِ جاہ بھی ہے

انسان شہرت حاصل کرنے کے لئے بڑا بننا چاہتا ہے۔ لیکن وہ بڑائی اس کو حاصل نہیں ہوتی۔ اور اگر دو روز کے لئے حاصل ہوتی بھی ہے تو اس کی قیمت بہت زیادہ ادا کرنا پڑتی ہے۔ لیکن اگر بجائے دنیاوی بڑائی کی کوشش کرنے کے وہ بڑائی کے ماخذ، بزرگی کے منبع، عزت و آبرو کے سرچشمہ یعنی اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرے۔ تو اُسے بڑائی بھی حاصل ہو جائے۔ اور اپنی قلبی طمانیت کا خزانہ بھی نہ لٹانا پڑے۔ نیز پریشانی اور سرگردانی سے بھی بچ جائے۔ کبیر صاحب نے اس کے متعلق بہت اچھا کہا ہے ؎

پربھوتا کو سب کوئی بھجے، پربھو کو بھجے نہ کوئے
کہہ کبیر پربھو کو بھجے، پربھوتا چیری ہوئے

یعنی سارے انسان بڑائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس بڑائی کے مالک کی طرف راغب نہیں ہوتے۔ کبیر جی کہتے ہیں۔ کہ اگر اُس بڑی شان والے کی طرف مائل ہو جائیں۔ تو بڑائی بھی خود بخود پاؤں میں آن پڑے۔

بڑا بننے اور نام پیدا کرنے کی خواہش باقی خواہشات سے بہت زبردست ہوتی ہے۔ تارک الدنیا لوگوں کو بھی دیکھا گیا ہے۔ کہ وہ گھر بار چھوڑ جاتے ہیں۔ لیکن اُنکے دل میں بھی یہ امنگ لگی رہتی ہے۔ کہ ان کے ترک، ان کی عبادت، ان کے زُہد، ان کے علم اور ان کی تحریر اور تقریر کی لوگ بڑائی کریں۔ کہا ہے ؎

کنچن تجنا سہج ہے سہج تریا کا نیہہ
مان بڑائی ایرشا دُرلبھ تجنے ایہہ

یعنی "انسان مال و دولت کی خواہش اور نفس امارہ پر تو شاید قابو پا سکتا ہے لیکن بڑے پن اور عزت کی خواہش اور حسد کو چھوڑنا بہت مشکل ہے۔"

انسان کی ہوس ضرب المثل ہے۔ پتنگا صرف رُوپ کی خواہش میں شمع پر جل مرتا ہے۔ ہاتھی نفس امارہ سے اندھا ہو کر بناوٹی ہتھنی کو دیکھ کر گڑھے میں گر جاتا ہے۔ ہرن کو مُرلی آواز کی کشش جال میں پھنساتی ہے۔ مچھلی کو زبان کا چسکہ کنڈی کا نشانہ بناتا ہے۔ اسی طرح سے ایک ایک خواہش ان کی موت اور قید کا باعث بنتی ہے تو پھر انسان کا کیا ٹھکانا۔ کہ جو سرتا پا ساری قسم کی خواہشات کا پتلا ہوا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے۔ کہ انسان کس قدر خواہش کا بندہ ہے کہ مر کر بھی اس سے الگ ہونا نہیں چاہتا ؎

فنا کے بعد بھی ہے احتیاج خلعتِ نو   تجھے کفن کی ضرورت ابھی ہے تن پرور

یعنی انسان کا مردہ جسم بھی نئے کپڑے میں لپٹنے کی خواہش کرتا ہے۔ انسان کی کبھی نہ ختم ہونے والی ہوس کو اس شعر میں بہت خوبی سے نبھایا گیا ہے۔ ایک ہندی کوی نے کہا ہے ؎

آل، پتنگ، مرگ، مین، گج، جرت ایک ہی آنچ
تلسی وہ کیسے جیئے، جس کو لاگیں پانچ!

یعنی "بھونرا خوشبو کے شوق میں، پروانہ روشنی کے عشق میں، ہرن راگ کی دھن میں۔ مچھلی کھانے کی چاٹ میں اور ہاتھی حظِ نفسانی کی دھت میں ہلاک ہو جاتا ہے پھر انسان بیچارے کا کیا ٹھکانہ ہے کہ جس پر پانچوں ہی حِسّیں غالب رہتی ہیں۔"

اب سوال ہو سکتا ہے کہ اگر خواہشات کی تکمیل سے بھی خوشی نصیب نہیں ہوتی تو ہوتی کس طرح ہے؟ اگر انسان حقیقتاً خوشی کا طالب ہے تو اسے خواہشات کو پورا کرنے کی کوشش کو ترک کر کے خواہشات سے دل ہٹانا پڑتا ہے ؎

ترک لذّت بھی نہیں لذت سے کم   کچھ مزا اس کا بھی چکھا چاہیئے

جس مقصد کے حصول کے لئے متواتر تگ و دو کی جاتی ہے۔ دن رات ہاتھ پاؤں مارے جاتے ہیں۔ بھاگ دوڑ میں وقت خرچ کیا جاتا ہے۔ اس کی نسبت انسان کہتا ہے کہ یہ چیز تو آج مل جائے گی وہ کل حاصل ہوگی۔ اسی امید میں اس بے بہا عمر کے لمحوں کو لٹا یا جاتا ہے۔ ہاں وہ مقصد فی الفور ہاتھ آجاتا ہے کہ جب انسان اپنی خواہشات پر قابو پالیتا ہے ؎

گھر بیٹھے میں ہاتھ لگی منزل مقصود
جب توڑ کے ہم بیٹھ رہے پاؤں طلب کے

سچ جانو۔ اس شخص سے زیادہ کنگال، اس سے زیادہ محتاج اور اس سے زیادہ بھک منگا کوئی نہیں۔ کہ جو ہوس کا بندہ ہے۔ لیکن جس شیر مرد نے اپنی خواہشات کو اور اپنی ہوس کو دبا لیا ہے۔ اس کا درجہ اور رتبہ شہنشاہوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ کہا ہے ؎

دولت کی ہوس، اصل گدائی ہے یہ
سامان کی حرص، بے نوائی ہے یہ
حاجت کم ہے تو بادشاہی ہے یہ
اور کچھ نہیں حاجت تو خدائی ہے یہ

کس خوبصورتی سے کوزے میں دریا کو بند کیا ہے۔ حاجت کا درجہ بدرجہ خواہشات کا مٹا دینا نہ صرف بادشاہی کے بلکہ خدائی کے مترادف ہے۔ کبیر صاحب نے بھی کچھ ایسا ہی فرمایا ہے ؎

چاہ گئی، چنتا مٹی، منوا بے پرواہ
جن کو کچھ نہ چاہیئے سو ہی شاہنشاہ

عبادت الٰہی کے شائقوں کو تو یہ بات خاص طور پر مد نظر رکھنا چاہیئے۔ کہ سچی عبادت نام ہی ہے حاجات اور خواہشات سے لاپروائی کا۔ اس شخص کا عابد اور زاہد ہونا کیا معنی رکھ سکتا ہے۔ یا اس کی پوجا اور ستائش کیسے سود مند ہو سکتی ہے جس کے دل سے ہوس ہی دور نہیں ہوئی ؎

آسن مارے کیا بھیا، موئی نہ من کی آس
جیوں تیلی کے بیل کو گھر ہی کوس پچاس

یعنی بگلے کی طرح آنکھ میچ کر بیٹھنے سے کیا حاصل ، اگر دل کی ہوس رفع نہیں ہوئی ایسے انسان کی حالت وہی ہوتی ہے۔کہ جو کولھو کے بیل کی یعنی وہ آنکھوں پر پٹی لگے ہوئے سارا دن چلتا رہتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ بہت دور نکل گیا ہوگا۔لیکن آنکھیں کھلنے پر اسے پتہ چلتا ہے کہ وہ وہیں کا وہیں کھڑا ہے" اسی طرح ہوس اور خواہش کو لئے ہوئے عبادت کرنا منزلِ عرفان میں ترقی کا باعث نہیں ہوسکتا۔ایسے انسانوں کی نسبت کرشن بھگوان نے بھگوت گیتا کے تیسرے ادھیائے میں کہا ہے۔کہ اگر ایک انسان دل کے اندر خواہشات رکھتا ہوا ہاتھ پیر سکیڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔اور دھیان اس کا دنیا کی چیزوں کی طرف دوڑتا ہے۔تو وہ شخص مکار ہے اور ریاکار ہے۔مولانا روم رح نے بھی فرمایا ہے ؎

زہد و تقویٰ ہے چیست اے مردِ فقیر لاطمع بودن ز سلطان و امیر

ترجمہ:۔ اے خدا کے بندے زہد اور تقویٰ یعنی عبادت اور معرفت کس چیز کا نام ہے۔وہ صرف یہ ہے کہ انسان کسی بھی بڑے سے بڑے آدمی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے۔

جو انسان اپنے مالک سے واصل ہونا چاہتے ہیں۔دیدارِ الٰہی کے خواستگار ہیں۔پربھو درشن کے خواہشمند ہیں۔ان کو سمجھ لینا چاہیئے۔کہ انکی یہ امید تب تک بار آور نہیں ہوسکتی جب تک وہ خواہشات کو اپنے دل میں جگہ دیں گے۔خواہشات تو اس منزل کی راہ میں بڑی بھاری رکاوٹ ہیں ؎

صد تمنا در دل است اے بوالفضول کے کند نورِ خدا در دل نزول

ترجمہ:۔ اے ہوس کے بندے! تیرے دل کے اندر سینکڑوں خواہشیں جگہ لگا رہی ہیں۔ایسی حالت میں اس دل کے اندر اُس پروردگار کا نور کیسے اُتر سکتا ہے؟

سوال ہو سکتا ہے کہ دنیاوی چیزوں کے بغیر دنیا کے کام کاج کس طرح چل سکتے ہیں اور خواہشات کو چھوڑنا نکما بننے کی تعلیم ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا ایک مذموم عادت ہے پہلے ہی ان گنت سادھو اور فقیر اس دنیا کے اندر کاہلی اور سستی کے پتلے بنے پھر رہے ہیں۔ پھر یہ نکمے پن کی تعلیم دینا کہاں تک واجب ہے اعتراض تو معقول ہے لیکن خواہشات کو ترک کرنے کی تعلیم ہرگز نکمے پن کی تعلیم نہیں۔ اس میں ایک غلطی لگتی ہے جس کا اشارہ ایک ہندی کوی کے دوہے میں موجود ہے ؎

جانت بار دھی میں سدا کھیلت آنثو ترنگ
اُگے گی کیوں کر کہو تا مدھی بدھ امنگ (ورلوگی)

ترجمہ جس انسان کے اندر ہمیشہ ناپاک خواہشات اٹھتی ہیں۔ اس کے اندر کبھی زندگی کے میدان میں سینہ سپر ہونے کی خواہش بھلا کب پیدا ہو سکتی ہے؟

اس بات کو مثال سے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں ایک کتا ہے کہ جو ہر وقت ٹکڑے کی خواہش سے در بدر پھرتا ہے اسکو ٹکڑہ بھی نہیں ملتا۔ اور جگہ جگہ ڈنڈے پڑتے ہیں اور جہاں کہیں دوسرا کتا مل گیا۔ تو وہ دانت دکھا کر ہی رہ جاتا ہے یا دُم دبا کر ایک طرف کو دوڑنا چاہتا ہے۔ لیکن ایک دوسرا کتا ہے جو اپنے مالک کے دروازے پر آرام سے سو یا رہتا ہے۔ کہیں نہیں جاتا۔ رات ہونے پر اگر موقعہ پڑیگا۔ تو اپنی جان لڑا دیگا۔ مجال نہیں کہ کوئی چرند پرند یا انسان وہاں پھٹک سکے بس اسی طرح سے خواہشات کو رفع کرنے سے مراد ہے۔ کنگال اور نکما بننے سے مطلب نہیں جو انسان اپنی خواہشات کو سنکیڑ لیتا ہے اسکو سب کچھ حاصل ہو جاتا ہے حالانکہ در بدر جانے والے کو پہلے کتے کی طرح روٹی کا ایک ٹکڑا بھی ہاتھ نہیں لگتا ؎

بھاگتی پھرتی تھی دنیا جب طلب کرتے تھے ہم
اب کہ جب نفرت ہوئی وہ بےقرار آنے کو ہے

اسی خیال کو ایک فارسی شاعر نے اس طرح ادا کیا ہے ؎

ترکِ دنیا ہر کہ کرد از زہد خویش   پیش آمد، پیش اُو دنیا و بیش

ترجمہ: جس کسی نے دنیا کی ہوس کو اپنی اپنی دل کی پاکیزگی سے چھوڑ دیا۔ اس کے سامنے وہی دنیا بہت زیادہ مقدار میں حاضر ہو گئی۔

کمینہ خواہشات یعنی دوسرے کا نقصان کر کے دوسرے سے بڑا بننے کے لئے جائز و ناجائز وسائل کا استعمال، رنج و مصیبت کا باعث ہوتے ہیں ؎

لذت کو ترک کر تو ہو دنیا کا رنج دور   پرہیز بھی دوا ہے جو بیمار نے کیا

دنیا کی چمکدار چیزیں دھوکے میں ڈالنے والی ہیں۔ یہ گورکھ دھندا ہیں۔ یہ ایک جال ہیں جس میں پھنس کر پھر نکلنا محال ہے۔ اگر اس پھندے سے بچنا منظور ہو تو ان چمکیلی اور بھڑکیلی چیزوں پر مفتوں نہ ہونا چاہیئے ؎

خواہی کہ رسی بکام برادر دو گام   یک گام ز دنیا دیکے گام زکام

ترجمہ:۔ اے پیارے! اگر تو منزلِ مقصود پہنچنے کا خواہشمند ہے۔ تو دو قدم اٹھا۔ ایک قدم تو دنیا کے لالچوں سے پرے ہٹ جا اور دوسرے قدم سے خواہشات سے پرے ہٹ جا۔

جو شیر مرد ہوتے ہیں جنہوں نے دنیا کی عارضی چمک کے راز کو سمجھ لیا ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ کہتے ہیں کہ ؎

نہ ہوئے طالبِ دنیا کبھی مردانِ خدا   سگِ مُردار تو یہ زاغ و زغن کا حق ہے

اُن کے سامنے لالچ آتے ہیں۔ یہ مایا کی کنچنی دیوی ان کے سامنے کئی طرح سے آراستہ و پیراستہ ہو کر آتی ہے لیکن وہ کیا کہتے ہیں ؎

زمانے نے مرے آگے بھی دنیا پیش کر دی تھی   مگر میں نے تو اپنا فائدہ انکار میں دیکھا

وہ دنیاوی خواہشات کو شیر مردوں کے لائق ہی نہیں سمجھتے۔ شیر مردوں کی خواہشات

اور ہوتی ہیں۔ دنیاوی خواہشات کے متعلق وہ کہتے ہیں ؎

نہیں اک مرد کو دنیا سے مطلب　　مریں نامرد اس زن پر ہزاروں

ان شیر مردوں کا کیا اصول ہے؟ ان کا کیا شعار ہوتا ہے؟ کیا وہ انگور دور ہونے کی وجہ سے اُن کو ترش کہہ کر تو نہیں بیٹھ جاتے؟ نہیں ایسا نہیں۔ ان کا نقطۂ نگاہ ہی اور ہوتا ہے۔ اور وہ بھی ملاحظہ ہو ؎

دولت کا خیال ہمیں آتا ہی نہیں　　یہ نشۂ فقر ہے کہ جاتا ہی نہیں

لبریز ہیں ہم دولت استغنا سے　　آنکھوں میں کوئی غنی سماتا ہی نہیں

وہ لوگ ان دنیاوی چیزوں کو کوئی وقعت نہیں دیتے۔ یہ دنیا ان کی نظر میں کچھ قدر نہیں رکھتی۔ جو لوگ اُن دنیاوی چیزوں کے پیچھے اپنی دلی راحت کو کھو بیٹھتے ہیں اپنے انسانی فرائض سے گمراہ ہوتے ہیں۔ انسان اور انسان کے تعلقات کو فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ ان کو وہ لوگ نادان سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

بازیچہ است طفل فریب این متاع دہر　　بے عقل مرداں کہ بدیں مبتلا شوند

ترجمہ:۔ یہ دنیا کے سامان بچوں کو دھوکہ دینے والا کھیل ہیں۔ جو آدمی ان میں پھنستے ہیں وہ خارج از عقل ہوتے ہیں۔

افراد کا ہی کیا کہنا ہے۔ جو قومیں بھی دنیا کے لالچ میں زیادہ پڑ گئیں وہ بھی بربادی کی راہ پر جا پڑیں۔ ہندو قوم نے لالچ میں پڑ کر ستیاناس کر لیا۔ اب دوسرے بھائی اُن کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ لازمی طور پر ان کا بھی وہی حال ہوگا۔ مولانا رومؒ نے سچ کہا ہے ؎

از ہوائے خویش در ہر ملتے　　گشتہ ہر قومے اسیر ذلتے

ترجمہ۔ جو بھی قوم لالچ میں پڑ گئی وہی ذلت و خواری کے چاہ میں جا گری۔

جاپان کو بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ خوب ترقی کر رہا ہے۔ اپنے ملک کو بڑھا رہا

ہے اپنی سلطنت کو وسیع کر رہا ہے۔ خوب بڑھ چڑھ کر قدم مار رہا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ ترقی کی شاہراہ پر نہیں۔ بلکہ بربادی کی سڑک پر دوڑ رہا ہے۔ جلد[1] ہی ناک کے بل گر کر ذلیل و خوار ہوگا۔ کیا اس طرح سے بستیاں اجاڑنا، بنی نوع انسان کے چھوٹے بڑے افراد بغیر تمیز کے زن و مرد۔ پیر و جواں کے خون سے ہاتھ رنگنا ترقی کہی جا سکتی ہے۔ ایسا ظلم کبھی رنگ لائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مظلوم کا بھی کوئی ساتھی ہے۔ جو دیر تک ظلم کا دور دورہ نہیں چلنے دے سکتا۔ جرمنی کا حال دیکھ ہی لیا ہے۔ کتنے بڑھ بڑھ کر ہاتھ پاؤں مارے۔ ہر جگہ ہی چھا گیا۔ لیکن اب سمٹ کر بیٹھا ہے اسی لئے کہا ہے ؎

کیا کرتا ہے گردوں بے نشاں بنیاد ظالم کو　　　کہیں ہوتا نہیں شداد کا باغِ ارم پیدا

یورپ کے باقی ممالک بھی اسی طرح سے بربادی کے اسباب پیدا کر چکے ہیں اس طرح سے ترقی یا بزرگی حاصل کرنے کی نسبت تو یہ اچھا ہے کہ ؎

اندر دہنِ مار شو و مال مجو مے　　　در چاہ نشیں و طلبِ جاہ مکن

ترجمہ۔ اس طرح سے لوٹ کھسوٹ کرنے کی بجائے بہتر ہے کہ انسان خود سانپ کے منہ میں جا کر اپنی زندگی ختم کر دے۔ اس طرح سے بزرگی حاصل کرنے کے مقابلہ میں بہتر ہے کہ انسان کوئیں میں گر کر اپنی رسنِ حیات کو کاٹ دے۔

کبھی خیال نہ کرو۔ کہ ہم دوسرے کو دبا کر خود اُبھر سکتے ہیں۔ یا دوسرے کو نقصان پہنچا کر آپ فیضیاب ہو سکتے ہیں۔ یا دوسرے کو دنیا سے مٹا کر خود زندہ رہ سکتے ہیں۔ یا دوسرے کو محروم کر کے خود لذت اندوز ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کی خواہشات رنج کے سمندر میں جا گرائیں گی۔ دکھوں کے گھنے جنگلوں میں پریشان کریں گی۔ خوشی کے چشمہ سے بہت دور جا پھینکیں گی۔ ایسی خواہشات کی پیروی کہیں کا نہیں رکھتی دین و دنیا دونو جاتی ہیں۔ اگر سچی راحت مقصود ہو تو وہ سبق یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ جو ایک مردِ خدا نے ایک سالک کو سنایا تھا ؎

[1] یہ پیشین گوئی حرف بحرف درست ثابت ہوئی۔

کون کہتا ہے کہ تو دیندار ہے | بیچتا ہے دین کو مکّار ہے
دین کا طالب اور اتنا خود غرض؟ | شوخ! سمجھا ہی نہیں اپنا فرض
خود غرض کیوں بن رہا ہے یار تُو؟ | کس لئے ہے چاہتا آزار تو؟
رزق کی ہے فکر ناحق تجھکو ہاں | رزق سے پُر ہیں زمین و آسماں
زندگی کی گر ہوس ہے اے عزیز | موت میں اور زندگی میں کر تمیز
سروری کا ہے اگر تجھکو خیال | سوچ لے آخر کو ہوگا جو مآل
تو ستائش اسکی مت کر زینہار | اس سے کب راضی ہؤا پروردگار
خود غرض ہے چاہتا ہے بہتری | مانگتا ہے حق سے ناحق سروری
جا اسکے بندوں کی خدمت میں رہ | بندوں کی خدمت سے تو عظمت میں رہ
لطفِ طاعت ہے یہی ذوقِ عبادت یہی | رنگِ تقویٰ ہے یہی شوقِ ریاضت یہی

اس سے خوش ہوگا ترا پروردگار!
گر ہتی سے دُور رہ اے ہوشیار!

جن صاحبان کی رغبت یادِ الٰہی کی طرف ہو اور وہ دیدارِ حق سے فیضیاب ہونا چاہتے ہوں۔ انکے لئے تو نہایت ضروری ہے کہ سب قسم کی خواہشات کو ترک کریں۔ ایسے صاحبان کے لئے ترک کے چار درجے رکھے ہیں۔ یعنی

(۱) ترکِ دنیا (۲) ترکِ عقبےٰ (۳) ترکِ مولےٰ (۴) ترکِ ترک۔

سب سے پہلے دنیاوی چیزوں کو اور دنیاوی جاہ وحشم کو خیرباد کہنا چاہئے۔ یہ تو سب سے نکمّی خواہش ہے۔ جب یہ منزل طے ہو چکے تو اس کے بعد عاقبت کی خواہش یعنی جنت یا سورگ حاصل کرنے کا خیال بھی چھوڑنا ہوگا۔ بہشت کے اندر حُور و غلمان اور شرابِ طہور یا سورگ میں اِندر کے اکھاڑے کی اپسراؤں اور دیگر بھوگوں کے حاصل کرنے کی خواہش بھی حقیقی راحت تک پہنچنے کے لئے چھوڑنی ہوگی۔

اس کے بعد اس امید کے خیال کو بھی ترک کرنا ہوگا۔ کہ اپنے مالک سے وصل حاصل کرنا ہے۔ یعنی جو عبادت یا سادھن کئے ہیں۔ ان کے عوض میں یہ امید بھی نہیں رکھنی ہوگی کہ اپنے مولیٰ سے وصال حاصل کرنا ہے۔ غرضیکہ ساری ریاضت اور تپسیا یا سب کے سب نیک کام بالکل خواہش سے بالاتر ہو کر اُن کو اپنی زندگی کا ایک فرض سمجھ کر کرنے ہونگے۔ اس کے اجر کا کچھ بھی خیال نہ رکھنا ہوگا۔ جیسا کہ شری بھگوت گیتا کے دوسرے ادھیائے میں لکھا ہے کہ انسان کے لئے ادائیگی فرض لازمی ہے لیکن اس کے اجر کی خواہش نہ ہونا چاہیئے ؎

امید و بیم کے جھگڑوں سے آگاہی نہیں رکھتے
سبب یہ ہے کہ ہم کوئی تمنا ہی نہیں رکھتے

جب اس قسم کی لاغرضی کی منزل تک رسائی ہو جائے تو پھر اس خیال کو بھی چھوڑنا ہوگا۔ کہ میں اجر نہیں چاہتا۔ یا میں بلا غرض اپنے فرائض کو سرانجام دیتا ہوں اس صورت میں ترک کے خیال کو بھی ترک کر دینا ہوگا۔ اور یہی آخری منزل ہے اسوقت انسان مشین کی طرح کام کرتا ہے یا دیگر قدرتی اشیا مثلاً سورج اور چاند کی طرح اپنے فرائض کو سرانجام دیتا ہے جیسے اوپر عرض ہوا۔ طالبانِ دیدارِ حق کو تو خواہشات اسی طرح سے بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنی ہوں گی۔ ان کا طرزِ عمل یہ ہونا چاہیئے ؎

آرزو بس یہ رہے ہرگز نہ کچھ ہو آرزو
گر دعا مانگے تو ترکِ مدعا کے واسطے

نہیں تو وہ دل ہی نہ رکھنا ہوگا جس کے اندر خواہشات کی ذرا بھی لہر اُٹھے یا جس میں کسی امید کا کچھ بھی خیال رہے ؎

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں!

اس سلسلہ سے خواہشات کی منزل کو طے کرنا ہوگا۔ کہا ہے :-

طالبِ دنیا = سگ

طالبِ عقبیٰ = زن

طالب مولیٰ = مرد

طالب رضا = انسان

بے نیازی از طلب = بامُراد انسان۔

کم از کم انسان کو پہلی دو منزلوں سے تو ضرور آگے نکلنا چاہیئے۔ لیکن اگر حقیقی راحت کی طلب ہو۔ اگر لافانیت تک رسائی کی آرزو ہو۔ تو یہ ساری منزلیں ہی طے کرنا ہونگی۔ اس لافانیت کی منزلوں اور دنیاوی ترقی کے مدارج میں بڑا فرق ہے اول الذکر کے لئے ہدایت ہے کہ دنیا میں جاگتا ہوا بھی سوئے ہوئے کی طرح رہے۔ یعنی دنیا کی طرف سے بالکل لاپرواہ ہو۔ کسی طرف نگاہ بھی نہ کرے۔ بلکہ آنکھ باہر کی طرف سے ہٹا کر اندر کی طرف کرے اور دنیاوی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ انسان خوب آنکھیں کھول کر دنیا میں رہے۔ بلکہ سوتا ہوا بھی خبردار رہے۔ اور کسی وقت بھی لاپروائی سے کام نہ لے۔ اس لئے ان ہر دو قسم کی منزلوں کیلئے وسائل میں فرق ہے۔ لافانیت حاصل کرنیوالوں کو تو رشی تپسی میتریئی کے نقش قدم پر چلنا ہوگا۔

حکایت: یاگیہ ولکیہ رشی کی دو بیٹیاں تھیں جب رشی گھر چھوڑ کر باہر جانے لگے۔ تو انہوں نے دونوں کو کہا۔ کہ وہ گھر کی چیزوں کو ان میں تقسیم کر دینا چاہتے ہیں۔ تو ان میں سے ایک نے جس کا نام میتریئی تھا۔ پوچھا۔ کہ جس مدعا کے لئے آپ گھر کو چھوڑ رہے ہیں کیا وہ غرض ان گھر کی چیزوں سے یا دنیا کی باقی چیزوں سے پوری ہو سکتی ہے رشی نے کہا کہ وہ مطلب تو ساری دنیا حاصل کر کے بھی حاصل نہیں ہو سکتا تب میتریئی نے بڑے ادب سے عرض کیا۔ کہ اگر ایسی صورت ہے تو میں کوئی تقسیم نہیں کرانا چاہتی۔ بلکہ اُسی چیز کی خواہشمند ہوں کہ جسکو حاصل کرنے کے لئے آپ خود گھر چھوڑ رہے ہیں" اس لئے طالبانِ حقانیت کو تو منبع خواہشات کو ہی بند کر دینا ہوگا ؎

بھوک سے زائد ہو جسکے پاس کھانا اسکے پاس — اتنی دولت ہے کہ رکھنے کو جگہ ملتی نہیں

البتہ جو صاحبان دنیاوی کامیابی کے خواہشمند ہیں ان کے لئے بھی نہایت لازمی ہے کہ وہ اپنی خواہشات کے اندر اس اصول کو ہمیشہ مدنظر رکھیں۔ کہ خواہشات ہمیشہ پاکیزہ ہوں۔ ان کے اندر ناپاکیزگی کا نام و نشان بھی نہ ہو۔ وہ اپنی ترقی کی خواہش کریں لیکن کسی دوسرے کا نقصان کر کے نہیں۔ یا دوسرے کا حق چھین کر یا ترقی میں رکاوٹ ڈال کر نہیں۔ جائز اور پاک خواہشات کرنے سے نہ ہی دنیا روکتی ہے نہ دنیا کا مالک۔ یہ گڑبڑ وہاں پیدا ہوتی ہے اور خلل وہاں پیدا ہوتا ہے کہ جہاں:۔

۱۔ جس چیز کا انسان حقدار نہیں۔ اس کی خواہش کرے۔

۲۔ جس چیز کا انسان اہل نہیں۔ اس کی خواہش کرے۔

۳۔ جس چیز پر دوسرے کا حق ہے۔ اس کی خواہش کرے۔

۴۔ جو چیز حرام ہے۔ اس کی خواہش کرے۔

۵۔ جس چیز کے حصول میں کسی کو تکلیف ہو۔ اس کی خواہش کرے۔

۶۔ جس چیز کا حصول کسی کی نفرت کا باعث بنے اس کی خواہش کرے۔

۷۔ اپنی ضرورت سے زیادہ خواہش کرے۔

۸۔ دوسروں کی ضرورت کا کبھی خیال نہ کرے۔

اگر ان امور کا دھیان رکھ کر نیک اور جائز خواہشات کی جائیں اور اُن خواہشات کے ذریعے دنیا میں ترقی کی جائے تو نہ اس میں اعتراض ہے نہ گناہ ایسی پاک خواہشات کے ذریعے انسان جائز ترقی بھی کر سکتا ہے۔ خود خوش رہتا ہے اوروں کے امن میں خلل نہیں ڈالتا۔ بلکہ اوروں کی خوشی کا سبب بنتا ہے۔ اور اس سے اپنے مالک کی بھی خوشنودی حاصل کرتا ہے۔

اِنسان اور اُس کی خُوشی

تیرے سینے میں تو ناداں بحرِ بے پایاں رہے
اور تُو قطرے کے پیچھے شاکی و نالاں رہے

دنیا میں کوئی ایسا انسان نہیں جو خوشی کا متلاشی نہ ہو کیا چھوٹا کیا بڑا ۔ کیا مرد کیا عورت ۔ کیا مشرقی کیا مغربی ۔ ہر کہ و مہ اس گوہر کی تلاش میں ہے اس دُرِ نایاب کی جستجو میں لگا ہُوا ہے ۔ جو کچھ بھی محنت یا تکلیف اس دنیا میں برداشت کی جاتی ہے وہ اس غرض کیلئے کی جاتی ہے کہ خوشی حاصل ہو ۔ لڑکے اگر پڑھنے کی تکلیف اٹھاتے اور راتوں کو جاگتے ہیں تو خوشی کی تلاش میں ۔ بڑی عمر کے لوگ اگر کام کاج میں لگے ہوئے ہیں تو خوشی کی امید میں ۔ سائنس دان جو نت نئی ایجادیں کرتا ہے اور رات دن سرگرداں رہ کر دماغ سوزی کرتا ہے ۔ تو محض خوشی حاصل کرنے کے خیال سے ۔ روپیہ کمایا جاتا ہے شادی کی جاتی ہے ۔ اور اولاد کی خواہش ۔ جاہ و مرتبہ کی طلب ہوتی ہے ۔ کیوں ؟ بس خوشی حاصل کرنے کی خاطر ۔ غرضیکہ جس قدر تگ و دو اور دوڑ دھوپ دنیا کے لوگ کر رہے ہیں ۔ سب کا مدعا یہی ہے ۔ کہ خوشی کی دیوی کے درشن نصیب ہوں ۔ لیکن مشاہدہ اور دریافت سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ باوجود سر توڑ کوشش کے بہت کم ایسے خوش نصیب انسان ہیں کہ جن کو حقیقی خوشی نصیب ہوتی ہے اہلِ نظر کا اندازہ ہے کہ نوسو ننانوے فی ہزار انسان بلکہ اس سے بھی زیادہ اصلی خوشی سے بے بہرہ رہتے ہیں ۔ بعض احباب خیال کریں گے کہ اس امر کا اندازہ لگانے میں اہلِ نظر نے غلطی کھائی ہے کیونکہ بہت سے آدمی دنیا کے اندر خوشی سے سرشار

ہیں۔ لیکن یہ اُن کی ایک بھول ہے۔ مندرجہ بالا اندازہ بالکل درست ہے بلکہ اگر پوری
پوری جانچ کی جائے تو مشکل سے ہی کوئی انسان صحیح معنوں میں خوش ملیگا۔ غلطی یہ لگتی ہے۔
کہ دنیا کے اندر ایک انسان کو دوسرا انسان خوش دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنی اصلی حالت
کا اور دوسرے کی ظاہرہ حالت کا چند باتوں سے موازنہ کرکے نتیجہ نکال لیتا ہے کہ دوسرا
آدمی خوش ہے۔ مثلاً ایک شخص لاولد ہے اور دوسرا صاحب اولاد۔ تو وہ صاحب
اولاد کو خوشی سے بھرپور خیال کرتا ہے۔ یا بعض آدمیوں کے پاس دولت نہیں گھر کا
مکان نہیں۔ اچھے کپڑے نہیں۔ یا دیگر ٹھاٹھ باٹھ کا ساز و سامان نہیں یا برادری
میں عزت نہیں۔ مگر دوسرے آدمیوں کو یہ چیزیں مہیا ہیں۔ تو جو لوگ ان نعمتوں
سے محروم ہیں۔ وہ ان چیزوں کے مالکوں کو خوشی کے چشمے کا مالک سمجھ لیتے ہیں۔
لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہوتا۔ اُن آدمیوں سے پوچھو۔ تو بعض تو زر و مال اور
اولاد کو ہی رنج اور مصیبت کا باعث بیان کریں گے۔ مثلاً ایک انسان کے ہاں اولاد
ہے۔ لیکن وہ بہت زیادہ ہے اور انتظام معاش کافی نہیں۔ تو وہ اس سے
رنجیدہ خاطر رہتا ہے یا اولاد نافرمانبردار اور بدچلن ہے تو اس سبب سے آزردہ خاطر
رہتا ہے یا اس کے بچے اکثر کسی نہ کسی مرض کا شکار رہتے ہیں تو اسکے باعث کبیدہ
خاطر رہتا ہے۔ جن کے پاس دولت ہے ان کیلئے یا تو وہ دولت ہی باعث خوف و خطر
بنی رہتی ہے۔ یا کسی اور دنیاوی کمی یا صحت کی خرابی کی وجہ سے وہ دولت خوشی کا موجب
نہیں بنتی۔ غرضیکہ بعض انسانوں کو دنیاوی چیزوں کا مالک دیکھ کر یہ نتیجہ نہیں نکال لینا
چاہیئے۔ کہ وہ حقیقتاً ان اشیاء سے خوشی حاصل کر رہے ہیں۔ میں آپ کی خدمت
میں دو ایسے انسانوں کی مثالیں رکھتا ہوں۔ کہ جن کا مقابلہ دنیاوی ٹھاٹھ باٹھ
کے لحاظ سے شاید ہی کوئی اور کرسکتا ہو۔ اور ظاہر بین انسان یہ سمجھتے ہونگے کہ
رنج و غم ان کے نزدیک تک نہیں پھٹک سکتے لیکن اصلیت کا پتہ آپکو انکی کہانی سُنکر

لگایگا۔ اور ان سچی کہانیوں کے سننے کے بعد آپ کو یقین ہو جائیگا۔ کہ محض دنیاوی پیداوار ہی خوشی کا باعث نہیں بن سکتے۔ اور خوشی اس شخص کا ہی ورثہ نہیں ہوتی۔ جو صاحب زر ہو۔ عہدہ دار ہو یا صاحب اقتدار ہو۔ ان دو مثالوں میں سے ایک تو اسی ملک کے ایک صاحب زر و جاہ کی ہے۔ پہلے وہ سنیئے۔

کچھ عرصہ ہوا۔ مجھے میرے ایک دوست سرکاری افسر نے قصہ سنایا۔ کہ چند سال ہوئے کہ وہ ایک مشہور شہر میں تعینات تھے۔ وہاں پر ایک سیٹھ صاحب رہتے تھے ان کی دولت کا یہ عالم تھا۔ کہ اکثر ریاستیں ان کی مقروض تھیں شان و شوکت کا یہ حال تھا۔ کہ ان کے ہاں طرح طرح کے گھوڑے گاڑیاں اور موٹریں درجنوں کی تعداد میں موجود رہتی تھیں۔ عزت کی یہ صورت تھی کہ شہنشاہ معظم جب اس ملک میں آئے تھے تو حضور شہنشاہ ملکہ صاحبہ بالقابہ چند یوم کے لئے ان کے مکان میں جا کر ٹھہری تھیں اور بڑے سے بڑے خطابات اور اعزاز ان کو ملے ہوئے تھے۔ ان کے ہاں اولاد بھی تھی۔ بلکہ لڑکا ایسا نیک اور ہوشیار تھا۔ کہ اس نے اپنے والد کی عین حیات میں ہی سارے کاروبار کو سنبھال لیا تھا۔ میرے دوست کہنے لگے کہ مجھے ہندوستان کے اکثر بڑے بڑے شہروں میں رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ لیکن اس طرح سے ہر قسم کی نعمتوں سے ممتاز کوئی شخص نہ دیکھا تھا۔ اس سیٹھ صاحب کے حالات کو دیکھ کر یقین ہوا۔ کہ اس کی خوشی کا پیمانہ پورے طور پر لبریز ہے۔ اس بات کو جانچنے کے لئے میرے دوست نے سیٹھ صاحب کے ساتھ سلسلہ راہ و ربط پیدا کیا۔ جب تعلقات ذرا بڑھ گئے۔ تو میرے دوست نے سیٹھ صاحب سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اور کہا سیٹھ صاحب میں نے اپنی پچاس سالہ زندگی میں اگر کسی کا خوشی کا ستارہ پوری شان سے چمکتا ہوا دیکھا ہے تو آپ کا ہے۔ پھر پوچھا کہ کیا یہ میرا قیاس درست ہے؟ سیٹھ صاحب جو اس وقت تک خوب خوش گپیاں لگا رہے تھے اور

ہنس کھیل رہے تھے چپ ہوگئے۔ چہرہ پر اُداسی چھا گئی۔ بے چینی سے جسم کے اعضاء کو اِدھر اُدھر حرکت دینے لگے۔ میرے دوست کو حیرانی بھی ہوئی اور افسوس بھی افسوس اس لئے کہ کیوں اس قسم کا سوال کیا گیا جس سے ان کی خوشی رنج میں بدل گئی اور حیرانی اس لئے کہ اس شخص کو کس چیز کی کمی ہے۔ کہ جس کے خیال سے اس کی حالت میں تغیر آ گیا۔ آخر سیٹھ صاحب کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اور ٹھنڈی سانس بھر کر انہوں نے کہا۔ بھائی صاحب آپ نے شاید اس سازوسامان اور ٹھاٹھ باٹھ سے یہ اندازہ لگایا ہے کہ میں مکمل خوش انسان ہوں۔ لیکن حقیقت اس سے کوسوں دور ہے۔ میرے دل میں اپنے ایک گھریلو واقعہ کی وجہ سے ایک ایسی خلش اور چبھن ہے کہ جو مجھ کو ہر وقت بے چین رکھتی ہے وہ خلش میرے جسم کو گھن کی طرح اندر ہی اندر کھا رہی ہے۔ اور یہ یقین ہے کہ اگلے سال تک وہ میرے جسم کا خاتمہ کر دیگی۔ میرے دوست نے بتایا۔ کہ وہ گھریلو واقعہ بھی سیٹھ صاحب نے مختصر الفاظ میں بتایا جو یہاں عرض نہیں ہوسکتا۔ لیکن ہوا وہی جو سیٹھ صاحب نے کہا تھا۔ یعنی سیٹھ صاحب کا وجود کسی مرض میں مبتلا نہ ہونے کے باوجود اگلے سال نابود ہو گیا۔

دوسری مثال ایک مغربی دولتمند کی ہے وہاں ایسی حالت سینکڑوں زرداروں کی ہے۔ مسٹر راک فیلر کے نام سے آپ پورے طور پر واقف ہیں وہ دنیا کا سب سے بڑا مالدار یا کم از کم چند سب سے بڑے مالداروں میں سے ایک آدمی گنا جاتا ہے۔ اس کی کمائی کا تو کہنا ہی کیا۔ اس کی خیرات میں دئے ہوئے روپے کا ہی کوئی شمار نہیں تھا۔ ایک دفعہ اس نے ایک ریسرچ (RESEARCH) کے کام کے لئے ڈیڑھ کروڑ روپیہ دیا۔ لیکن جب اس عطیہ کا اعلان ایک جلسے میں کیا گیا جس میں وہ خود بھی موجود تھے۔ تو کہا گیا کہ مسٹر راک فیلر بڑے ہی شکریہ کے مستحق ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ جس کام کیلئے یہ روپیہ درکار ہے اس کیلئے

یہ رقم شاید کافی نہ ہوگی مسٹر راک فیلر نے یہ سنکر اس رقم میں بغیر کسی پس و پیش کے ایک کروڑ روپیہ کا اضافہ کر دیا۔ یعنی بجائے ڈیڑھ کروڑ کے اڑھائی کروڑ کر دیا۔ اب اس شخص کی دولت کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ لیکن یہ شخص بار بار کہتا ہوا سنا گیا۔ کہ اس قدر مال و دولت کے باوجود بھی راحت اور دلی خوشی اسکو نصیب نہیں۔ بلکہ وہ ہمیشہ فکر رنج میں غلطاں رہتا تھا۔

ان دو نو مثالوں سے آپ پر واضح ہو گیا ہوگا۔ کہ دنیا کی آسائشیں بھی خوشی بہم پہنچانے کا موجب نہیں ہو سکتیں۔ تو اب سوال ہو سکتا ہے۔ کہ خوشی حاصل کرنے کا پھر ذریعہ کیا ہے؟ کس چشمے سے یہ آب حیات مل سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب دینے سے پیشتر میں آپ سے عرض کرونگا۔ کہ آپ پہلے خوشی کے معیار کو سمجھ لیں کہ کس حالت کو خوشی کا عالم کہہ سکتے ہیں۔ مختصراً خوشی کی حالت وہ ہے کہ جب وہ کسی چیز یا انسان پر طاری ہو۔ تو اس کے دیکھنے والے بھی خوشی محسوس کریں مثلاً پہلے آپ انسانوں کو چھوڑ کر قدرت کی دیگر اشیاء کی طرف غور کریں۔ ایک پھول جب کھلا ہوا ہو تو وہ اس کی خوشی کی حالت ہوتی ہے اور دیگر لوگ بھی اسکو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی خوش رنگی سے آنکھوں کو طراوت اور اپنی خوشبو سے دماغ کو معطر کرتا ہے۔ مرجھایا ہوا پھول نہ خود خوش ہوتا ہے نہ دیکھنے والوں کو ہی خوشی مہیا کرتا ہے ایک پھلوں سے لدا ہوا درخت اور ایک ہرے ہرے پتوں سے بھرا ہوا پودا خود مسرت و انبساط کے عالم میں ہوتا ہے اور دوسروں کے اندر بھی وہی نقشہ پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ لوگ وہاں سے پھلوں کا لطف اور سایہ کا آرام حاصل کرتے ہیں۔ جب موسم خزاں میں پودا اور درخت بے برگ و بار ہو جائیں۔ تو ان پر خود بھی اداسی چھا جاتی ہے اور کوئی آدمی بھی ان کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ ایک کوئل اپنی سریلی آواز سے گاتی ہوئی اپنے ترنم سے خود بھی سرشار

ہوتی ہے اور سننے والوں کے دل میں بھی امنگیں پیدا کرتی ہے۔ اس طرح اُس صانع مطلق کی کائنات میں سے بہت سی اور بھی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ لیکن طوالت کے خوف سے اسی مختصر ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ان مثالوں سے شاید آپ یہ نتیجہ نکالیں۔ کہ پھول اور پودوں کی خوبصورتی اور کوئل کی آواز خوشی کے دینے والی چیزیں ہیں۔ لیکن یہ نتیجہ درست نہیں۔ کیونکہ خوبصورت تو سانپ اور شیر بھی ہوتے ہیں۔ اور بعض بعض سانپ تو بہت ہی خوبصورت ہوتے ہیں۔ لیکن کیا لوگ اُن کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ آوازیں تو گیدڑ اور کتے بھی شب و روز لگاتے ہیں۔ تو کیا اُن کی آوازوں کو سنکر لوگوں کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔ بالکل نہیں۔ سانپ کو تو دیکھتے ہی لوگ بغیر اس خیال کے کہ وہ کتنا خوبصورت ہے مار ڈالنے کو دوڑتے ہیں۔ اور کتے کو بھونکنے سے بند کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کی آواز کرخت ہوتی ہے۔

بعض لوگ خوشی کی تعریف یہ کرتے ہیں اور اکثر اہلِ لغت نے بھی یہی معنے لکھے ہیں کہ خوشی اپنے دل کی تسلی کا نام ہے۔ لیکن یہ معنے درست نہیں۔ مثلاً ایک چور کو اپنی چوری کے مشن میں کامیابی حاصل کرکے اپنے دل میں تسلی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سے ایک انتقام کا جذبہ رکھنے والے کو اپنے مخالف کو قتل کرکے یا کوئی دوسرا نقصان پہنچا کر یا اس کو دنیا میں مصیبت زدہ دیکھ کر دل میں تسلی ہوتی ہے تو کیا اس دل کی تسلی کو خوشی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ کبھی نہیں۔ ایسے ہی ایک مسلمان دیگر ملت والوں کو اپنے ملت میں شامل کرکے یا ایک ہندو یا عیسائی یا سکھ دیگر شریعت والوں کو اپنے دائرہ طریقت میں لا کر دل میں تسلی محسوس کرتا ہے تو کیا یہ حالت خوشی کے نام سے منسوب کی جا سکتی ہے۔ حاشا للہ۔ ان سب حالتوں میں دل کی جھوٹی تسلی کو انسان خوشی کا نام اسی طرح دے سکتا ہے کہ جیسے ایک شرابی شراب

پی کر یا بھنگی بھنگ پی کر یا افیمی افیم کھا کر خوشی محسوس کرتا ہے۔

یہ عرض ہو چکا ہے۔ کہ دنیا میں سارے کے سارے لوگ اس گوہر بے بہا کی طلب و تلاش میں مصروف ہیں لیکن کامیابی خال خال کسی خوش قسمت انسان کو ہی نصیب ہوتی ہے تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ دنیا میں خوشی ہے ہی نہیں۔ یا کیا وہ بہت کم مقدار میں موجود ہے اور اس لئے اکثر لوگوں کو باوجود انتہی تجسس اور سعی کے دستیاب نہیں ہوتی۔ یہ بات بھی نہیں۔ بلکہ کائنات کا کونہ کونہ اس جنس سے اٹا پڑا ہے۔ قدم قدم پر خوشی کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ جگہ جگہ پر اس کی دکان کھلی ہوئی ہے۔ قدرت ہزاروں ہاتھوں میں خوشی کے جام لیئے دنیا میں گردش کر رہی ہے۔ لیکن بدقسمت لوگ پھر بھی باوجود اس کثرت کے اس کو حاصل نہیں کر سکتے۔ آخر اس ساری بحث سے نتیجہ کیا نکلا۔ ایک طرف کہا جاتا ہے کہ یہ ایک ایسا گوہر نایاب ہے کہ جسے باوجود انتہائی کوشش و سعی کے اس کا حاصل کرنا کارے دارد۔ دوسری طرف بیان کیا جاتا ہے کہ دنیا بھر میں کوئی مقام خواہ وہ شہر ہے یا بیابان۔ پہاڑ ہے یا ریگستان ایسا نہیں پایا جاتا۔ کہ جہاں اس کی کثرت نہ ہو۔ یہ دو متضاد صورتیں کیسے ہو سکتی ہیں۔ اس بات کی سمجھ مندرجہ ذیل حکایت سے آجائے گی۔

ایک دیہاتی جس کو مٹھائی اور شیرینی کھانے کو بہت کم نصیب ہوتی تھی۔ شہر میں گیا۔ وہاں جا بجا پھرتا ہوا حلوائیوں کے بازار میں پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا۔ کہ انواع و اقسام کی لذیذ مٹھائیوں کے تھال بھرے رکھے ہیں۔ اور ان کے پاس ایک ایک دو دو آدمی بالکل صم بکم چپ چاپ بیٹھے ہیں۔ مٹھائی کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے وہ دیہاتی ان میں سے ایک کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور اپنے ہاتھ کی دونو انگلیاں اس کی آنکھوں میں داخل کرنے لگا۔ حلوائی نے للکارا کہ ارے نادان کیا کرتا ہے کیا مجھے اندھا کرنا چاہتا ہے؟ دیہاتی بولا۔ اوہو کیا تم کو دکھائی دیتا ہے؟

میں نے تو سمجھا تھا کہ تم دونو آنکھوں سے اندھے ہو - اور میں اپنے خیال کی تصدیق اپنی انگلیاں تمہاری آنکھوں کے پاس لیجا کر کرنا چاہتا تھا - حلوائی بولا کہ تم نے یہ نتیجہ کہاں سے نکالا کہ میں اندھا ہوں - وہ بولا کہ تیرے پاس رنگا رنگ کی مٹھائیوں کے اتنے تھال بھرے پڑے ہیں - اور تو ان کے پاس چپ چاپ بیٹھا ہے - ان کا ذرا لطف نہیں اٹھاتا - پھر بولا کہ تیرے اندھا ہونے میں کیا شک ہے؟ وہ حلوائی اور سب تماشائی لوگ ہنس پڑے - اور انہوں نے دیہاتی کو بے وقوف سمجھا - بیشک لوگوں نے دیہاتی کو نادان اور عقل سے بے بہرہ خیال کیا - لیکن اس نے بات پتہ کی کہی تھی - دنیا کے اندر خوشی کے ڈھیر اسی طرح لگے ہوئے ہیں - لیکن اہل دنیا اس کے پاس چپ چاپ بیٹھے ہوئے ہیں - اس سے محظوظ نہیں ہوتے ؛

ایک اور مثال لیجئے - دنیا کے اندر کھلی اور تازہ ہوا کی کمی نہیں - بلکہ جتنی مقدار میں وہ موجود ہے شاید ہی اور کوئی چیز ہو - پھر کیا وہ مول بکتی ہے؟ یہ بھی نہیں تاہم لوگ کمروں کے اندر خود بخود بند رہ کر اس نعمت غیر مترقبہ سے محروم رہتے ہیں اور قسم قسم کے امراض میں مبتلا ہوتے ہیں - ایسے ہی خوشی کا حال ہے -

ایک اور مثال بھی عرض کرتا ہوں، بے اندازہ طاقت قدرت کے خزانے میں موجود ہے - جو بھی انسان قدرت کے ذخیرے سے طاقت لیکر اپنے جسم کو توانا اور مضبوط بنانا چاہیں - انہیں نہ کچھ دام دینے پڑتے ہیں نہ کسی کا احسان اٹھانا پڑتا ہے محض محنت اٹھانی ہوگی - ڈنڈ پیلنے پڑیں گے کشتی کرنی ہوگی - ہاتھ پاؤں کو حرکت دینی ہوگی اور طاقت حاصل ہو جائیگی - اسی طرح قدرت کے ذخیرے میں خوشی کی بھی انتہا نہیں بے انداز موجود ہے - لیکن لوگ کوئی تردد نہیں کرتے -

امریکہ کا مشہور مصنف ولیم گلمور سمز لکھتا ہے کہ "خوشی وہ سودا ہے جو کہ ہزاروں دکانوں پر بکتا ہے اور ہزاروں ہی اس کے گاہک ہیں لیکن ملتا وہ کسی کسی کو ہی ہے -

کیونکہ یا تو لوگوں کو اس کی اہمیت ہی معلوم نہیں ہوتی - اور یا وہ (خوشی) خود نہیں ٹھہرتی کیونکہ کوئی بھی آدمی اس سودے کی خریداری سے مطمئن معلوم نہیں ہوتا - یہ چیز بکتی تو ضرور ہے لیکن اس کا اٹھا کر دینا مشکل ہے۔" اسکے نہ ملنے کی وجوہات یہی ہیں کہ :-

۱- اول تو لوگ حلوائی کی طرح اسے دیکھتے ہوئے بھی اندھے ہو رہے ہیں غیریت اور نفرت کا جالا آنکھوں میں ہونے کے باعث اُسے دیکھ نہیں سکتے -

۲- کھلی ہوا کی طرح اس کی خبر رکھتے ہوئے بھی اُسے لینے کے لئے باہر نہیں نکلتے تنگدلی اور تنگ ظرفی کے کمروں کے اندر بند رہتے ہیں - تعصب اور تنگ نظری کے دائروں میں گھرے رہتے ہیں اور اس طرح سے خود بخود اس سے محروم رہتے ہیں -

۳- طاقت کی طرح سے سارا کرّہ ہوائی خوشی سے بھرا ہوا ہے - لیکن جیسے طاقت کے حاصل کرنے کے لئے لوگ محنت نہیں اٹھاتے ایسے ہی حصولِ خوشی کیلئے دوسروں کی خدمت اور بنی نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے تکلیف نہیں اُٹھاتے اور اس چشمۂ شیریں سے دُور رہی رہ جاتے ہیں -

خوشی کی ٹھیک تعریف اور خوشی کے ٹھیک معنی اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ دل زبان اور ہاتھ سے دوسروں کی بھلائی کرنا - اور دوسروں کی خوشی کے سامان مہیا کرنا - یہی وہ تل ہیں جن سے خوشی کا تیل نکل سکتا ہے یہی وہ دودھ ہے جس میں سے خوشی کا مکھن حاصل کیا جا سکتا ہے یہی وہ منتر ہے - جس کے ذریعہ خوشی کو قابو میں لایا جا سکتا ہے - یہی وہ تعویذ ہے جس کے باندھ لینے سے خوشی بس میں آسکتی ہے -

ایک فرانسیسی مضمون نویس جین ڈے لابرومیر کا قول ہے کہ سب خوشیوں سے لطیف ترین اور نازک ترین خوشی کے حاصل کرنے کا گر یہ ہے کہ انسان دوسروں کی خوشی میں اضافہ کرے - اور ان کی خوشی میں اپنی خوشی سمجھے۔"

لوگ خوشی ڈھونڈتے ہیں - تلاش کرتے ہیں - لیکن یہ تلاش سے ملنے کی چیز

نہیں امریکن پادری جے ایم لڈلو لکھتا ہے۔ کہ" اس شخص سے بڑھ کر دنیا میں کوئی احمق نہیں کہ جو خوشی کی تلاش کہیں باہر کرتا ہے۔ کیونکہ جو خوشی وہ فرائض مخصوصہ کی ادائیگی کے بغیر تلاش کرے گا اس کی یہ کوشش ایسی ہی ہوگی۔ جیسے اپنے دل کے اندر ایک اور شعلہ بھڑکانا جو کہ اس کی ہڈیوں تک کو چٹ کر جائیگا"

جو خوشی کی تلاش کی جاتی ہے۔ جو دنیاوی چیزوں کے حصول میں خوشی سمجھی جاتی ہے وہ خوشی حقیقی نہیں ہوتی۔ وہ جھوٹی خوشی ہوتی ہے ایک امریکن مشہور قانون دان اور مصنّف لکھتا ہے کہ "ساری خوشی حاصل کرنے کے لئے محنت اٹھانی پڑتی ہے لیکن خوشی دو قسم کی ہوتی ہے۔ حقیقی اور باطل۔ ان میں فرق یہ ہوتا ہے کہ سچی خوشی کے لئے قیمت پہلے ادا کرنی پڑتی ہے۔ اور جھوٹی خوشی کے لئے بعد میں"

چیز کی قیمت پہلے ادا کرنے کی صورت میں وہ چیز اپنی ہو جاتی ہے۔ سدا اپنے پاس رہتی ہے۔ اور کوئی تشویش یا کھٹکا نہیں ہوتا لیکن جس چیز کی قیمت بعد میں ادا کی جائے اسکے متعلق اوّل تو علم نہیں ہوتا کہ کتنی قیمت، کس شکل میں کب تک اور کس وقت ادا کرنی پڑے پھر وہ چھن بھی سکتی ہے۔ اس لئے دیر پا نہیں کہی جاتی۔ جو لوگ دنیاوی چیزوں کے اندر عیش و آرام اور خوشی کے متلاشی ہیں۔ انہیں فرانسیسی خاتون میڈم ڈے لمبرٹ کا قول یاد رکھنا چاہیئے۔ وہ لکھتی ہیں۔ کہ" دنیاوی خوشیاں بڑے دھوکے کی چیز ہیں۔ ظاہرہ بڑی آرام دہ معلوم ہوتی ہیں۔ اور ان کی تلاش میں زحمت بھی کافی اٹھانی پڑتی ہے لیکن جب حاصل ہو جائیں۔ تو اطمینان میسّر نہیں ہوتا۔ اور چونکہ جلدی ختم ہو جاتی ہیں۔ اس لئے بڑی مایوسی کی حالت میں چھوڑ جاتی ہیں"

دنیاوی چیزیں جو خوشی سکھ دینے والی خیال کی جاتی ہیں۔ اور جنکو حاصل کرنے کے لئے کوشش کی جاتی ہے وہ عام طور پر حسب ذیل ہیں۔ (۱) زر و مال (۲) عیش و نشاط (۳) توقیر و عزت (۴) عبادت۔ اُن پر غور کریں۔

۱۔ زر و مال و دنیاوی جاہ و حشمت۔ کوئی آدمی زر و مال سے بڑا نہیں بن سکتا مشہور مصنف ایل۔ اے سینیکا کے قول کے مطابق بڑا آدمی وہ ہے کہ جو اپنے مٹی کے پیالہ کو جام بلوری سمجھتا ہے۔ اور جام بلوری کو کوزۂ گل سے زیادہ وقعت نہیں دیتا۔

کٹھ اپنشد کے اندر آتا ہے۔ کہ رشی نچکیتا سے یم راج نے خوش ہو کر ور مانگنے کو کہا۔ نچکیتا نے کہا کہ مجھے زندگی اور موت کی حقیقت سمجھاؤ۔ یم نے کہا کہ تم یہ سوال نہ پوچھو۔ البتہ اور دنیا کا جتنا زر و مال مانگنا چاہتے ہو مانگ لو۔ نچکیتا نے پوچھا کہ کیا زر و مال اس مسئلہ سے افضل ہیں۔ جو کہ میں نے پوچھا ہے۔ تب رشی نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر نچکیتا نے کہا۔ کہ ایسی صورت میں تب زر و مال کا خیال چھوڑ کر اسی مسئلہ کا حل دریافت کرونگا۔ زر و مال کی نہ مجھے ضرورت ہے نہ خواہش

سکھ شاستر میں لکھا ہے۔

جیسے مدھو ماکھی سینچ سینچ کے اکٹھ کرے ہرے مدھو ہارتاں کے مکھ چھار ڈار کے
تیسے کوٹ پاپ کر پاپا جور جور موڑھ انت کال چھاڈ چلے دونو کر جھار کے

یعنی جیسے شہد کی مکھی کہیں کہیں سے پھولوں میں سے شہد اکٹھا کرتی ہے لیکن چھتہ اتارنے والا مکھیوں کے منہ میں مٹی ڈال کر شہد لے جاتا ہے۔ ایسے ہی خوشی کے لئے کئی قسم کے گناہ کر کے زر و مال اکٹھا کرنے والے آخر کار ہائے ہائے کرتے اس دنیا سے دونو ہاتھ جھاڑ کر چل دیتے ہیں۔

قرآن شریف کی سورت ۹ رکوع ۵ میں آیا ہے کہ "جو لوگ خود غرضی کے خیال سے روپیہ جمع کرتے ہیں۔ آخرت کے روز جمع کردہ سکے تپا تپا کر ان لوگوں کی پیشانی اور پیٹھ پر لگائے جائیں گے۔ اور کہا جائیگا کہ یہ وہی چیز ہے کہ جسکو تم اکٹھا کرتے رہے تھے۔"

اس لیئے جو لوگ جائز اور ناجائز طریق پر زر و دولت فراہم کر کے خوشی کے خواہاں رہتے ہیں ان کو شاستروں کے فرمان دھیان سے پڑھ کر بخوبی نگاہ میں رکھنے چاہئیں۔ اور یاد

رکھنا چاہیئے کہ خوشی دینے والی چیز کوئی اور ہے وہ کیا ہے ؎

ہزاروں مرگئے قاروں سے بڑھکر خدا زر دے تو دل دے آدمی میں
خدا بخشے تو بخشے دولت عشق مجھے لاکھوں کروڑوں ہیں اسی میں

ہم اگر حقیقتاً خوش رہنے کی دولت چاہتے ہیں تو ہمیں اُلفت و محبت اور نیکی و بھلائی کی دولت اکٹھی کرنا چاہیئے۔ دنیاوی زر و مال راحت رساں شے نہیں ہوتا ؎

عبث ہر طالب دولت پہ تجھ کو رشک و حسرت ہے
نہ ہر طاقت میں نیکی ہے نہ ہر دولت میں راحت ہے

دوم عیش و عشرت۔ یہ بھی حقیقی راحت رساں شے نہیں۔ اس سے جو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ وہ جھوٹی اور نقلی ہوتی ہے۔ اور بعد میں اس کی بہت زیادہ قیمت ادا کرنا پڑتی ہے ؎

خاتمہ عیش کا حسرت ہی پہ ہوتے دیکھا روکے ہی اٹھے ہیں اس بزم سے گانے والے

اس لئے عیش و عشرت سے بھی پرہیز لازم ہے۔ امریکن پادری رچرڈ فُلر صاحب لکھتے ہیں۔ کہ دنیاوی عیش و عشرت کی خوشیاں اکثر عارضی، نقلی اور دھوکہ دہ ہوتی ہیں شراب کے نشے کی طرح عیش و عشرت اگر ایک گھڑی کے لئے محظوظ کرتی ہے تو سینکڑوں گھڑیوں کے لئے مغموم کرتی ہے۔ دنیاوی عیش و عشرت ایک نفس کے بندے کو تو چاہے طفل تسلی دے۔ لیکن اہلِ نظر اس کی حقیقت کو بخوبی سمجھتا ہے اور وہ اس کی ظاہرہ چمک کے دھوکے میں نہیں آتا۔ وہ اس کے نتائج سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے ؎

جہاں کی زینتیں راحت رساں ہیں چشم غافل میں!
مگر حق جو کے مضطر دل کو ساکن کر نہیں سکتیں

سوم۔ بزرگی و بڑائی۔ دنیا کے اندر بڑائی کا طالب بھی حقیقی مسرتوں سے بہت دور رہتا ہے۔ عزت کا طلبگار بھی اصلی راحت سے مہجور رہتا ہے دنیاوی عزت و آبرو

خوشی کا باعث نہیں بن سکتی حقیقی بزرگی کیا ہے۔ سر ولیم جونز لکھتے ہیں "کہ اگر مجھ سے سوال کیا جائے کہ سب سے بڑا انسان کون ہے۔ تو میں جواب دونگا کہ وہ جو کہ سب سے اچھا ہے۔ پھر اگر سوال ہو کہ سب سے اچھا کون ہے؟ تو میرا جواب ہوگا کہ وہ جس نے بنی نوع انسان کی سب سے زیادہ خدمت کی ہے" ہیرڈ مانتے ہیں سب سے بڑے آدمی وہ مجھے ہیں جو اپنے ہم جنسوں سے محبت کرنے والے تھے۔ یہ وصف انسانوں کے حقیقی پیشواؤں میں پائے جاتے ہیں۔ انسانوں کے اندر اعتماد اور انسانوں کے ساتھ الفت ہی حقیقی بڑائی کی علامات ہیں۔

امریکن پادری فلپس بروکس لکھتے ہیں۔ کہ کسی آدمی کو بڑائی حاصل نہیں ہوتی اگر اس نے یہ محسوس نہیں کیا۔ کہ اس کی زندگی کی مالک کل نسل انسانی ہے اور جو کچھ رب کریم نے اسکو عطا کیا ہے وہ بنی نوع انسان کے لئے خرچ کرنے کو ملا ہے۔

پس اگر ہم بڑائی کے ذریعہ خوشی کے طالب ہیں۔ تو ہمیں اس قسم کی بڑائی کے خواہشمند ہونا چاہیئے۔ کیونکہ یہی بڑائی اصلی راحت و مسرت مہیا کر سکتی ہے۔

چہارم عبادت۔ پرستش بھگتی یا عبادت الٰہی بلاشبہ باعث مسرت ہوتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ایک شرط ہے وہ کیا ہے

عشق ہی جسکو نہیں ہے اسے ایمان نہیں اپنے مذہب میں کافر ہے مسلمان نہیں۔

کوئی عبادت۔ کوئی ریاضت۔ کوئی تپسیا۔ کوئی بھگتی۔ کچھ خوشی نہیں دے سکتی اگر اس کے ساتھ ساتھ انسانی محبت اور خدمت کا جذبہ کام نہیں کرتا۔ ٹھیک تو کہا ہے ؎

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں!
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں!

یونانی فلاسفر مسٹر فلر لکھتے ہیں "انسانوں کا اندازہ ان کے اتوار کے دن گرجا گھر جانے سے نہ لگاؤ۔ بلکہ دیکھو کہ وہ باقی ایام میں اپنے بھائیوں سے کیا برتاؤ کرتے ہیں"

سر ولیم پن مشہور انگریز مصنف لکھتے ہیں کہ سارے منکسر المزاج۔ ہمدرد۔ انصاف پسند اور حقیقی انسانوں کا مذہب ایک ہی ہوتا ہے۔ اور ان اوصاف میں سے انسانی ہمدردی خاص درجہ رکھتی ہے۔ خوفِ خدا انسان کیلئے بڑا ضروری ہے۔ اور سارے عابد انسان جو کہ ریا سے بالاتر ہوتے ہیں۔ ہمیشہ اپنے مالک سے ڈرتے رہتے ہیں۔ لیکن سچے خدا دوست انسان کے اندر ایک اور تڑپ بھی ہونی چاہیئے۔ وہ کیا ؎

یا خوفِ خدا یا خوفِ سقر ہیں دو ہی بیاں یہ تیرے واعظ
اللہ کے بندے دل میں ترے ہے سوز و گداز محبت بھی؟

اس سوز و گداز کی قدر، اس تڑپ کی منزلت، اس چبھن کی عظمت بیان کرتے ہوئے حضرت اقبال نے تو حد ہی کر دی ہے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

ایک اور بات اس بارہ میں روحانی پہلو کی نگاہ سے عرض کرنا ضروری ہے۔ پرشن اپنشد کے اندر آتا ہے کہ پرماتما نے ہمارے حواسِ خمسہ باہر کی طرف منہ والے بنائے ہیں اور یہ اپنا زور باہر کی طرف ہی لگاتے ہیں۔ یعنی باہر کی دنیاوی چیزوں کی طرف دوڑتے ہیں۔ آنکھ خوبصورت نظاروں کے دیکھنے کی مشتاق رہتی ہے۔ زبان لذیذ کھانوں کی خواہشمند ہوتی ہے۔ کان سُریلی آواز کے طلبگار رہتے ہیں۔ ناک اچھی خوشبو کی خواستگار ہوتی ہے ان سب سے بڑھکر دل کی باہر کی طرف دوڑ کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں لگا سکتا۔ باہر کی طرف دوڑنے سے ان حواس کی سیری نہیں ہوتی۔ وہ آگے ہی آگے بڑھتے ہیں۔ جا بجا بھاگتے ہیں اور اس طرح سے انسان کو بہکاتے ہیں۔ اس لئے اپنشد میں لکھا ہے کہ جو انسان حقیقی راحت کا متلاشی ہے۔ اسے ان حواس کا منہ باہر سے موڑ کر اندر کی طرف کر دینا چاہیئے۔ بس پھر وہ راحت کے چشمہ پہ پہنچ جائیں گے اور

تب آنکھ کو وہ نظارہ حاصل ہوگا۔ کہ جس سے وہ ہٹنا نہ چاہیگی کانوں کو وہ راگ سُنائی دیں گے جن کی دنیا میں مثال نہیں۔ دل کو ایسی ٹھنڈک اطمانیت اور شانتی حاصل ہوگی کہ وہ اپنی صدا ورخوتے بد کو چھوڑ کر سدھے ہوئے گھوڑے کی طرح چابک کا محتاج نہ رہے گا۔ جدھر باگ موڑی جائیگی چپ چاپ اس طرف ہولیگا۔ بیرونی آنکھوں کو بند کر کے اندر کی دید میں جو لطف حاصل ہوتا ہے اس کا بیان تحریر و تقریر سے باہر ہے۔ اس کو وہی لوگ جانتے ہیں۔ کہ جنھوں نے اس کا احساس کیا ہے۔ گونگے کے گڑ کی مثال ہے گونگا گڑ کھا کر جو لطف اٹھاتا ہے اسے بیان نہیں کر سکتا ہے ؎

جب تلک آنکھیں کھلی ہیں دکھ یہ دیکھیں گے ہم
مند گئیں جب انکھڑیاں تب ... آنند ہیں!

آنکھ کو مُوند کر اندرونی نظارہ کا جو لطف ... آنکھیں کھلی رکھنے سے یعنی لذّات کے پیچھے بھاگنے سے حاصل نہیں ہوسکتا ہے

موند رکھنا چشم کا ہستی میں عین دید ہے ... نہیں جب آنکھ کھولے ہے حباب

قرآن شریف کے اندر تین نفس ... نفسِ امارہ یعنی دنیاوی خواہشات کے پیچھے دوڑنا۔ سورۃ نازعات میں لکھا ... وہی شخص دائمی خوشی کا حصہ دار ہوسکتا ہے کہ جس نے اپنے نفس امارہ کو کچلا ... یہ نفس انسان کو گناہ کی طرف کشاں کشاں لے جاتا ہے۔ دوسرے درجہ پر نفس لوّامہ ہو کہ انسان کو ملامت کرتا ہے۔ کہ اے نادان! تو نے ایسا کیوں کیا۔ لیکن انسان کی کچھ ایسی فطرت ہے۔ کہ کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد پھر اسی کھوٹی راہ پر ... ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خواہشات کا غلبہ بڑھتے بڑھتے ملامت کا ... نفس سے مفقود ہو جاتا ہے۔ اور یہ نفس لوّامہ پھر نفس امّارہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ تیسرا نفس مطمئنّہ ہے یعنی اگر نفس لوّامہ جاگتا ہے تو رفتہ رفتہ انسان کو خواہشات دنیاوی سے مطلق سروکار

نہیں رہتا۔ اس درجہ پر پہنچکر انسان کے اندر خوشی کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہے۔ حتیٰ کہ اسکو خود سمجھ نہیں آتی۔ کہ یہ خوشی کی نسیم کہاں سے آرہی ہے۔

کیا وہ حالت یا وہ درجہ یا وہ مقام کوئی معمولی چیز ہے؟ نہیں۔ وہ کسی کسی خوش قسمت انسان کے حصہ میں آتا ہے۔ اُس کے لئے صاحب زر و مال اور صاحب جاہ و جلال ترستے ہیں۔ وہ مقام کیا ہے؟ ؎

یہ اوج یہ مرتبے ہما کو نہ ملے ‏ ‏ ‏ ‏ یہ دلق مرقع امرا کو نہ ملے
بخشی ہے خدا نے ہمکو دولتِ فقر ‏ ‏ ‏ ‏ برسوں ڈھونڈے تو بادشاہ کو نہ ملے

اگر ہم لوگ بھی اس مقام پر پہنچنے کے شائق ہیں۔ اگر ہم کو بھی سرورِ سرمدی اور راحتِ جاودانی کی طلب ہے تو لذاتِ دنیا سے ہاتھ اُٹھانا ہوگا۔ حرص و لالچ سے پیچھا چھڑانا ہوگا۔ کذب و فریب سے مُنہ موڑنا ہوگا۔ عیش و عشرت کو خیرباد کہنا ہوگا اور باطنی آنکھوں کو وا کرنا ہوگا ؎

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی ‏ ‏ ‏ ‏ ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

کھلی آنکھوں سے تو ایک خاص حد تک ہی دنیا کی چیزوں کو دیکھا جا سکتا ہے کچھ فاصلے سے آگے یہ آنکھیں دیکھنے سے معذور ہوتی ہیں۔ لیکن اگر باطن کی طرف اُن کا رخ کر دیا جائے۔ تو ع

بند کیں آنکھیں تو دیکھے سینکڑوں عالم نئے

خوشی کے متعلق چند مغربی فلاسفروں اور مصنفوں نے نہایت قیمتی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جو قارئین کے مطالعہ کے لئے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

۱۔ امریکن مصنف مسٹر ایچ ہاتھورن لکھتے ہیں کہ خوشی وہ پرندہ ہے کہ اگر اس کا تعاقب کرو۔ تو ہاتھ نہیں آتا۔ لیکن اگر چپ چاپ بیٹھ جاؤ۔ تو شاید خود بخود اُتر کر تمہارے پاس آجائے۔

۲- فرانسیسی فلاسفر چارلس ڈے سکنڈنٹ ڈشیکو لکھتے ہیں کہ اگر تو انسان کی صرف اس قدر ہی خواہش ہو کہ میں خوش رہوں تب تو شاید پوری بھی ہو جائے لیکن اکثر آدمی دوسرے لوگوں سے خوش تر ہونا چاہتے ہیں اور طرفہ یہ کہ وہ اوروں کی خوشی کا اندازہ بھی غلط لگاتے ہیں۔

۳- فرانسیسی مصنف ڈکر ڈے لا اوچے فوکالڈ لکھتے ہیں کہ اہلِ دانش کی خوشی کے لئے تو معمولی چیزیں کافی ہوتی ہیں۔ لیکن خارج از عقل انسانوں کو کسی چیز سے بھی طمانیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کے زیادہ تر لوگ دکھی رہتے ہیں۔ اور سکھ یا خوشی کی تلاش میں ہی عمر گذار دیتے ہیں۔

۴- انگلستان کے پادری جان ٹلوٹ سن لکھتے ہیں۔ کہ انسان حصولِ خوشی کیلئے ہزاروں تدبیریں کرتا ہے لیکن جتنی تیزی سے وہ تعاقب کرتا ہے۔ اس سے زیادہ تیزی سے وہ اڑ کر آگے نکل جاتی ہے۔ دور سے ہم کو ہر ایک چیز خوشی دینے والی محسوس ہوتی ہے لیکن جب ہم اسکے نزدیک جانا چاہتے ہیں تو یا تو ہم اس تک پہنچ نہیں سکتے یا اس کا اندازہ ہماری توقع کے خلاف نکلتا ہے ہاں اس بات کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ان دونوں باتوں میں سے کونسی زیادہ مایوس کن ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم امیدیں بہت باندھتے ہیں۔ یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ ایک مصیبت جس کا کہ خوف مدتوں سے لگا ہے زیادہ کلفت دیتی ہے۔ بمقابلہ اس کے جس میں ہم واقعی مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یعنی جھوٹی امید بجائے خود ایک کلفت ہوتی ہے۔

۵- امریکہ کے مشہور متمول اور سخی مسٹر اینڈریو کارنیگی لکھتے ہیں کہ خوشی کا راز تیاگ یعنی ترکِ خواہشات میں ہے۔ انگلستان کے ناولسٹ مسٹر ای۔ جی۔ بلٹور لکھتے ہیں کہ خوشی اور نیکی ایک دوسرے پر انحصار رکھتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جو دنیاوی لحاظ سے اعلیٰ ترین آدمی ہوں وہ خوش ترین بھی ہوں۔ البتہ خوش ترین انسان ضرور

بزرگ ترین ہوتے ہیں۔

۶۔ انگلستان کے شاعر مسٹر ایل۔ ای لینڈن لکھتے ہیں کہ عام طور پر جو انسان ہمیشہ کسی نہ کسی کام میں مشغول رہتے ہیں۔ ان کو بہت کم کبیدہ خاطر پایا جاتا ہے۔

۷۔ انگلستان کے ناولسٹ جیم پورٹر لکھتے ہیں کہ خوشی ایک ایسی شعاع ہے کہ جو ہزاروں دلوں میں گذرتی ہوئی بھی لیتیرکی آنے کے ویسی کی ویسی رہتی ہے بلکہ وہ شعاع جب ایک شیشے جیسے صاف دل پر پڑتی ہے تو اسکی چمک دوبالا ہو جاتی ہے لیکن وہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک ہم کسی اور کو شریک خود نہ کرلیں یعنی جب تک اوروں کو بھی خوش نہ کریں۔

ایک مہاتما نے لکھا ہے کہ جو انسان خوش رہنا چاہتے ہیں۔ ان کو زندگی کا مفصلہ ذیل دستور العمل بنانا چاہیئے۔ ان کی ہدایت ہے کہ وہی انسان حقیقی طور پر خوش رہ سکتا ہے کہ جو ذیل کے اصولوں پر کاربند ہو۔ یعنی:-

۱۔ سچائی سے محبت کرے

۲۔ تنگدستی اور فارغ البالی ہر دو حالتوں میں راستی پر قائم رہے۔

۳۔ خواہ سر پر ننگی تلوار دھری ہو۔ اور سر قلم ہونے کا اندیشہ ہو تاہم ایسی حالت میں بھی سچائی کو فروخت کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔

۴۔ سب سے پہلے شیطان (نفس امّارہ) اور اسکے چیلوں کو منتشر کرے۔

۵۔ گناہ کے خیال کو کبھی دل میں جگہ نہ دے۔

۶۔ اپنی آتما کو باوجود عیش و عشرت کے سامان مہیا ہونیکے گناہ سے پاکیزہ رکھے

۷۔ حرص و آز کے مادہ کو بڑھنے سے روکتا رہے۔

۸۔ اگر گناہ کے لئے پھولوں کی سیج پر بھی بلایا جائے تو اپنی ہمت سے وہاں سے بچے۔

۹۔ سوائے بداعمالی کے کسی سے نہ شرمائے۔

۱۰۔ سوائے پرماتما کے کسی سے نہ ڈرے۔
۱۱۔ اپنی تعریف سے غرور میں نہ آئے اور مذمت سے رنجیدہ خاطر نہ ہو۔
۱۲۔ ہر وقت دل آزاری اور ضرر رسانی کے خیالات کو چھوڑ کر ہر بنی نوع انسان کی بھلائی کے لئے تیار رہے۔

اس ساری بحث کے بعد ہم مفصلہ ذیل نتائج پر پہنچتے ہیں :۔
۱۔ خوشی قدرت کے اندر بھری پڑی ہے۔ لوگ اس کی تلاش بھی کرتے ہیں۔ لیکن بہت کم آدمیوں کو وہ نصیب ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک تو وہ درست تدابیر اختیار نہیں کرتے۔ دوسرے غلط جگہ پر تلاش کرتے ہیں۔ یعنی خوشی کا چشمہ تو انسان کے اندر ہے باہر نہیں لیکن تلاش عام طور پر باہر کی جاتی ہے۔
۲۔ دنیا کے زر و مال، جاہ و حشمت اور توقیر و منزلت کی خواہش میں خوشی نہیں ہے نہ ہی ان چیزوں کے حاصل کرنے سے ملتی ہے۔ ہاں خوشی ملتی ہے۔ ان چیزوں کے چھوڑنے میں یا اپنے بھائیوں کو دے دینے میں۔
۳۔ خوشی حاصل کرنے کا اصل ذریعہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو دوسروں کی خدمت میں اور دوسروں کی بہبودی میں لگا دے۔ عبادت الہٰی سے بھی تبھی فیضیابی ہوتی ہے کہ جب ساتھ ساتھ انسانی ہمدردی، خدمت اور الفت کا جذبہ بھی کام کرے۔
۴۔ جو لوگ شہریوں کے اختلاف کی وجہ سے یا ملکی تقسیم کی وجہ سے یا کسی قسم کے دیگر اختلافات کے باعث انسانوں کے کسی بھی گروہ سے بغض، کینہ، حسد یا تعصب رکھتے ہوئے ان سے نفرت کرتے ہیں۔ یا ان کی دلآزاری کے درپے رہتے ہیں۔ یا اُن پر جفا روا رکھتے ہیں ان سے خوشی کوسوں دُور رہتی ہے۔

خوشی حاصل کرنے کا یقینی، آزمودہ، مجرب اور فوری کارگر ہونے والا نسخہ عرض کیا جاتا ہے۔ جو صاحب اس کا استعمال فرمائیں گے۔ بلاشبہ ان کو بحیلہ

رنج وغم۔ افسردگی وملال کے راحت وخوشی مسرت وشادمانی حاصل ہو گی۔

انسانیت ۔	اُلفت ۔	ہمدردی ۔	نیکی ۔	خوش اخلاقی ۔	رواداری	
۵ تولہ	۵ تولہ	۵ تولہ	۵ تولہ	۵ تولہ	۵ تولہ	
خوش کلامی ۔	خدمت ۔	قناعت				
۵ تولہ	۵ تولہ	۵ تولہ				

ان سب چیزوں کو ہموزن لے کر خدا ترسی کے اوکھل میں باریک کریں۔ پھر میل ملاپ کے پانی سے حل کریں۔ ایثار اور نفس کُشی کے چولھے پر چڑھا کر درد دل کی آگ سے جوش دیں۔ پھر اتار کر صدق دلی کے کپڑے میں چھان لیں۔ اور نیک دلی کی قند ملا کر حقوقِ ہمسائیگی کے پیالہ میں ڈال کر پی لیں۔ پھر مصالحت کے بستر پر ذرا آرام کریں۔

خوراک ۔ نکوکاری ۔ بھلائی ۔ پاکیزگی ۔ انصاف ۔ راستی۔

پرہیز۔ بدخیالی ۔ نفرت ۔ غیبت ۔ بغض ۔ حسد ۔ حقارت ۔ کینہ ۔ تعصب ۔ بدمنشی ۔ تنگ نظری ۔ دل آزاری ۔ دھوکہ ۔ ریا ۔ فریب ۔ جھوٹ ۔ شر ۔ فساد ۔ ظلم ۔

آزمائش شرط ہے بفضلہ دلی مراد بیقینی طور پر برآئے گی۔

انسان اور اس کی تقدیر

مختار بھی مجبور بھی کاموں میں بشر ہے
اس سے یہ سزاوار جزا ہے بھی نہیں بھی

تقدیر کا ایک بڑا نازک اور اہم مسئلہ ہے اور اس پر میرے جیسے معمولی لیاقت کے آدمی کے لئے بحث کرنا بڑا مشکل ہے۔ لیکن چونکہ یہ مسئلہ انسان کی زندگی پر ایک بڑا بھاری اثر رکھتا ہے اس لئے خالق برتر کی مدد کے بھروسے پر چند سے اس موضوع پر لکھنے کا حوصلہ کرتا ہوں۔

یہ مسئلہ ہمیشہ سے ہی زیر بحث رہا ہے مذہبی کتب میں بھی اور اخلاقی کتب میں بھی اس کے متعلق متضاد خیالات پائے جاتے ہیں۔ اور انسان بڑی پریشانی میں پڑ جاتا ہے کہ وہ کون سے خیالات کی پیروی کرے۔ اور کن خیالات کے متعلق اپنا طرز عمل بنائے۔ کیونکہ ایک طرف تو اس میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ کہ مالک کل کے حکم کے بغیر ایک پتہ نہیں ہل سکتا۔ اور جو کچھ تقدیر میں لکھا ہے وہی ہو کر رہے گا۔ اور دوسری طرف یہ ہدایت ملتی ہے۔ کہ انسان اپنی ہمت اور تدبیر سے جو کچھ چاہے کر سکتا ہے۔ تقدیر کوئی چیز نہیں۔ مثلاً:۔

۱۔ ایک طرف تو اتھروید میں (۷-۵۰-۸) میں لکھا ہے کہ اگر ہمت میرے اپنے ہاتھ میں ہو تو کامیابی میرے بائیں ہاتھ میں حاضر ہوگی۔ دوسری طرف اسی وید (۹-۱۰-۱۵) میں لکھا ہے کہ اے میرے مالک! میں تو کچھ بھی نہیں جانتا ہوں اپنے متعلق بھی کچھ نہیں جانتا۔ آپ کی کرپا سے ہی میں کچھ حاصل کر سکتا ہوں۔

۲- بالمیک رامائن کے ایودھیا کانڈ میں لکھا ملتا ہے۔ کہ جب رام کو جنگل میں جانے کا حکم ہوا۔ تو وہ بخوشی اسکو قبول کر کے اپنے چھوٹے بھائی لچھمن سے یوں کہنے لگے :-

" اے لچھمن سلطنت کے نہ ملنے اور جلا وطنی کے لئے قسمت ہی ذمہ وار ہے۔ اگر میری قسمت ایسی نہ ہوتی تو کس طرح سے کیکئی ماتا کو یہ خیال آ سکتا تھا۔ کیا کوئی انسان اپنی قسمت سے لڑ سکتا ہے ؟ رنج و خوشی۔ نفع و نقصان۔ خوف و خطر پیدائش اور موت وغیرہ جو کچھ ہوتا ہے وہ قسمت سے ہی ہوتا ہے۔ جو کچھ انسان کو اتفاق سے یا بغیر کوشش کئے ملتا ہے۔ یا بغیر ارادے کے ملتا ہے۔ وہ بھی قسمت سے ہی ملتا ہے "

یہ الفاظ سنکر لچھمن جواب دیتا ہے :-

" اے بہادر رام ! قسمت کے متعلق ایسے الفاظ جو آپ نے کہے ہیں سوائے اس آدمی کے اور کون کہہ سکتا ہے کہ جس کا دماغ چکرا گیا ہو۔ تم قسمت کی کیوں اتنی بڑائی کر رہے ہو۔ کہ جو ایک نکمی بے طاقت اور ہیجڑوں کی سی چیز ہے۔ قسمت قسمت وہی لوگ پکارتے ہیں کہ جو نامرد، نکمے اور بزدل ہوتے ہیں "

۳- پھر گیتا میں ایک جگہ تو اٹھارہویں ادھیائے میں لکھا ہے کہ سارے ارض وسما کا مالک قلب کے اندر بیٹھا ہوا سارے انسانوں کو اپنی مایا سے ایسا گھماتا ہے جیسے کوئی آدمی کسی کلدار چیز پر بیٹھا ہو۔ اور دوسری جگہ دوسرے ادھیائے میں کہا ہے۔ کہ جب ارجن نے یہ دیکھ کر کہ لڑائی میں اس کے سب نزدیکی رشتہ دار ہی طرفین میں موجود ہیں۔ لڑائی کرنے سے انکار کر دیا۔ تو بھگوان کرشن نے اسکو کہا۔ کہ تو ہیجڑا پن کے خیالات کو چھوڑ کر اُٹھ اور جنگ کر۔ اور تیسرے ادھیائے میں لکھا ہے کہ اپنا کام ضرور کرنا چاہیئے۔ کیونکہ بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے تو انسانی جسم بھی قائم نہیں رہ سکتا۔

۴۔ قرآن شریف میں ایک جگہ تو سورۃ توبہ کے رکوع ۷ میں آتا ہے کہ ہم کو سوائے اسکے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔ کہ جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دیا ہے۔ سورۃ آلِ عمران کے رکوع ۳ میں لکھا ہے کہ وہ مالک جس کو چاہے دے جس سے چاہے لے لے۔ جسکو چاہے عزت دے اور جسکو چاہے ذلت دے۔ سورۃ یونس کے رکوع ۱۵ میں لکھا ہے کہ میرا نفع یا نقصان میرے ہاتھ میں نہیں، میرے مالک کے ہاتھ میں ہے۔ دوسری طرف سورۃ نجم کے رکوع ۳ میں لکھا ہے، کہ انسان کو اپنی کوشش کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ سورۃ نساء کے رکوع ۱۳ میں لکھا ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ گھر میں بیٹھنے والوں کے مقابلہ میں محنت کرنے والوں کو اجرِ عظیم بخشتا ہے۔

۵۔ اسی طرح سے احادیث میں ایک موقعہ پر تو یہ لکھا ہے۔ کہ الیسامت کہو کہ اگر میں یہ کر لیتا تو ایسا ہو جاتا۔ اگر مگر کہنا خیالِ شیطانی ہے۔ اور دوسری جگہ لکھا ہے۔ کہ جو انسان اپنے ہاتھ سے کام نہیں کرتا۔ وہ گویا شیطان کو اپنے پاس بلاتا ہے۔

۶۔ گرنتھ صاحب میں محلہ ۳ وارسری راگ میں لکھا ہے۔ کہ جو قسمت میں لکھا ہوا ہے۔ اس کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔ رام کلی اونکار میں لکھا ہے۔ کہ جو مالک ازلی نے قسمت میں لکھ دیا ہے۔ اسکو کوئی رد نہیں کرسکتا۔ اس کے مقابلہ میں آسا چھنت محلہ ۵ میں لکھا۔ کہ کوشش کرو۔ کوشش سے ہی سب کچھ حاصل ہوسکتا ہے۔

۷۔ ایک طرف کبیر صاحب لکھتے ہیں ؎

کرم کرِیما لکھ رہا اب کچھ لکھا نہ ہوئے
ماسا گھٹے نہ تِل بڑھے جو سر پھوڑے کوئے

دوسری طرف پنج تنتر میں لکھا ملتا ہے۔ کہ اپنی کوشش سے ہی انسان زر و مال حاصل کر سکتا ہے۔ قسمت قسمت کی رٹ ڈرپوک انسان ہی لگاتے ہیں۔

۸- انجیل مقدس کی کتاب متی کے باب ۶ آیت نمبر ۲۵-۲۶-۳۴ میں لکھا ہے کہ میں تم کو کہتا ہوں۔ کہ اپنی زندگی کا کچھ خیال نہ رکھو کہ تم کیا کھاؤ گے کیا پیو گے۔ اور نہ ہی اپنے جسم کا خیال رکھو۔ کہ تم کیا پہنو گے۔ دیکھو ہوا میں اُڑنے والے پرندے نہ کچھ بوتے ہیں، نہ کاٹتے ہیں نہ فصل برداشت کرتے ہیں۔ تاہم تمہارا آسمانی باپ اُنکے لئے کھانا مہیا کرتا ہے۔ اس لئے کل کا خیال مت کرو۔ کیونکہ کل اپنا خیال آپ ہی کریگا۔ دوسری طرف اسی انجیل مقدس کی کتاب امثال کے باب ۱۳ آیت ۴ میں یہ مرقوم ہے کہ کاہل آدمیوں کے دل میں خواہشات ہوتی ہیں لیکن اُنکو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن محنت والوں کی خواہشات پوری کی جاتی ہیں۔ پھر کتاب متی کے باب ۷ آیت ۷-۸ میں لکھا ہے کہ تم مانگو تو تم کو دیا جائیگا۔ ڈھونڈھو تو تم کو مل جائیگا۔ کھٹکھٹاؤ تو دروازہ کھل جائے گا۔ کیونکہ جو کوئی مانگتا ہے وہ پالیتا ہے۔ اور جو کوئی ڈھونڈھتا ہے اسے ملتا ہے۔ اور جو کھٹکھٹاتا ہے اس کے لئے ہی کھول دیا جاتا ہے۔

۹- ایک طرف شیکسپیئر نے لکھا ہے کہ ایک الٰہی قوت ہے۔ جو ہمارے انجام بناتی ہے۔ برخلاف اس کے دوسری طرف ... لکھتا ہے۔ کہ قسمت میں یقین رکھنے سے بڑھ کر کوئی غلامی نہیں۔ امریکن پادری ڈاکٹر ... کہتا ہے کہ بدقسمتی کا لفظ انہی لوگوں کے منہ سے سنا جاتا ہے۔ کہ جو نکمے رہ کر کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انگلستان کا مشہور مضمون نویس جسے ایڈیسن لکھتا ہے۔ کہ بدقسمتی جاہل انسانوں کے حصے میں آتی ہے۔

۱۰- [illegible] نے ایک طرف تو قسمت کے متعلق خیالات ذیل کا اظہار کیا ہے۔

کبھی ہوتا نہیں کوشش سے خلافِ تقدیر
ساری تدبیروں کو کرتی ہے یہ قسمت برباد (انجم)

بگڑی ہوئی قسمت کو بنایا نہیں جاتا
ہاتھوں کی لکیروں کو مٹایا نہیں جاتا! (رحم)

مقدر جب برا ہو کچھ کسی سے ہو نہیں سکتا
مثل سچ ہے کہ "کچھ بھی آدمی سے ہو نہیں سکتا (عشرت)

کچھ بنائے نہیں بنتی جو بگڑتا ہے نصیب
چارہ گر ہو جو مسیحا بھی تو کیا ہوتا ہے! (حفیظ)

کیا فائدہ سر لاکھ زمیں پر رگڑے کوئی!
پیشانی کا لکھا کبھی زائل نہیں ہوتا! (ثاقب)

رزقِ مقسوم ہی ملے گا اسے کوئی دنیا میں دوڑے یا رینگے (اکبر)

نہیں جاتا کسی سے وہ مرض ہے جو نصیبوں کا
نہ قائل ہوں دوا کا میں نہ قائل ہوں طبیبوں کا (ظفر)

نہ مال سے نہ زر سے نہ تدبیر سے چمکے چمکے اگر اقبال تو تقدیر سے چمکے (ظفر)

نہ مٹے گا وہ سمجھ لے اسے پتھر کی لکیر جو لکھا کاتبِ تقدیر نے پیشانی پر (رند)

دخل کب تدبیر کو تقدیر انسانی میں ہے
پیش آتی ہے وہی جو کچھ کہ پیشانی میں ہے (امیر)

جو لکھا تھا مری تقدیر میں رزق اس سے زیادہ
گردش و کوشش و تدبیر سے حاصل نہ ہوا (فصاحت)

اور دوسری طرف تدبیر کے متعلق خیالات ذیل کا اظہار فرمایا ہے

محنت ہی کے پھل ہیں یہاں ہر اک دامن میں محنت ہی کی برکتیں ہیں ہر خرمن میں!

موسیٰ کو ملی نہ قوم کی چوپانی جب تک نہ چرائیں بکریاں مدین میں (حالی)
خدا ملتا نہیں یا وہ بت اپنا ہو نہیں سکتا جو انسان کرنے پہ آئے تو پھر کیا ہو نہیں سکتا
وہ کونسا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

دولت کی جو خواہش ہے تمہیں ہشیار غفلت سے بچو
ہر جاگنے والا پاتا ہے ہر سونے والا کھوتا ہے (رباعی)

کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے
مل نہیں سکتی نکموں کو زمانے میں مراد کامیابی کی جو خواہش ہو تو محنت چاہیئے

او ننگِ اعتبار دعا پر نہ رکھ مدار!
او بے وقوف ہمتِ مردانہ چاہیئے! (حفیظ)

نہ شاخِ گل ہی اونچی ہے نہ دیوارِ چمن بلبل
تری ہمت کی کوتاہی تری ہمت کی پستی ہے (امیر)

پست ہمت روتے رہتے ہیں سدا تقدیر کو صاحبِ ہمت ہمیشہ کرتے ہیں تدبیر کو
قسمت کا گلہ، فلک کا شکوہ کب تک غیبی امداد کی تمنا کب تک
جس ہاتھ سے کر سکتے ہو سب کچھ ضامن اس ہاتھ کو سر پہ رکھکر رونا کب تک

میں کہتا تھا انسان کی اگر تقدیر نہیں تو کچھ بھی نہیں
ہمت بڑھ کے بول اٹھی تدبیر نہیں تو کچھ بھی نہیں (طالب)

پہنچے اس بت تک نہ وہ تک یہ ہے ہمت کا قصور
ورنہ چاہے جو بشر عرش پہ قابو ہو جائے (برق)

اِن متضاد خیالات کو پڑھ کر معمولی انسان کے لئے اپنی زندگی کا پروگرام بنانا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک طرف تو اس کو بتلایا جاتا ہے۔ کہ وہ بے بس ہے۔ اور اسی لئے اپنی تقدیر سے یا مالک کُل کی مرضی سے ایک قدم بھی پرے نہیں

جا سکتا۔ اور دوسری طرف کہا جاتا ہے کہ وہ ہمت و تدبیر سے پہاڑوں کو توڑ سکتا ہے سمندروں کو چیر سکتا ہے جب انسان مشاہدہ کر لیتا ہے تب بھی اس کو متضاد ہی خیالات دنیا میں ملتے ہیں۔ بعض جگہ دیکھتا ہے کہ کئی لوگوں کو گھر بیٹھے بٹھائے لاکھوں روپے ہاتھ لگتے ہیں جس طرف وہ ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ اسی طرف دولت کی دیوی ان کی طرف دوڑی ہوئی آتی ہے۔ باوجود کوئی ذاتی محنت نہ کرنے کے اور نہ کوئی خاص عقل رکھنے کے ان کے وسائل بے اندازہ ہیں۔ بڑی بڑی عقل والے اور بڑے بڑے دل گردہ والے ان کا پانی بھرتے ہیں اور ان کے منہ سے نکلنے والے لفظوں کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ تو ان کو مجبوراً کہنا پڑتا ہے ؎

اگر روزی بدانش بر فزودے　　ز ناداں تنگ تر روزی نبودے

بناداں آنچناں روزی رساند　　کہ دانا اندراں حیراں بماند

ترجمہ:۔ اگر رزق عقل کے مطابق کم و بیش ہوتا۔ تو بیوقوف آدمی سے بڑھ کر کوئی رزق سے تنگ نہ ہوتا۔ لیکن وہ مالکِ کل بے وقوف آدمی کو بھی اس طرح سے رزق پہنچاتا ہے کہ عقلمند انسان اس میں حیران رہ جاتا ہے۔

پھر یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بعض بڑے عقل مند۔ بڑے ہنرور۔ عالم اور بڑی محنت کے خوگر ہوتے ہیں۔ وہ جگہ جگہ اپنی خوشحالی کے لئے سر توڑ کوشش کرتے ہیں علم و عقل بھی خرچ کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود بھی ان کی حالت کولہو کے بیل کی سی ہوتی ہے۔ ساری دوڑ دھوپ کے باوجود پھر کے وہیں رہتے ہیں اور ان کو کہنا پڑتا ہے کہ ؎

پیٹے، چلاتے، کودے، اچھلے، ٹہلے　　پھر پھر کے وہیں رہے جہاں تھے پہلے

ان ہر دو قسم کی مثالوں کو دیکھ کر ان کو ماننا پڑتا ہے۔ کہ قسمت کوئی چیز ہے اور انسان کا یہ کہنا۔ کہ ہمت سے جو چاہے کر سکتا ہے۔ راست نہیں۔ آخر تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کہ ؎

تدبیر سدا راست جو آتی نہیں اکبر انسان کی طاقت کے سوا بھی ہے کوئی چیز

دنیا کے اندر وہ دیکھتے ہیں کہ ایک معمولی پڑھا لکھا انسان ایک تجارتی منڈی میں آتا ہے۔ بات کرنے کا اس کو شعور نہیں۔ اخلاق کے متعلق یہ بھی نہیں جانتا کہ کس پرندے کا نام ہے۔ بات کرتے وقت منہ سے تھوک اور رال ٹپکتی ہے۔ لیکن لوگ سیٹھ جی سیٹھ جی کہتے اسکو تھکتے نہیں۔ اس کے گرد و پیش ہر وقت جمگھٹا لگا رہتا ہے اور جو جو وہ سودا کرتا جاتا ہے۔ صرف زبان ہلاتا ہے۔ ہاتھ پاؤں کو ہرگز حرکت نہیں دیتا۔ چند گھنٹے وہاں ٹھہرتا ہے اور ہزاروں روپے کما کر اگلی تجارتی منڈی کو روانہ ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے ایک بڑا عالم و دانا شخص آتا ہے اس نے تحصیل علم کیلئے اپنی عمر کا کافی حصہ لگایا ہے۔ اخلاق کا پتلا ہے۔ بات کرتا ہے تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ ایک ایک لفظ کے اندر متانت اور حکمت بھری ہوئی ہے وہ اپنے علم کا اپنی محنت سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کو بڑی مشکل سے پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہوتا ہے۔ اور وہ بھی دوسروں کی مرضی کے مطابق۔ چنانچہ ان متضاد خیالات کو دیکھ کر مجبوراً منہ سے نکل جاتا ہے۔ کہ ؎

ہوئے گر صاحب تدبیر و خوش تحریر کیا حاصل
وہ پیش آئیگا پیشانی میں جو لکھا ہوا ہوگا (ظفر)

مایوسی کی حالت میں یہ قسمت کے ہیٹے انسان کہتے ہیں ؎

غافلو کرتے ہو تم فکر کی تدبیر عبث فکر و تقدیر سے ہے چارۂ تدبیر عبث

اور صاحب تقدیر آدمی تگ و دو اور محنت و کاوش میں لگے ہوئے تدبیر

کے قائل لوگوں کو کہتے ہیں ؎

بولے تقدیر کے سایہ میں تدبیر والوں کو — یہ کہتے ہیں کہ چھیڑ دیں ہم اس تدبیر کو رکھ دو

پھر ایسی بھی مثالیں ملتی ہیں کہ وہی انسان جس کے منہ کا لفظ زر و مال کیلئے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ جو کہ جہاں بھی ہاتھ ڈالتا تھا۔ سوائے سیم و زر کے کسی اور چیز پر پڑتا ہی نہیں تھا۔ دولت اس کی آنکھ کے اشاروں پر ناچتی تھی۔ ایک دن آتا ہے کہ وہی شخص ہوتا ہے۔ وہی اس کا لفظ ہوتا ہے لیکن جہاں ہاتھ ڈالتا ہے مٹی پر پڑتا ہے۔ نہ صرف اپنی بلکہ باپ دادا کی کمائی بھی کھو بیٹھتا ہے۔ اور دانے دانے کو ترسنے لگ جاتا ہے۔ اس کو دیکھ کر بے اختیار منہ سے نکلتا ہے ؎

کچھ بنا نہیں پڑا اپنے نصیبے بگڑ گئے — وہ بجلیاں گریں کہ بھرے گھر اجڑ گئے

ایسی صورت میں ان بچاروں کا پھر کیا حال ہو جاتا ہے ؎

یوں نہ انسان کوئی برگشتہ مقدر ہو جائے

میں اگر پھول اٹھاؤں تو وہ پتھر ہو جائے!

پھر ایسے شخص بچارے وہی پرانی تدبیریں عمل میں لاتے ہیں۔ انہی منڈیوں میں جاتے ہیں۔ وہی سودے کرتے ہیں۔ انہی لوگوں کے ساتھ بیوپار کرتے ہیں۔ لیکن کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ آخر کہتے ہیں ؎

تدبیر سے قسمت کی برائی نہیں جاتی — بگڑی ہوئی تقدیر بنائی نہیں جاتی

ان کی حالت اور بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ جن اشیا کا سودا ان کے وارے نیارے کرتا تھا۔ جو ان کے سودے مٹی کو بھی سونا بنا دیتے تھے۔ اب کچھ کارگر نہیں ہوتے جو داؤ الٹے ہیں تین کانے ہوتے ہیں ؎

بیمار کی قضا ہو تو اکسیر کیا کرے — تقدیر جب بری ہو تو تدبیر کیا کرے

پھر وہ گڑگڑاتے ہیں روتے ہیں۔ آہ و پکار کرتے ہیں کہ شاید اس طریق سے ہی

کچھ حالات سدھر جائیں۔ ان کا رونا دھونا شاید سنبھلنے کا باعث بن جائے۔ اُن کی چیخ و پکار سے متاثر ہو کر شاید زمانہ ان کی امداد کے لئے پھر طیار ہو جائے لیکن ؎

رونے سے بھی مٹا نہ لکھا سرنوشت کا　　ہم اشک سے بھی اپنے نوشتے کو دھو چکے

بعض دفعہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حالات میں کچھ بہتری آ رہی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو چارہ اس وقت کیا گیا ہے۔ وہ کاری ثابت ہوا ہے۔ وہ اپنی تدبیر کو اسی پیمانہ سے اسی طریقے سے اُسی احتیاط سے اسی انداز سے جاری رکھتے ہیں لیکن پانسہ پھر اُلٹ جاتا ہے۔ اور تین کانے پڑتے ہیں اور وہ بچارے یہ کہتے ہوئے سُنے جاتے ہیں کہ ؎

کام بن بن کے بگڑ جاتا ہے اکثر اے تاج
کون کم بخت ہے جو قائل تقدیر نہیں　　(تاج)

اپنی تمام کوششوں کی ناکامی کو دیکھ دیکھ کر وہ لوں اُٹھتے ہیں ؎

گردش جو ہو تقدیر میں کچھ سعی کام آتی نہیں!
منزل کچھ آگے بڑھ گئی پہنچا جہیں منزل کے پاس

یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ بعض کام بڑے غور و خوض اور سوچ بچار کے بعد بہت آدمیوں کا مشورہ لے کر سابقہ تجربوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حالات حاضرہ کا لحاظ کرتے ہوئے بڑی چھان بین اور تجسس کے بعد شروع کئے جاتے ہیں۔ اور کامیابی کے لئے سو فیصدی امید کی جاتی ہے۔ ایک فیصدی بھی شک نہیں ہوتا۔ لیکن باوجود ان ساری باتوں کے چاروں شانے چت گرنا پڑتا ہے۔ اور کامیابی کی ایک منزل بھی طے نہیں ہوتی۔ تو کہنا پڑتا ہے ؎

ناداں نہ ہو خرد پہ جو ہونا ہے ہو گا وہی　　دانش تری نہ کچھ مری دانشوری چلے

ان سب حالات کو دیکھ کر انسان کو اس کے سوائے اور کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ تقدیر کا قائل ہو۔ اس کو اس مسئلہ کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اور قسمت کے اصول کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے۔ اُسے ماننا پڑتا ہے۔ کہ انسان از خود اپنے لئے موافق و نا موافق حالات پیدا نہیں کر سکتا۔ بلکہ کوئی اور چیز ہے۔ جو اس کے لئے اچھا اور بُرا وقت لاتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو مجبور اور بے بس محسوس کرتا ہے۔ اور کہتا ہے ؎

نیک و بد زمانہ نہیں اختیار میں ہوتا وہی ضرور ہے جو سرنوشت ہو

اگر یہی حالات ہر جگہ مشاہدہ و تجربہ میں آئیں۔ تو انسان قسمت کا شاکر ہو کر بیٹھ جائے۔ صبر و قناعت کو اختیار کرے۔ مفت کی دوڑ دھوپ میں لگ کر اپنی جان نہ کھپائے۔ رنج و دکھ سہہ کر ناکامی کا منہ دیکھ کر مایوس نہ ہو۔ آس کو بڑھا کر بے آس نہ ہو۔ اور یہ کہہ کر بیٹھ رہے کہ ؎

ہے جو قسمت میں وہی ہوگا نہ کچھ کم نہ سوا
آرزو کہتے ہیں کس چیز کو حسرت کیسی؟

لیکن اس دنیا میں برخلاف اس کے ایسے واقعات بھی انسان کو اپنی زندگی میں پیش آتے ہیں۔ اور وہ اپنے مشاہدہ سے بھی دیکھتا ہے کہ کاہل لوگ مصیبتوں کا شکار بنتے ہیں سُست اور بیکار قومیں پاؤں کے نیچے روندی جا رہی ہیں۔ تساہل نے ان کو غارت کر دیا ہے۔ نکماپن نے ان کو نامرد بنا دیا ہے۔ وہ ہر بات میں دوسروں کے دستِ نگر ہیں۔ پیٹ بھر کر کھانا بھی نہیں ملتا۔ دوسری طرف جو انسان یا جو قومیں محنت کی خوگر ہیں۔ دست و بازو سے کام لیتی ہیں۔ ہمت و تدبیر کو عمل میں لاتی ہیں۔ جرأت اور حوصلہ سے بہرہ ور ہیں۔ وہ حکمران ہیں۔ عیش اڑاتی ہیں۔ قدرت کی طاقتیں بھی ان کی خدمت میں دست بستہ حاضر ہیں۔ جو انسان یا قومیں

اپنے قوتِ بازو پر بھروسہ رکھتی ہیں۔ اور محنت کے میدان میں عمل کی خوگر ہوتی ہیں وہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتی ہیں۔ اپنے ملک کو خوشحال کرتی ہیں۔ دوسری کاہل قوموں کو زیر کرتی ہیں۔ ان کی شہرت کا دنیا کے اندر ڈنکا بجتا ہے ؎

بجز سختی اُٹھائے نام ممکن ہے کہیں نکلے
تراشا جائے جب سو بار تب پتھر نگیں نکلے

ناموری اور شہرت انہی کے حصہ میں آتی ہے۔ جو کچھ کر کے دکھاتے ہیں ؎

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا
سو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہوا

بغیر محنت کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ سمندر کے اندر بے اندازہ موتی اور گوہر موجود ہیں۔ لیکن کیا گھر بیٹھے ہی کبھی سمندر نے موتی پارسل کرا کے بھیجے ہیں ؎

بے مشقت نہیں ہوتی کوئی راحت حاصل
غرقِ دریا ہوا غوّاص تو گوہر پایا

جن قوموں نے محنت کے میدان میں قدم مارا۔ جن لوگوں نے اپنے آرام کو چھوڑا اور محنت اٹھائی راتوں کو جاگ کر اپنے پر کھانا پینا حرام کر دیا۔ انہوں نے دنیا کے اندر نئی نئی ایجادیں کیں جس سے نام پایا۔ دولت پائی اور ملک کی مخلوق کیلئے مفید ثابت ہوئے۔ جنہوں نے محنت کی۔ انہوں نے انجام کار آرام پایا۔ سکھ ایسے ہی لوگوں کو ملا ؎

محنت پہ ہی موقوف ہے آسائشِ گیتی
کھو دی مری راحت راحت طلبی نے

یہ دنیا ایک میدانِ کارزار ہے۔ اس میں ہر ایک فرد بشر برسرِ پیکار رہتا ہے۔ جو لوگ مستقل مزاج اور ثابت قدم رہ کر میدانِ عمل میں پیش پیش رہتے ہیں۔ بلا شبہ وہی کامیابی کی دیوی کے درشن کرتے ہیں۔ وہ بڑی بڑی مہمیں سر کرتے ہیں۔ کیا اس شخص سے فتح کی امید کی جا سکتی ہے کہ جو حیدروار گھر کی چار دیواری میں دبک کر بیٹھ رہنا چاہتا ہے ہرگز نہیں ؎

قدم رہتا ہے ثابت جن کا اس سختی دوراں میں
بہادر ہی وہی سر قلعۂ فولاد کرتے ہیں!

جن لوگوں کے پیش نظر اپنی منزلِ مقصود ہوتی ہے۔ کیا وہ بیٹھے بیٹھے اس منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔ حاشا و کلا۔ انہیں چلنا ہوگا۔ اگر پاؤں بھی تھک جائیں تو بھی چلنا ہوگا۔ منزلِ مقصود[1] تو فاصلہ طے کرکے ہی آئے گی۔ بلاشبہ رستے میں کئی آفتیں، صعوبتیں، زحمتیں اور مصیبتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ لیکن ذی ہمت انسان اپنا لکشؔ اور اپنا مقصد سامنے رکھتے ہوئے ان سے گھبراتے نہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ گوہر جس کی وہ تلاش میں ہیں چوٹی پہ پہنچ کر ملیگا۔ اور اس کے ملتے ہی سب تکان اور سب تکلیف بھول جائیگی۔ اپنی دلی مراد حاصل کرنے والے انسان محنت اور کوشش کی تکلیف سے کبھی نہیں گھبراتے۔ پاؤں تھک جائیں تو کیا کرتے ہیں ؎

تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتش گُلِ مراد ہے منزل میں خار راہ میں ہے

ایسے راسخ العزم انسانوں کو ناکامیابی بھی پسپا نہیں کرسکتی۔ ناکامیابی کو وہ کامیابی کا پہلا زینہ جانتے ہیں۔ ناکامیابی جن خامیوں کی وجہ سے ہوئی انکو پورا کرتے ہیں۔ اور پھر تازہ دم ہوکر کوشاں ہوتے ہیں۔ ناکامیابی نہ صرف انکو ان کے ارادے سے باز نہیں رکھتی۔ بلکہ وہ ان کو اور بھی مستعد بناتی ہے ؎

گرے سو بار بھی بجلی اگر کشتِ تمنا پر جو ہمت وار ہیں تا لیوں کے بوٹے ہیں حاصل سے

اگر کسی صورت میں جب ناکامیابی ہوتی ہے تو وہ لوگ کیا کہتے ہیں ؎

گھبرا و نہ سعی سے لے دل کا امتحان ہے ناکامیاب ہوگا تو تو کامیاب ہوگا!

ناکامی سے ان کے حوصلے پست نہیں ہوتے۔ ان کی ہمت کی کمر نہیں ٹوٹتی کیونکہ وہ جانتے ہیں ؎

صاحب ہمت نہیں ڈرتا مصیبت سے کبھی زورِ آندھی سے آتش کی بھڑک جاتی نہیں

ناکامیابی ہوئی کس کو ہے؟ کیا اسکو جو چوڑیاں پہن کر یا گھونگھٹ نکالکر گھر میں بیٹھا رہتا ہے؟ یا اسکو کہ جسے میدانِ عمل میں اُترنے کا کبھی حوصلہ ہی نہیں ہوتا؟ اور جس کا

[1] منزلِ مقصود

دل ہمیشہ خوف وہراس سے دبا رہتا ہے ؛ نہیں بالکل نہیں ؎

گرتے وہی ہیں جو کہ ہوں میداں میں شہسوار　　وہ طفل کیا گریگا جو گھٹنوں کے بل چلے

پروردگارِ دو عالم بھی انہی لوگوں کا ممد ہوتا ہے۔ انہی لوگوں کی دستگیری کرتا ہے کہ جو خود ہمت سے کام لیتے ہیں ؎

احباب سے میری التجا ہے　　اصحاب سے عرض مدعا ہے
کچھ کر لو کہ عمر بے وفا ہے　　ہمت کا حمایتی خدا ہے

کامیابی حاصل کرنے کے لئے نام پیدا کرنے کے لئے سامانِ راحت مہیا کرنے کیلئے تکلیف ضرور پیش آتی ہے لیکن کیا کوئی ایسا پھول ہے جس کے نزدیک کوئی خار نہیں۔ انگریزی میں مثل ہے NO PAINS NO GAINS[1] محنت تو کرنی ہی پڑتی ہے

شہد کیواسطے زنبور نے کاٹا تو یہ راز کھلا　　نوش چاہے جو زبانیں تو بے نیش نہیں

مثل مشہور ہے کہ خدا انہی لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اپنی آپ مدد کرتے ہیں۔ وہ مالک کل بھی ہمت والوں کا ساتھ دیتا ہے۔ کاہلوں اور ناکاروں کو دیکھکر وہ خوش نہیں ہوتا۔ جو حوصلہ کرتے ہیں۔ ان کے ارادوں میں پروردگار قوت دیتا ہے ؎

جو بڑھیگا حوصلہ اسکا بڑھایا جائیگا　　جو گریگا اس کو ہتی سے گرایا جائیگا

صاحب ہمت لوگ جیسا اولوالعزمی سے مستقل مزاجی سے کسی کام کو شروع کرتے ہیں۔ تو وہ پہلے سے ہی کامیابی کا یقین رکھکر قدم اٹھاتے ہیں۔ بزدلوں اور نکموں کی طرح وہ گنتی میں نہیں پڑتے۔ ان کے سامنے اگر مگر اور شرط وجزا کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ ان کو خود اعتمادی ہوتی ہے۔ اپنے زور بازو پر اپنے استقلال پر پورا پورا بھروسہ ہوتا ہے کام کو شروع کرنے کے وقت وہ یوں نعرہ زن ہوتے ہیں ؎

ثابت قدم ہوں مجھکو قسم ربِّ پاک کی　　چیروں گا کوہ و دشت بیاباں بلاؤنگا

ان کے یہ مصمم ارادے بیا وجہ نہیں ہوتے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ محنت اور

[1] رنج اور تکلیف کے بغیر کوئی آرام نہیں ملتا۔

شہرت، مشقت اور دولت مترادف الفاظ ہیں کسی نے کیا اچھا کہا ہے ؎

منحصر قوتِ بازو پہ ہے دولت مندی — دیکھ لو زر ہیں موجود ہے زر لے صاحب

کوئی مثال دکھاؤ۔ کہ عمر کا ایک حصہ پڑھائی میں خرچ کئے بغیر کوئی عالم ہو گیا ہو۔ یا بغیر محنت کئے کسی نے امتحان پاس کیا ہو۔ بغیر ہاتھ منہ ہلائے کسی نے کھانا کھایا ہو۔ بغیر دماغ لڑائے اور قلم چلائے کسی نے کتاب لکھی ہو۔ ایسا ہو نہیں سکتا۔ یہ باتیں قانونِ قدرت کے خلاف ہیں۔ کوئی شخص بغیر ہل چلائے۔ بغیر بیج بوئے پیداوار برداشت نہیں کر سکتا۔ پھر ہمت اور تدبیر کے فلسفہ سے کس طرح کوئی منکر ہو سکتا ہے ؎

اگر ہو سکتا عالم بے حصولِ علم بے محنت — تو بس ساری کتابیں ایک جاہل دیکھ پی جاتا

نپولین بونا پارٹ جو ہمت اور حوصلہ کا پُتلا تھا۔ کہا کرتا تھا۔ کہ لفظ ناممکن بیوقوفوں کی لغات میں پایا جاتا ہے۔ ہمت والے کے سامنے کوئی چیز ناممکن نہیں مشکل یا ناممکن وہی چیزیں ہیں کہ جن کیلئے انسان خود اپنا حوصلہ پست کر بیٹھتا ہے ورنہ ؎

وہ کونسا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا — ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

رانا پرتاب کو جس وقت ہر طرف سے مصیبت نے آگھیرا اور وہ بہت گھبراہٹ کی حالت میں تھا۔ تو اس نے سامنے دیوار پر دیکھا۔ کہ ایک چیونٹی اپنے ننھے سے منہ میں ایک دانہ لیکر دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرتی ہے۔ تھوڑی دور جاتی ہے تو پھر گر جاتی ہے۔ اس نے کئی بار کوشش کی لیکن ہر بار زمین پر آگری تاہم اس نے اپنے ارادے کو پست نہ کیا۔ اور بار بار دانہ منہ میں اٹھا کر اپنی منزل مقصود پر چلتی رہی۔ آخرکار وہ کامیاب ہو گئی۔ اور دانہ لیکر دیوار کے سرے پر جا پہنچی۔ اس چیونٹی کی ہمت کو دیکھ کر رانا پرتاب اچھل پڑا۔ اور کہنے لگا کہ جب ایک چیونٹی اپنے ارادے میں کوشش اور ہمت کرنے سے کامیاب ہو سکتی ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں۔ کہ میں انسان ہو کر ناکامی سے گھبرا جاؤں۔ مایوس ہو جاؤں۔ چنانچہ اس نے بکھری پڑی رہتا سہی فوج کو اکٹھا کیا اور بڑے شد و مد سے

حملہ کرنے کی طیاری کی ۔ اور کچھ حد تک کامیابی بھی حاصل کی ۔ ارجن جب جنگ مہابھارت میں دل توڑ بیٹھا ۔ اور کہنے لگا کہ بہتر ہوگا کہ میرے مخالف مجھ کو تلوار کے گھاٹ اتار دیں لیکن میں کسی پر ہاتھ نہیں چلاؤنگا ۔ جب وہ ہمت اور حوصلہ بالکل ہار بیٹھا تھا تب شری کرشن بھگوان نے گیتا کی روح افزا تعلیم سے اس کے حوصلہ کو تازہ کیا ۔ اس کی ہمت بندھائی ۔ اور اس کو مستعد کرکے میدان کارزار میں بھیجا ۔ آخر فتح ارجن کی جانب کو ہوئی ۔ اسکی ہمت اور حوصلے نے فریق مخالف کو پسپا کیا اور زک دی ۔

یہ دو نو پہلو تصویر کے آپ کے سامنے رکھے گئے ہیں یعنی ایک طرف تو کہا جاتا ہے کہ انسان کے ہاتھ میں کچھ نہیں ۔ وہ اپنی مرضی سے نہ ایک قدم چل سکتا ہے نہ کوئی کام کرسکتا ہے ۔ اس لئے اس کی تگ و دو لاحاصل ہے اور قناعت و صبر و شکر سے کام لینا چاہیئے ۔ دوسری طرف بتایا جاتا ہے کہ انسان جو چاہے کرسکتا ہے ۔ اس کو بڑی قدرت حاصل ہے اس لئے اسے ہر وقت بے صبری اور بے چینی سے میدان عمل میں دوڑ لگانی چاہیئے ۔

ایک طرف تو ایسی نصیحت ملتی ہے ؎

کل سحر اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے   خوب ملک روم ہے اور سرزمین روس ہے
اتنے میں عبرت پکاری اک تماشا میں تجھے   چل دکھاؤں تو کہ جو صید آز کا محبوس ہے
لے گئی اک بار گی گور غریباں کی طرف   جس جگہ جان تمنا ہر طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے   یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے

پوچھ تو ان سے کہ مال و ملک و دنیا سے آج
کچھ بھی ان کے پاس غیر از حسرت و افسوس ہے

دوسری طرف مشورہ ملتا ہے ؎

صبر و قناعت رنگ نحوست   صبر و قناعت زنگ سعادت

صبر و قناعت مخزنِ آفت — صبر و قناعت گنجِ عقوبت
صبر و قناعت خصمِ ترقی! — صبر و قناعت باعثِ ذلت
بے صبری ہے مایۂ شادی — صبر و قناعت مایۂ کلفت
بے صبری کا نام ترقی! — نامِ قناعت ذلت و آفت
صبر و قناعت محکومی ہے — بے صبری شاہی و ریاست
صبر و قناعت طوقِ غلامی — بے صبری ہے تاجِ سیاست
مشرق میں افلاس و مصیبت — مغرب میں ہے دولت و راحت
وہ انعام بے صبری ہے — یہ ثمرات صبر و قناعت

بے صبری کی دیوی آؤ!
بھاگو بھاگو صبر و قناعت

ان متضاد خیالات اور ہدایات و نصائح کو پڑھ کر انسان کے لئے اپنا لائحہ عمل بنانا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک وقت جب وہ ایک طرف کے خیالات پڑھتا ہے۔ تو اس طرف کا جھکاؤ ہو جاتا ہے۔ اور صرف نام کے جپنے اور ذکر الٰہی میں مشغول ہونے کے لئے تیاری کرتا ہے۔ پھر کسی اور جگہ دوسری طرف کے خیالات پڑھتا ہے تو کمر ہمت باندھ کر دنیا کے میدانِ کارزار میں آگے بڑھنے کا پروگرام بناتا ہے۔

اب ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ حقیقت کیا ہے۔ جو کچھ میں سمجھتا ہوں وہ ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔ اس کے بعد ناظرین خود ہر پہلو کو سوچ کر اپنے لئے فیصلہ کر سکتے ہیں۔ سنیئے:-

تقدیر بھی ایک اہم چیز ہے اور تدبیر بھی ضروری شے ہے یہ دونوں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ جو لوگ ایک کو جھٹلاتے اور دوسری کو ہی سب کچھ کہتے ہیں وہ یا تو اصلیت کو ٹھیک طور پر نہیں سمجھتے یا مبالغہ سے کام لیتے ہیں بلکہ میں تو کہتا

ہوں۔ کہ تقدیر اور تدبیر دونوں ہی ایک چیز۔ یہ ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ ہیں۔ ان کو جدا جدا کرنا ناممکن ہے۔ ان دونوں کی موجودگی کا انحصار ایک دوسری پر ہے۔ ایک کے رہنے سے ہی دوسری کا وجود قائم رہ سکتا ہے ایک اگر جسم ہے تو دوسری جان۔ ایک اگر صفت ہے۔ تو دوسری موصوف۔ جیسے صفت اور موصوف ایک دوسرے سے جدا نہیں کئے جا سکتے۔ ایسے ہی تقدیر اور تدبیر بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں کئے جا سکتے۔ غلطی اور تکلیف اسی موقعہ پر ہوتی ہے۔ کہ جہاں ایک سے بالکل انکار کیا جاتا ہے اور دوسری کو ہی سب کچھ کہا جاتا ہے۔ نری تقدیر پر ہی بھروسہ رکھنے والے بھی آرام نہیں پا سکتے اور محض تدبیر کے موید بھی سچی راحت سے محروم رہتے ہیں۔ جو لوگ انسان کو بالکل بے بس اور بے کس کہتے ہیں۔ وہ اُس قدرت کو پس پشت ڈالتے ہیں۔ جو اس کو اس دنیا کے میدان جنگ میں اپنے جوہر دکھانے کے لئے ملی ہوئی ہے۔ اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان فعل مختار ہے۔ اور جو چاہے کر سکتا ہے وہ بھی اس کی طاقت کا اندازہ مبالغہ سے لگاتے ہیں۔ جو محض صبر و قناعت کی تلقین کر کے انسان کو ایک عضو معطّل بنانا چاہتے ہیں وہ بھی درست رہبری نہیں کرتے۔ اور جو ہر وقت بے صبری سے دوڑ دھوپ میں لگے رہنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ وہ بھی درست رہنمائی نہیں کرتے۔ انسان مجبور بھی ہے اور مختار بھی۔ لیکن دونوں کا اندازہ اور دونوں کی حد ہے۔ پھر غلطی کہاں پڑتی ہے غلطی اس کے حد باندھنے میں ہوتی ہے کہ وہ حد کس موقعہ پر ہے۔ بعض لوگ اس حد کو بڑھاتے بڑھاتے یہ کہنے لگ جاتے ہیں۔ کہ کوئی چیز انسان کے لئے ناممکن نہیں۔ اور بعض اس حد کو گھٹاتے گھٹاتے اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ کہ انسان کے ہاتھ میں ہی کچھ نہیں۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اگر حد کا درست اندازہ سمجھ میں آ جائے تو یہ مسئلہ بخوبی حل ہو سکتا ہے۔

اس مسئلہ پر دو نقطہ ہائے نگاہ سے عرض کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ایک تو ان لوگوں کے خیال سے جو مسئلہ تناسخ کے قائل ہیں اور دوسرے ان لوگوں کے خیال سے جو اس مسئلہ کے قائل نہیں۔ اوّل اُن لوگوں کے خیال سے کی جاتی ہے جو مسئلہ تناسخ کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی خدمت میں ایک مثال عرض کی جاتی ہے۔ ایک پھلدار پودا ہے اس کا بیج ایک وقت بویا گیا تھا۔ پھر اس کے بعد پانی دیکر اسکی گوڈی کرکے اس کی حفاظت کرکے اس میں کھاد ڈالکر اُسکو بڑا کیا گیا۔ اور آخر اس میں میٹھے اور رسدار پھل آئے اب سوچنا یہ ہے کہ آیا ان پھلوں کے حاصل ہونے میں بیج کی زیادہ اہمیت ہے یا اسکے بعد اس کوشش کی جو پانی وغیرہ دینے کی شکل میں کی گئی۔ ان میں کون بڑا ہے اگر بیج نہ بویا جاتا۔ تو کیا محض کوشش کچھ کام کر سکتی تھی۔ اور اگر صرف بیج بو دیا جاتا لیکن پانی وغیرہ کچھ نہ دیا جاتا۔ اگر کھاد وغیرہ نہ ڈالی جاتی اور کوئی محنت نہ کی جاتی تو کیا پھر پھل حاصل ہو سکتے تھے۔ جیسے یہ دونوں باتیں لازمی ہیں ایسے ہی تقدیر اور تدبیر دونو لازمی ہیں تقدیر بیج ہے۔ تدبیر کوشش ہے۔ دونو مل کر ہی میٹھے پھل دے سکتے ہیں۔

ایک اور مثال عرض کی جاتی ہے۔ ایک شخص دھتورے کے بیج بوتا ہے کوشش بھی کرتا ہے خوب پانی دیتا ہے۔ دن رات اس پودے کو بڑھانے اور اسکی حفاظت کے سامان مہیا کرتا ہے اور اپنی اس سر توڑ محنت اور از حد کوشش کے بڑے اعلےٰ ثمرات ملنے کی توقع کرتا ہے۔ اور اُسے خیال ہے کہ نہایت میٹھے میٹھے آم لگینگے کیا یہ ممکن ہے؟ ویسے ہی بغیر اچھی تقدیر کے نری کوشش اور بے صبریاں کچھ نہیں کر سکتیں۔

ایک اور بھی مثال سنئیے۔ ایک شخص نہایت اعلیٰ قسم کے آموں کے پودے سہارنپور سے لاکر لگاتا ہے لیکن لوگ اسے ڈراتے ہیں کہ اس پودے میں زہریلے پھل لگیں گے تو کیا یہ ممکن ہوسکتا ہے؟ ایسے ہی نیک اعمال کا پھل بُرا نہیں ہوسکتا۔

جیسے اوپر عرض کیا گیا ہے۔ یہ بحث ان لوگوں کے غور کیلئے عرض کی جا رہی ہے

کرجو مسئلہ تناسخ کو ماننے والے ہیں۔ تقدیر چیز کیا ہے۔ تقدیر ہے سابقہ اعمال کا پھل اچھے یا بُرے جو بھی اعمال کئے جائیں۔ ان کے مطابق تقدیر بنتی ہے۔ یعنی وہ بیج ہوتا ہے۔ اس کو پھل دار کرنے کے لئے کوشش اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک اور مثال سے اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایک باغیچہ میں اچھے اچھے پھل لگے ہوئے تھے اور وہاں ایک اندھا اور ایک لنگڑا آدمی بیٹھے تھے۔ وہ دونوں ہی پھل لینے سے قاصر تھے کیونکہ ایک پھلوں کو دیکھتا تھا لیکن ان کی طرف اُٹھ کر نہیں جا سکتا۔ دوسرا جا سکتا تھا لیکن ان کو دیکھ نہ سکتا تھا۔ ہر دو نے باہم مشاورت کی۔ اندھے نے لنگڑے کو اپنے کندھوں پر بٹھا لیا۔ اب لنگڑے نے اپنی آنکھوں سے اور اندھے کی ٹانگوں سے کام لیکر پھل توڑ لیے اور دونوں نے کھا لئے۔ ایسے ہی تقدیر اندھی ہے اور تدبیر لولی۔ یہ دونوں مل کر ہی انسان کے لئے خوشی اور راحت کا باعث بن سکتی ہیں۔

تقدیر کو ایک ذخیرہ سے بھی تشبیہہ دی جا سکتی ہے کہ جو ایک شخص نے اکٹھا کیا ہو۔ اچھا ہو یا بُرا۔ وہ ذخیرہ موجود رہیگا۔ اس میں سے خرچ کرنا انسان کی کوشش اور سعی کے ماتحت ہے۔ فرض کیجیئے۔ کہ ایک شخص محنت اٹھا کر اس ذخیرہ تک نہیں جاتا۔ تو اسکا ذخیرہ ویسے کا ویسا موجود رہیگا۔ یعنی تقدیر بنی رہیگی لیکن وہ اس کا فائدہ اپنی جہالت سے نہیں اٹھا سکیگا۔ یہاں پر سوال ہو سکتا ہے۔ کہ کیا بُرے اعمال کے ذخیرہ کا ثمر اٹھانے کیلئے بھی سعی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسکا جواب ہے۔ کہ ہاں ہوتی ہے۔ تو پھر سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیوں؟ کیا کوئی شخص بُرے ثمر کو حاصل کرنے کیلئے خود کوشش کریگا۔ یہ بات کچھ تشریح طلب ہے۔ سعی یا کوشش صرف ہاتھ سے ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ کلام اور خیال سے بھی ہوتی ہے۔ جو رِشی اور مُنی لوگ اپنے لیکچروں اور وعظوں اور اُپدیشوں کے ذریعہ خلقتِ خدا کو بد اعمال سے باز رہنے اور نیک اعمال میں لگنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کی سعی کوئی کم نہیں۔ یا جو سائنسدان یا فلاسفر اپنی عقل کو لڑا کر نئے نئے مسئلے دریافت کرتے ہیں انکی محنت

بھی کچھ کم درجہ کی نہیں ہوتی۔ اس لئے سعی کلام اور خیال سے جو ہو سکتی ہے۔ دل کا خاصہ ہے کہ وہ خالی نہیں رہ سکتا۔ اگر اس کو کوئی نیک شغل نہ دیں۔ تو دل ضرور بد خیالی کی طرف دوڑے گا۔ اور بد خیالی کی بد مستی ہو جائے گی۔ اس بد مستی کا نتیجہ اعمال بد کے ذخیرہ میں سے آ پہنچے گا۔ اس طرح سے بد اعمال کا برا پھل پانے کے لئے مستی ہوتی ہے۔

تقدیر ان اعمال و خیالات کی نتیجہ ہے جو دوسروں کے متعلق کئے جاتے ہیں۔ اگر وہ بھلے ہیں تو تقدیر بھی نیک بنے گی۔ اگر وہ برے ہیں تو تقدیر بھی بری بنے گی جن کا کسی دوسروں سے تعلق نہیں ہوتا۔ اس کا تقدیر سے کچھ واسطہ نہیں۔ مثلاً کھانا حاصل کرنا ہے۔ اگر کسی کا حق چھینا گیا ہے یا کسی سے دھوکہ سے حاصل کیا ہے۔ تو اس سے تقدیر بنے گی۔ لیکن جب کھانا کھانے کے لئے ہاتھ منہ ہلایا جائے گا۔ تو اس سے تقدیر کا واسطہ نہیں ہوگا۔ اس لئے جو اعمال یا خیالات انسان کے ہوں۔ وہ ہمیشہ نیکی پر مبنی ہونے چاہئیں۔ تاکہ تقدیر نیک بنے۔ جس قدر نیکی سے کوئی انسان دوسروں سے برتاؤ کرے گا۔ اسی قدر اس کی تقدیر بھی اچھی بنے گی۔

سوال ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کو بلا سعی کے ہی دولت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہوتی ہے۔ اس کی وجہ وہی خیالات کی سعی ہے۔ تقدیر تو ان لوگوں کی پہلے ہی بنی ہوتی ہے۔ نیک خیالات کی لہریں جس وقت چل پڑیں۔ اسی وقت وہ تقدیر شگفتہ ہو جاتی ہے۔

موجودہ وقت میں جو تدابیر عمل میں لائی جاتی ہیں۔ ان کا جہاں تک دنیا کے دوسرے انسانوں سے تعلق ہے وہ پچھلی تقدیر کو حاصل کراتی ہیں۔ اور آئندہ کے لئے تقدیر کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ اس لئے چاہئے ؛ ہر تدبیر ہو۔ اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہئے کہ جملہ تدابیر نیک خیالی پر مبنی ہوں۔

ایک اور بات بھی سمجھ لینے کے قابل ہے کہ تقدیر کس چیز کا ذخیرہ ہے کیا وہ

دولت اولاد اور دیگر قیود ضیافت کے ذخیرہ کا نام ہے یا نہیں۔ اچھی یا بُری تقدیر نام ہے دُکھ اور سُکھ کے ذخیرہ کا۔ کیونکہ ہمیشہ یہ دیکھی بات ہے کہ بعض آدمیوں کو دولت اور اولاد دُکھ دیتے ہیں اور بعض کو سکھ۔ بعض لوگ پاس کچھ نہ ہونے کے باوجود بھی سکھی رہتے ہیں۔ بعض اس بات میں راحت مانتے ہیں کہ جو کچھ پاس ہو اُسے ہی دے ڈالیں خود خالی ہو جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں

دولت دنیا سے آتش بجھے تب پھیر لی نگاہ!
جس طرح نکلی آگ ہی تو سے تنگ تنگ کے اکسیر کے!

اس لئے ایک آدمی کو صاحب زر دیکھ کر ہی یہ نہ سمجھ لینا چاہئیے کہ وہ خوش قسمت ہے ہاں اگر وہ ساتھ ہی ساتھ اپنی نیک خیالی سے اس زر کا نیک فائدہ اٹھا رہا ہے یعنی اپنے لئے جائز طور پر خرچ کرتا ہے۔ اور دوسروں کی بھلائی کے لئے خرچ کرتا ہے تو وہ ضرور خوش قسمت ہے۔ کیونکہ یہی خوش قسمتی کی علامت ہے۔

نیک خیالی اور نیک نیتی کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ وہ بُری تقدیر کو جلدی گھٹا سکتی ٹال سکتی ہے۔ کیونکہ یہ تو مسلّم امر ہے کہ تقدیر کا اصول تاثیر سے ہی ملتا ہے اچھا یا بُرا۔ اگر بدخیالی اور بد اعمالی کی شکل میں تاثیر کی جاتی ہے تو قسمت بھی بدتر ہوگی۔

سوال ہو سکتا ہے کہ بعض نیک انسانوں کو بھی دُکھ اور تکلیف ہوتی ہے۔ یہ درست ہے لیکن اس میں دو باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔ اول تو یہ کہ جس حالت کو ظاہری نگاہ کا انسان دُکھ کہتا ہے اسکو خدا دوست اور پرہیزگار انسان دُکھ مانتا ہی نہیں۔ دوسرے سختی سے کندن بننے کے اندر تپاکر ہی لیا جاتا ہے۔ اس تکلیف سے حکیم مطلق کو اپنے بندوں کی بہتری مقصود ہوتی ہے۔ اور وہ پیغمبر کے بیانات سے سمجھتے بھی ایسا ہی ہیں بلکہ اس حالت میں خوش ہوتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس سے ایک تو گناہ کا ذخیرہ تقدیر جلدی ختم ہو جائیگا۔ دوسرے اس سے راضی برضا رہنے کی پختگی اور استقلال اور بھی زیادہ مستحکم ہونگے

زمین کا سینہ چیرنے سے ہی کھیتی پیدا ہوتی ہے۔

پس جو اوپر عرض ہوا ہے۔ اس کا خلاصہ یہی ہے کہ تقدیر ضرور ہوتی ہے لیکن وہ حاصل ہوتی ہے تدبیر سے اور وہ تدبیر نیک خیال پر مبنی ہونی چاہیئے۔ اب اس باریک مسئلہ پر اُن لوگوں کے نکتہ نگاہ سے عرض کیا جاتا ہے کہ جو تناسخ کے قائل نہیں ہیں۔ وہ مانتے ہیں کہ صرف یہی زندگی ہے۔ اور اس زندگی کے ختم ہو جانے کے بعد روزِ قیامت کو ہی وہ لوگ اٹھیں گے روزِ قیامت کو تو وہ اس زندگی کے اعمال کا ثمر پائیں گے ہی لیکن اس زندگی میں بھی جو اُن کو راحت و رنج ملتا ہے وہ تقدیر کے مطابق ہی حاصل ہوتا ہے۔

اس مسئلہ کے حل کی جستجو میں بہت عرق ریزیاں ہوئیں ہو رہی ہیں اور ہوتی رہینگی۔ اس گروہ کے لوگ بھی اکثر یک طرفہ ہی بحث کرتے ہیں۔ بعض تو کہتے ہیں۔ انسان مجبور ہے بعض کہتے ہیں کہ وہ فعل مختار ہے۔ یہ لوگ خالق کے تصرفات کے قائل نہیں۔ وہ اس بات سے منکر پائے گئے ہیں۔ کہ کوئی طاقت ہمارے افعال کی نگران ہے اور جزا و سزا کی قدرت اس نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہوئی ہے۔ وہ اپنے آپ کو فعل مختار کہہ کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں کسی پر جس طرح چاہیں ظلم کر سکتے ہیں ہم کسی کے جواب دہ نہیں اور نہ ہم سے پرسشِ اعمال ہونی ہے دوسری قسم کے لوگ جو انسان کو مجبور خیال کرتے ہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ ازل کے روز جو جس کی قسمت میں لکھا گیا۔ اب اس میں کمی بیشی ناممکن ہے اس لئے کسی محنت یا کوشش کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنی ہر ایک ناکامی اور محرومی کی وجہ محض تقدیر کو سمجھتے ہیں۔

اب ہم نے یہ غور کرنا ہے کہ اصلیت کیا ہے۔ اس بات کو جاننے کیلئے اول تقدیر کے معنی سمجھنے چاہئیں۔ تقدیر کے معنی ہیں وہ پیمانہ یا اندازہ یا قدرت یا طاقت یا قانون جو ہر ایک چیز کے لئے خالق نے بنایا ہے۔ مثلاً ایک کھجور کی گٹھلی کی تقدیر یہ ہے کہ اسکو لینے سے اس میں سے کھجور کا پیڑ ہی نکلیگا۔ انار یا آم کا نہیں۔ دھتورے کے بیج سے دھتورے کا پیڑ اُگے گا۔ انگور کا نہیں،

اب دنیا کے اندر ہر ایک چیز کو دو حالتوں میں سے ایک یا دونو خالق برتر کی طرف سے ملی ہیں ایک حالت طبعی اور دوسری حالتِ ارادی۔ حالتِ طبعی وہ ہے۔ جو اس کو قدرت کی طرف سے محدود بہ خواصِ مقررہ اس غرض کیلئے ملی ہوئی ہے کہ وہ باقی اشیا سے ممیّز ہوسکے۔ اور حالتِ ارادی اس کا نام ہے کہ جن کو وہ حالت عطا ہوئی ہے۔ اس سے وہ اپنے اعضا کو یا اپنے خیالات کو از خود کسی طرف لگا سکیں۔ بعض چیزوں کو صرف طبعی حالت ہی حاصل ہوتی ہے مثلاً پتھر وغیرہ۔ انکو حالتِ ارادی حاصل نہیں اسلئے وہ کوئی فعل اپنے ارادہ سے نہیں کرسکتے اور وہ اُسی وجہ سے نہ تو مجرم ہوسکتے ہیں نہ مکرّم۔ یعنی نہ مستوجب سزا نہ مستحق جزا۔ جن اشیاء کو جس حد تک حالتِ ارادی حاصل ہوتی۔ اسی قدر اس کی جزا و سزا اُن کے افعال سے منسوب ہوگی۔ اُس مولائے کریم نے جس قدر جن اشیاء کو حالتِ ارادی عطا فرمائی ہے اسی قدر ان کو مدارجِ ترقی پر پہنچنے کیلئے علم و قدرت بھی بخشا ہے۔ مثلاً پتھر وغیرہ جمادی اشیا کے اندر قوتِ ارادی تو بالکل نہیں۔ نباتات کے اندر کچھ قدرت ارادی ہے یعنی وہ اپنی خوراک کو زمین اور ہوا سے کھینچ سکتے ہیں۔ اور فضلات کو خارج کرسکتے ہیں اسلئے ان کی حالت اُنکی خوشرنگی وغیرہ اچھی یا بُری خوراک کے تناسب سے بدل جاتی ہے۔ نباتات سے کچھ زیادہ حالتِ ارادی حیوانات کو حاصل ہے۔ وہ اپنی حالت کو تو بہتر نہیں بنا سکتے اور نہ اپنے لئے نئی نئی ایجادیں کرسکتے ہیں لیکن اپنی پرورش اور حفاظت کیلئے ذرائع ڈھونڈ سکتے ہیں جس حد تک وہ اس بارہ میں کم یا زیادہ کوشش کریں گے۔ اُسی حد تک وہ اپنے لئے زیادہ رنج و راحت حاصل کریں گے جانوروں کے اندر بعض کو یہ قدرت زیادہ عطا ہوئی ہے۔ جیسے گھوڑے کو اور بعض کو کم جیسے گدھے کو۔ اس اندازہ کے مطابق ہی ان سے سعی و محنت کی توقع کی جاتی ہے مثلاً گھوڑے سے سرکس میں لڑائی میں، پولو کے کھیل میں۔ گھوڑ دوڑ نے پھاندنے وغیرہ میں تربیت دیکر کام لیا جاتا ہے۔ لیکن گدھے کی نسبت کبھی کسی کو خیال ہی نہیں آیا۔ کیونکہ گدھے کی حالتِ ارادی بالتقدیر گھوڑے کی نسبت بہت کم ہے۔

انسان کو سب سے بڑھ کر اور سب سے زیادہ مقدار میں حالت ارادی عطا ہوئی ہے۔ لیکن تاہم اس کے ساتھ قید بھی لگی ہوئی ہے اور ایک حد بندی ہوئی ہے۔ مثلاً انسان کوشش کر کے بھی سر کے بل نہیں دوڑ سکتا۔ کان سے دیکھ نہیں سکتا۔ آنکھوں سے کھا نہیں سکتا۔ خواہش رکھنے پر بھی اس زمین کو چھوڑ کر دوسری پر جا کر بود و باش نہیں کر سکتا۔ لیکن ہم کو خالق کریم نے عقل، قوت، آلات، قوت اور وسائل استعمال قوت بخشے ہیں تاکہ جو چاہیں اور جاہیں ان کو اچھے سے اچھا اور زیادہ سے زیادہ اختیار کر کے اپنی حفاظت اور ترقی کریں لیکن اس قوت کے استعمال کی ایک حد مقرر ہے۔ اس حد کے اندر رہتے ہوئے ہم ترقی کرنے میں قطعی مختار ہیں اور اس حد سے باہر کے سعی کرنے میں ہم بالکل مجبور ہیں۔ ایک فرق ہے جو آج تک بھی محسوس کرنا نہیں جا سکتا۔ اور کچھ لوگ اور بالکل ناکارہ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں یہاں ہے ہوس اور وہ ہے کہ جو اس حد کو توڑ کر آگے کی کوشش کرتا ہوا بے اندازہ مصیبتوں کا شکار ہوتا ہے۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ دو قسم کی حالتیں ہیں یعنی حالت طبعی یا فطری اور حالت ارادی یا عقلی۔ سو مذکورہ دونوں قدرتیں یا دونوں حیوان یا انسان میں ہوں گی۔ اسی قدر اس کا زیادہ غلبہ کم یا زیادہ ارادی رکھنے والوں پر ہوگا۔ لیکن اس غلبہ کا بھی اندازہ مقرر ہے کو مخلوقات کی قسم یا طبقات اور مختلف اشیاء کا آپس میں تعلق رہا ہے اس کا تعلق کا بھی اندازہ مقرر ہے۔ ان جملہ اندازوں کو قائم رکھنے کیلئے اور مقرر شدہ حقوق کی حفاظت کیلئے ایک اعلیٰ طاقت ہے جس کو قدرت یا قدرت الٰہی کہہ سکتے ہیں۔ وہ ان سب طاقتوں پر حاوی ہے۔ اس قدرت کے مقررہ اصول ہیں جو ہستی ان اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے وسائل ترقی کو کام میں لائے گی۔ وہ راحت پائے گی۔ اور جو ہستی اس قدرت کے اصولوں کو توڑ کر قدرت کا بھی مقابلہ کرنے لگ جائے گی۔ وہ رنج میں مبتلا ہوگی۔

عطیات الٰہی بے اندازہ ہیں۔ اور ہر ایک ہستی ان سے اپنی عقل اور قوت کے مطابق فائدہ اٹھا سکتی ہے اسی کا نام تقدیر ہے۔ لیکن جو غلطی ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس بات

کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ ہر ایک جیتی جان کو ان عطیہ جات سے اپنے ظرف و ضرورت مستفید ہونے کا حق حاصل ہے لیکن انسان اس شرط تقدیر کو بالکل پس پشت ڈال دیتا ہے اور دوسروں کے حقوق کا خیال نہ کرتا ہوا سب کچھ خود ہی غصب کر لینا چاہتا ہے اور اس طرح سے از خود اپنے لئے مصائب کو بلاتا ہے۔ دنیا کے اندر کوئی کسی کا دشمن نہیں انسان خود ہی اپنا دوست یا دشمن ہے ؎

یوں زیست نہ ہم کو اپنی بھاری ہوتی — کلفت بھی خوشی بھی باری باری ہوتی
ہوتے نہ اگر ہم آپ اپنے دشمن — یوں تلخ نہ زندگی ہماری ہوتی!

لہٰذا ہمارے لئے واجب ہے کہ ہم اپنی محنت و سعی کے ساتھ یہ شرائط لگا دیں کہ۔ ۱۔ ہم ایسی اشیاء کے حصول کی کوشش کریں جو ممکن الحصول ہوں۔

۲۔ ہمارے حصول میں کسی اور کی حق تلفی نہ ہو۔

۳۔ ہماری سعی و محنت سے وسائل کی نگرانی ایک قوت اعلےٰ ہے۔ اس لئے جو عقل و قوت ہم کو عطا ہوئی ہے ہم اس سے نہ تو محروم رہیں اور نہ اسکو اس طرح استعمال کریں کہ اس غیبی قوت سے مستوجب سزا ہوں۔

۴۔ جوں جوں ہمارا علم، ہماری قوت زیادہ ہو۔ ہم اپنی ترقی کے وسائل کو بھی وسیع کرتے رہیں لیکن اوپر کی تین باتوں کا خیال رکھتے ہوئے۔

۵۔ جہاں ہم اپنی عقل و قدرت سے وسائل ترقی کو استعمال کرنے کے باوجود ناکام رہیں تو نہ تو غصب میں آئیں۔ اور نہ مایوس ہوں۔ بلکہ سکون دل سے سوچیں کہ آیا ہم نے اپنے جائز وسائل کے استعمال میں کہیں کمی تو نہیں کی۔ یا ہم حد سے تجاوز تو نہیں کر گئے یا ہم نے اپنے وسائل کے استعمال میں کسی شرط تقدیر کو تو نہیں توڑا۔ یعنی ہم دوسروں کے حق پر تو چھاپہ نہیں مار رہے۔

۶۔ جب باوجود اپنی سعی بلیغ کے ہم کو انجام کار ناکامی ہو۔ تو اس کیلئے صبر و شکر لازمی

ہے۔ اس صورت میں ہم کسی سزا کے مستوجب نہ ہونگے۔ نہ کسی لعن طعن کے۔ مثلاً ہم نے کھیت لگایا کھاد اور پانی بہم پہنچایا۔ حفاظت کی کھیت پک گیا لیکن اچانک طوفان آیا اور پیداوار برباد کر گیا۔ ایسی صورت میں ہم بے قصور ہیں ہم کسی گناہ کے مرتکب نہیں سمجھے جاتے۔

۷۔ ہمارے افعال سزا و جزا کے ماتحت ہیں۔ مثلاً روزانہ زندگی میں بھی ہم جس کا ادب کرتے ہیں۔ وہ ہماری عزت کرتا ہے جس کی بے ادبی کرتے ہیں۔ وہ ہماری بے عزتی کرتا ہے جب ہم محبت کرتے ہیں تو بدلے میں پیار پاتے ہیں۔ جب نفرت کرتے ہیں تو نفرت خریدتے ہیں۔ یہاں پر اعتراض عاید ہو سکتا ہے۔ کہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ :-

ا۔ ظالم ظلم کرتے ہیں۔ تاہم ان کو کوئی سزا نہیں ملتی۔

ب۔ نیک کوشش والوں کو کوئی صلہ نہیں ملتا۔

ج۔ بار ہا۔ بغیر کوشش بھی بہت کچھ مل جاتا ہے۔

اس کے متعلق یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہماری دانش محدود ہے ہم قدرت اور قدرت کے مالک حکیم مطلق کے سارے رازوں سے آگاہ نہیں ہو سکتے بعض اوقات اپنی زندگی میں دیکھا گیا ہے۔ کہ ایک واقعہ کو ہم نے اپنے لئے بڑا مصیبت وہ خیال کیا لیکن کچھ عرصہ کے بعد اسی کو اپنے لئے ایک نعمت سمجھا۔ والدین اپنی اولاد کی تربیت کے لئے ان کو تادیب کرتے ہیں۔ یا ڈاکٹر مریض کا چیر پھاڑ کرتا ہے اور کڑوی ادویات کھلاتا ہے یا ایک مریض کو مرغن غذا دیتا ہے۔ دوسرے کو دلیا تیسرے کو شوربا۔ چوتھے کو دودھ اور پانچویں کو فاقہ کراتا ہے۔ تو والدین اور اطبا کو کوئی ان کے ان افعال کی وجہ سے مطعون نہیں کرتا اسی طرح حکیم مطلق کے کاموں کی پوری آگاہی انسان کو نہیں ہو سکتی اس کو نہ راست کہہ نہ اس کو تو غلط کیا جانے کیا صحیح ہے واقع میں کیا غلط پھر ایک ظالم کو ظاہرا سزا نہ ملتے ہوئے دیکھ کر ہم فرض کر لیتے ہیں۔ کہ وہ سزا سے بچ گیا ہے لیکن سزا دینے کا صرف وہی طریقہ نہیں۔ جو ہمارے دل میں ہے وہ مالک ہو نہ ہو

ہر لحاظ سے اپنا غضب نازل کر سکتا ہے دل کو رنج و غم کی شکل میں بعض دفعہ ایسا گھن لگتا ہے کہ اسکے مقابلہ کی کوئی سخت سزا ہی نہیں ہو سکتی پھر ضروری نہیں کہ ظلم کی سزا فوراً ملے بیج بوئے جانے اور پھل لگنے کے درمیان کچھ عرصہ لگتا ہے یہی نیکی یا بد کوشش کے اجر و سزا کو پانے ملنے کے متعلق سمجھ لینا چاہئے بغیر کوشش کچھ ملنے کے متعلق بھی ہمارا اپنا قیاس اور خیال اپنے منشا ہی پر مبنی ہوتا ہے اور ساتھ ہی ہم اسباب کو بھول جاتے ہیں کہ نیک خیالات رکھنا بھی ایک بڑی بھاری سعی ہے اسکو ہم عنصری آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے لیکن وہ عالم الغیب سب کچھ جانتا ہے اسلئے ہمارا نتیجہ درست نہیں ہو سکتا۔ انسان کی عقل انسان کا علم انسان کی طاقت محدود ہے۔ عالم مطلق، قادر مطلق اور حکیم مطلق وہ خالق برتر ہی ہے اسکی رضا اور اس کی طاقت فائق اور غالب ہے جو انسان ایسا سمجھ کر اور اس حد کے اندر رہ کر اپنی تقدیر سے فائدہ اٹھاتا ہے وہ ہر طرح سے کامیاب اور ممتاز ہوتا ہے لیکن جو انسان عزت اعتراض اٹھانے یا بال کی کھال نکالنے میں بیجا وقت لگاتا ہے اسکی مثال ایسی ہی ہے کہ جیسے ایک ملک نے نوکر کو کہے کہ تو باغ میں پھل اور پھول لگا لیکن وہ بجائے اس کام میں لگنے کے یہ کہے کہ میں اپنا کام تب شروع کرونگا جب مجھے پہلے بتایا جائے کہ باقی ملازمین کو دوسرے کام اور اعزاز کس وجہ سے دئے ہیں۔ مثلاً محاسب کو کیوں آرام کی نوکری دیکر اتنا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ چوکیدار کو کیوں بغیر کام کرائے اتنی عزت ملتی ہے۔ کیوں بعض آدمیوں کو حرم میں داخل ہونے کی اجازت ہے کیا اس نوکر کا یہ اعتراض درست ٹھہر سکتا ہے؟ مالک اپنے کاموں کو آپ جانتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ کون کس کام کے لائق ہے کس سے کیا خدمت لی جا سکتی ہے ایسے ہی ہم مالک علی کے حکم سے یہاں پر خاص خاص فرائض کی ادائگی کیلئے بھیجے گئے ہیں اور ہمارا یہ حق نہیں کہ دوسروں کے دکھ اعزاز اور عزت کے متعلق نکتہ چینی کرتے رہیں ہمارا تو یہی واجب ہے کہ اپنے فرض کو اس مالک برتر کے احکام کے مطابق نہایت احسن طریق سے سرانجام دیں اور نیک ثمرات کے مستحق ہوں ؎

ہم کو ادائے فرض میں غفلت نہ چاہیئے قدرت کے کاروبار میں حجت نہ چاہیئے
بیکار بیٹھے رہنے کی عادت نہ چاہیئے بوجہ ترک محنت و ہمت نہ چاہیئے!

دنیا میں زندگی کے فرائض کر پہلے ادا ۔ رازِ مقفل ذاتِ الٰہی میں بحث کیا
ہم کون ہیں جو حدِ ادب سے بڑھیں ذرا ۔ لیتے پھریں یہ کیوں نہ کیا اور وہ کیوں کیا؟

اس نازک سوال پر مسئلہ تناسخ کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں ہر دو کے نقطۂ نگاہ سے چند پراگندہ خیالات پیش کرنے کی کوشش اور جرأت کی گئی ہے۔ یا شاید مضمون کے نہ پسند خاطر ہوں گی لیکن غور کرنے والے صاحبان کے لئے سوچ و بچار کا کافی موقع ہوگا۔ دونوں طرح سے یہ امر ظاہر ہے کہ تقدیر اور تدبیر دونوں لازم و ملزوم ہیں جو شخص توکل کی رٹ لگاتے ہیں تو بھی ذاتِ کبریائی کے حکم کو شاید نہیں سمجھتے وہ بھول جاتے ہیں کہ اس حکیم برتر نے ہم کو عقل اور اعضا اور وسائل کس لئے عطا کئے ہیں۔ اس ربِ کریم سے مدد مانگنا برا نہیں، بلکہ یہ نہایت لازمی ہے۔ لیکن کسی نے کہا ہے

کوشش میں ہے شرطِ اولین انسان سے ۔ پھر چاہیئے مدد مانگنی یزداں سے
جب تک نہ کام ہمت و بازو سے لیا ۔ پائی نہ نجات نوح نے طوفان سے

بہت لوگ توکل کے معنی غلط لیتے ہیں وہ نکما پن کو اور ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھنے کو توکل کہتے ہیں اور ایسا ہی سمجھتے ہیں لیکن درحقیقت یہ ہے کہ توکل پر انحصار رکھنے سے پیشتر ہر ممکن جائز اسباب سے اپنی محنت اور کوشش لازمی ہے جیسے کہ پہلے اونٹ کو باندھ کر پھر حفاظت کے لئے خدا پر توکل کا نام لو اور اپنے مالک سے اپنی کوشش کے نیک ثمر کی دعا مانگو کہ کوئی ارضی و سماوی آفت اس کوشش کو نقصان نہ کرے۔ سمجھ لینا چاہیئے کہ

کاہلی اور توکل میں بڑا فرق ہے یار ۔ اٹھو کوشش کرو بیٹھے ہو کس دھیان میں
ہمارا فرض کیا ہے ہمارے لئے کیا کرنا واجب ہے

دسترس میں صید یہ حاصل تجھے ہر خواہ نہ ہو ۔ شیر بن جائے کہ کل صورت روباہ نہ ہو

الغرض ہمکو بالکل بے صبر بھی نہ ہونا چاہیئے۔ اور نہ سست ہو بیٹھ جانا، بازو کے زور سے کام لینا چاہیئے
تدبیر کو عمل میں لانا چاہیئے۔ لیکن تقدیر کی حد کو فراموش نہ کرنا چاہیئے

نہ بڑے اونٹ ہو نہ ہو پل ڈاک[1] ۔ نہ تو مٹی ہی ہو نہ تم ہو آگ
چال سب اعتدال کی اچھی ۔ سازِ حکمت کا خوب ہے یہ راگ

[1] چوڑے منہ والا گڑھا

انسان اور اس کی زندگی

وہ چال چل کہ عمر خوشی سے کٹے تری
وہ کام کر کہ یاد تجھے سب کیا کریں

انیسویں صدی کا ایک انگریز مصنف سر جیمز لکھتا ہے کہ انسان کی زندگی ایک ڈائری ہے جس میں ارادہ تو وہ خاص کہانی لکھنے کا کرتا ہے لیکن لکھ کچھ دوسری ہی بیٹھتا ہے۔ تب اس کی حالت اس گھڑی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے کہ جب وہ اس کہانی کا موازنہ اس سے کرتا ہے کہ جو کچھ وہ لکھنے کی امید کرتا تھا۔

درحقیقت ہم میں سے اکثر لوگوں کی یہی حالت ہے کہ وہ اپنی زندگی کو کیا سے کیا بنانے کا خیال لیکر اپنا کام شروع کرتے ہیں۔ لیکن جو سڑک کامیابی کی منزل کو جاتی ہے اس کو چھوڑ دیتے ہیں۔ تاہم دل میں پھر بھی یہی سمجھتے ہیں کہ ہم کامیابی کی راہ پر چل رہے ہیں۔ بالآخر جب اپنے مقام پر پہنچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم بالکل الٹی راہ پر چلے آئے۔ پھر اس وقت کچھ بن نہیں پڑتا۔ سوائے یاس و حسرت کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ جو کام کے دن تھے نکل گئے۔ جو وسائل حسنہ حاصل تھے وہ اب موجود نہیں رہے۔ بدن کی سکت و طاقت بھی ختم ہو چکی۔ لیکن پھر کیا ہو سکتا ہے ع

اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

اس بات سے تو کسی کو انکار نہیں کہ پیکر انسانی بڑی خوش قسمتی سے ملتا ہے۔ مسئلہ تناسخ کو ماننے والے کہتے ہیں۔ کہ کئی جنموں کے بعد بڑے ہی نیک اعمال کے ثمر کے طور پر یہ انسانی جامہ ملتا ہے جو آدمی اس کو کامیاب بنانے اور اس کو سپھل کرنے کے

چوک جاتا ہے اسکی مثال اس اندھے کی سی ہوتی ہے جو قلعہ میں گھرا ہوا ہو۔ اور اس کو بتایا جائے کہ صرف ایک دروازہ باہر جانے کا ہے۔ دیوار کے ساتھ ساتھ ہاتھ رکھتے ہوئے اس دروازے سے باہر نکل جانا۔ لیکن اندھا چلتا چلتا جب دروازے کے پاس پہنچے تو کھجلی کرنے لگ جائے۔ اور دروازہ سے آگے نکل کر پھر اسی چکر میں پڑ جائے۔ بار بار جنم مرن یا پیدائش و موت کے قلعہ کے چکر سے رہا ہونے کا دروازہ یہی پیکر انسانی ہے۔ جو شخص اس موقعہ کو ہاتھ سے دے بیٹھتا ہے۔ وہ پھر چوراسی کے چکر میں پڑ جاتا ہے۔

مسئلہ تناسخ کے نہ ماننے والے بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس ساری مخلوقات میں پیکر انسانی افضل ترین ہے مقابلہ کر کے دیکھئے کہ حیوانات میں شیر سب سے افضل سمجھا جاتا ہے لیکن اس بیچارے کو رہنے کو مکان نہیں۔ سردی گرمی جسم پر جھیلنی پڑتی ہے اپنی سردی کو دور کرنے کے لئے آگ تک روشن نہیں کر سکتا۔ اپنی حفاظت کے لئے کوئی بند مکان نہیں بنا سکتا جسم سے بو آتی ہے۔ خوراک نہ وقت پر ملتی ہے نہ حسب منشاء اگر ملتی بھی ہے تو لہو ہڈی غلاظت سب کچھ ایک ساتھ ہی کھا جاتا ہے۔ بھلا یہ کوئی زندگی ہے؟ پرندوں میں مور سب سے زیادہ خوشنما ہے لیکن اس کے بھی آرام و آسائش کی کم و بیش دیگر حیوانات یا پرندوں کی سی حالت ہے۔ اور کھانے کو سانپ ملتے ہیں غرضیکہ وحشی سے وحشی انسان بھی اچھے سے اچھے حیوان سے برتر ہے۔ وحشی لوگ بھی اپنی حفاظت اور شکار کے لئے تیر کمان بناتے ہیں۔ برے بھلے گھر بھی بنا لیتے ہیں آپس میں مل کر رہتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی زبان ہوتی ہے جس سے اپنی ضروریات اور خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں۔

پھر اس رب کریم نے انسان کو باقی ساری مخلوق پر فائق رکھا ہے ہاتھی اور گھوڑوں پر یہ سواری کرتا ہے۔ بھیڑ بکری اور کئی پرندوں کو کھاتا ہے گائے بھینس سے دودھ حاصل کرتا ہے۔ کئی جانوروں کے کھال۔ بال اور ہڈی کو اپنی ضروریات زندگی کے لئے استعمال کیا

لاتا ہے۔ ایک دن دوران گفتگو میں میں نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ خالق برتر نے سب چیزیں کسی خاص غرض کیلئے بنائی ہیں۔ اور ہر ایک چیز کے پیدا کرنے میں اسکی کوئی نہ کوئی حکمت ہے وہ ہنسکر کہنے لگا کہ تم پرانے خیالات کے لوگ ہمیشہ یہی رٹ لگاتے رہتے ہو۔ اچھا بتاؤ۔ کہ مکھی سانپ اور شیر انسان کے کس کام آتے ہیں اور ان کے پیدا کرنے میں کونسی حکمت چھپی ہوئی ہے۔ یہ تو ہر طرح سے انسان کے دشمن ہیں مکھی بیماریاں لاتی ہے۔ شیر اور سانپ انسان کی جان کے دشمن ہیں۔ میں نے عرض کیا۔ کہ میری عقل تو محدود ہے۔ میرا علم بھی محدود ہے۔ اس لئے اس حکیم مطلق کی ہر ایک حکمت کو سمجھنا تو میرے لئے نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ لیکن ہاں تینوں چیزوں کے متعلق جو کچھ میرے مالک نے اس وقت میرے دماغ میں بات ڈالی ہے۔ میں عرض کئے دیتا ہوں اوّل آپ مکھی کو لیں۔ اس سے بڑھ کر حضرت انسان کو خبردار کرنیوالا کوئی چوکیدار نہیں۔ صفائی انسان کی صحت۔ زندگی۔ خوشی اور عبادت کے لئے بہت ضروری شے ہے۔ لیکن انسان اگر صفائی کی طرف سے ذرا بھی لاپرواہ ہو۔ تو مکھی فوراً وہاں پہنچکر آگاہ کر دے گی۔ کہ صفائی سے غافل ہو گئے ہو۔ برعکس اسکے اگر گھر کے اندر پوری صفائی ہو۔ تو مجال نہیں کہ یہ بیچاری نزدیک بھی جائے۔ جہاں بھی گندگی اور غلاظت ہوگی۔ یہ وہاں پہنچکر تمہاری لاپروائی اور غفلت کا پتہ دیگی غرضیکہ جو مقام۔ جو چیز جو جسم کا حصہ یا جو کپڑا میلا ہوگا۔ وہیں مکھی آئے گی بیشک آپ کہہ سکتے ہیں کہ مکھی کھانے کی چیزوں پر آ بیٹھتی ہے اور دوسری جگہ سے کئی قسم کے جراثیم لا کر کھانے میں ملا دیتی ہے۔ لیکن کیا مکھی کی یہ عادت آپ کو یہ نیک سبق نہیں سکھاتی کہ ہر ایک چیز کو ڈھک کر رکھا جائے۔ مکھی کے علاوہ گرد و غبار اپنے منہ کا سانس اور تھوک اور دیگر لوگوں کی نگاہ بھی کھانے پینے کی اشیاء پر نہ پڑنا چاہیئے۔ اس لئے اگر مکھی کی اس عادت سے ہم غافل نہ ہوں تو باقی بڑی بڑی چیزوں سے بھی اشیاء کے خوردونوش کو محفوظ

رکھنے کا حکم کرنا شاید کم خیال آئے۔ اس طرح سے یہ بھی انسان کے لئے مفید ہے۔ اب سانپ کو دیکھئے۔ اگر سانپ کا خوف انسان کو نہ ہو تو بہت سے کم دل انسان بھی دوسرے لوگوں کے گھر میں پڑی ہوئی چیزوں کے اندر ہاتھ ڈالنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اسی طرح اکثر لوگ رات کو اندھیرے میں (جو کہ گناہ اور برائی کا پردہ ہوتا ہے) سانپ اور دیگر زہریلے جانوروں کے ڈر سے باہر نہیں جاتے۔ ورنہ [illegible] ڈالتے ہیں۔ بھیڑیا شیر اور دیگر خونخوار جانور اگر نہ ہوں تو لوگ رات کو [illegible] کریں یا دیگر طرح سے ہلاک کریں اور اس طرح سے نسل انسانی کو محروم کر دیں۔

غرضیکہ کسی چیز کی موجودگی بھی خالی از حکمت نہیں ہم اگر قدرت کے عطیات اور اسرار سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ہم ان چیزوں کو جو ہمارے سامنے پیش آتی ہیں۔ ان سے اپنی عقل کے مطابق اندازہ لگا لیتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ــ

تیری قدرت کی حد یارب بشر کیا سمجھ سکتا ہے　بہت چیزیں کہ جن کی حکمت کوئی پا سکتا ہے
کسی کی کیا حقیقت کھل سکی تیری حقیقت پر　کروڑوں سال بیت گئے کوئی جان سکتا ہے
یہ وہ مجید ہے کہ جس میں لفظ "پایا" آ نہیں سکتا　یہ وہ مشکل ہے کہ جس کا جواب نہیں ہو سکتا

مگر ان معموں کے حل کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے ہمیں تو دیکھنا یہ ہے کہ ہم زندگی کو کس طرح سے کامیاب بنا سکتے ہیں۔ پہلے ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ ایک گروہ خیال کرتا ہے کہ یہ زندگی دکھوں کا گھر ہے۔ سوائے رنج و غم کے اس میں کچھ نہیں رکھا۔ وہ کہتے ہیں ــ

دیکھا کسی کو شاد نہ دنیا میں آج تک　آشفتہ کون ہے جسے رنج و الم نہیں

وہ غم دنیا سے اس قدر بیزار رہتے ہیں کہ انہیں خوشی کہیں نام کو بھی دکھائی نہیں دیتی۔ ان کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جتنے انسان اس دنیا کے اندر رہ کر چلے گئے وہ بھی رو رو کے ہی گئے اور جو موجود ہیں ان کو بھی واسطے رونے دھونے کے اور کوئی کام نہیں ہے ــ

دنیا مقام غم ہے خوشی نام کو نہیں ۔ جو اس چمن میں آیا وہ گیا لٹ کر گیا

پھر وہ لوگ خوش کن لوگوں کو سمجھتے ہیں ۔ ان کی نگاہ میں سلامتی کس جگہ ہے جہاں

کہاں ملتی ہے ۔ وہ کہتے ہیں ۔

چھوڑیں نہ بیٹھیں دنیا میں راحت نہیں یہاں ۔ آرام کسی کو نہیں نصیب ہوا دنیا میں

سوائے اپنے لئے ایسا ہی آرام طلب کرتے ہیں ۔ دنیا سے [illegible]

جہاں سے [illegible] دیکھتے ہوئے کہتے ہیں ۔

انتہا سے [illegible] زندگی نہیں ۔ اجل نے آ [illegible]

پس اس دنیا کو چھوڑ کر بھی انہیں آرام ملنے کی توقع ہے ۔ اس سے پیشتر نہیں جیسے کنوئیں سے [illegible] پریشانی اور سرگردانی کی حالت میں ہوتا ہے ایسے ہی وہ حیران و پریشان رہتے ہیں ۔ اور موت سے ہم آغوش ہونا ہی ان کا علاج سمجھ لیتے ہیں گویا [illegible] ہیں ۔

زندگی بھی مصیبت تھی کہ انسان کی پناہ ۔ جان نکلی ہے تو اب [illegible]

دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ دنیا عیش کرنے کی جگہ ہے یہ ایک سیرگاہ ہے ۔ اس میں خوب پھرو ۔ مزے اڑاؤ EAT, DRINK & BE MERRY کھاؤ پیو اور چین اڑاؤ ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس دنیا کے بعد نہ کوئی دوسری دنیا ہے نہ کوئی اور زندگی جو کچھ ہے یہی زندگی ہے ۔ اس زندگی سے پرے کچھ نہیں ۔ اس زندگی کا جس قدر لطف اٹھایا جا سکے اٹھانا چاہئے ۔ زندگی کو فکر و تردد یا تشویش میں گزارنا حماقت اور نادانی ہے اس دنیا میں آنے کا مقصد یہی ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کی چیزوں سے فائدہ اٹھایا جائے ان کا خیال ہوتا ہے کہ ہر ایک چیز انسان کے استعمال کے لئے بنی ہے ۔ قدرت کی ساری چیزیں انسان کے لئے بنائی گئی ہیں ۔ ہر ایک چیز کو استعمال میں لانا انسان کا حق ہے وہ یہ بھی خیال نہیں کرتے کہ ان کے عیش و عشرت پر کوئی قید یا حد ہے [illegible]

گمان ہے کہ کوئی اُن سے پرسشِ اعمال کرنے والا یا جزا و سزا دینے والا بھی ہے ان کا تو یہی حال ہے۔ کہ ؎

ہر شب شبِ برات ہے ہر روز روزِ عید — سوتا ہوں ہاتھ گردنِ مینا میں ڈال کے

اُن کو اپنے ہی آرام کا اپنے ہی عیش کا خیال ہوتا ہے۔ بمصداق "کوئی مرے، کوئی جیوے، سُتھرا گھول بتاشہ پیوے" وہ اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح بھی ہو سکے اپنے لیے آرام کے سامان مہیا کیے جائیں وہ کہتے ہیں پی، پی، قرض لیکر بھی پی - انہیں نہ کسی سے ہمدردی نہ کسی سے محبت نہ کسی کا غم نہ کسی کا درد۔ وہ تو یہی کہتے جاتے ہیں ؎

ہر ایک موسم میں کشتِ آرزو سرسبز رہتی ہے — تردّدِ غیر کو ہوگا یہاں تو چین کرتے ہیں

یہ دونو گروہ ہی یعنی ایک سارا دن رونے دھونے سے واسطہ رکھنے والے اور دوسرے کسی کے لئے بھی درد و غم نہ رکھنے والے زندگی کے حقیقی مقصد کو نہیں سمجھتے۔ روس کا مشہور مصنف ٹالسٹائی لکھتا ہے کہ بہت آدمیوں کا یہ خیال کہ زندگی رونے دھونے کا ہی نام ہے بے بنیاد ہے۔ ایسے ہی وہ خیال بے بنیاد ہے کہ جو جوانی صحت اور زر و دولت کے ایام میں پیدا ہوتا ہے کہ یہ زندگی محض عشرت کے لئے ہے۔

پھر زندگی کی کامیابی کا معیار کیا ہے۔ غور کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ اس دنیا میں اسی شخص کی زندگی کامیاب سمجھی جاتی ہے جس کو خود تو خوشی حاصل ہے اور دوسرے لوگ اس کو پیار اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور اگلی دنیا کے لئے اس نے توشۂ آخرت اکٹھا کر لیا ہے ؎

وہی انسان ہے انسانِ کامل — کہ جس نے خدمتِ خلقِ خدا کی
خوشی سے ہے سرا سر شاد رہتا — محبت جس کے دل میں ہے خدا کی

انگلستان کے مصنف مسٹر جانسن لکھتے ہیں کہ دیگر تمام نعمتوں کی طرح زندگی کی قدر و قیمت اس کے استعمال سے کی جا سکتی ہے۔ لیکن وہ استعمال اپنے فائدے کے

لئے نہیں۔ بلکہ ایک زیادہ مبارک مقصد کیلئے ہو۔ اور وہ مقصد ہے "نیکی"۔

۱ انگلستان کے مشہور شاعر جے وڈ نے لکھا ہے کہ "میں اپنی زندگی کے اس حصے کو ضائع شدہ سمجھتا ہوں کہ جو یادِ خدا میں نہ گذرے۔ یا جو نیکی کرنے کیلئے صرف نہ ہو۔ اسی لئے کہا ہے۔ کہ ؎

انسان کرے وہ بات کہ اجر و جزا ملے   بندہ چلے وہ راہ کہ جس سے خدا ملے

دیکھنے میں آتا ہے کہ اکثر انسان اپنے مقصدِ زندگی سے غافل ہیں وہ اپنے قیمتی لمحات کو روز بروز ہزلیات میں کھونے کے عادی ہو رہے ہیں۔ وہ اپنے نفع و نقصان پر کبھی غور نہیں کرتے۔ ان سے پوچھنا چاہیئے ؎

نہ بھولے سے کوئی دم بھی اِدھر تجھے دھیان نہ آیا   کہ میں ہوں کون جاتا ہوں کدھر کس سمت سے آیا

اس لئے ہمیں اپنی زندگی پر ہمیشہ دھیان دیتے رہنا چاہیئے کہ وہ متذکرہ بالا پہلوؤں سے کامیاب ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو اس کی خامیاں دُور کرنا چاہئیں۔ کامیاب زندگی بنانے کے لئے ابتداء ہی سے اچھی بنیاد ہونا چاہیئے۔ بچپن سے ہی اس کی تیاری ہونا چاہیئے ہمارا عام طور پر خاصہ یہ ہے کہ ہم وقت پر دھیان نہیں دیتے اور بعد میں ہماری کوشش سود مند ثابت نہیں ہوتی۔

بچپن اوائل عمر سے ہی بچے کی تربیت اس قسم کی ہونا چاہیئے اور اسکی عادات ایسی بنائی جائیں۔ کہ وہ اپنی آنے والی زندگی میں ان پر عمل پیرا ہو کر کامیابی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔ جیسے پیداوار اچھی حاصل کرنے کیلئے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ زمین اچھی ہو۔ پھر بیج اچھا ہو۔ پھر اس کی احتیاط اور حفاظت کی جائے۔ ایسے ہی اچھے کامیاب انسان پیدا کرنے کیلئے بھی ان تینوں چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ انسان کی حالت میں زمین ماں ہوتی ہے۔ ماں کے خیالات اور افعال کا اثر بچے پر براہ راست پڑتا ہے اسلئے پہلے ماتری شکتی[لہ] کیطرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ جس دیش کی مائیں تربیت یافتہ

لہ چلنے والی طاقت۔

پاکیزہ خیالات کی اور اچھے اخلاق اور سلیقہ والی ہیں۔ وہاں کے انسان ضرور دنیا میں میدانِ عمل میں اُترنے والے اور اپنے فرائض کو سمجھنے والے پیدا ہونگے۔ عام طور پر جتنے بڑے آدمی ہوئے ہیں۔ ان سب کی مائیں اچھی تھیں۔ ہمارے ملک کی دیویوں کے کارنامے زبان زدِ خلائق ہیں۔ لیکن موجودہ زمانہ میں وہ عنقا ہو رہے ہیں۔ ہماری بہنیں بھی مردوں کی طرح مغرب کی بری باتوں کو اپنی زندگی کے اندر داخل کر رہی ہیں۔ لیکن وہاں کی صنفِ نازک کی نیک عادات مثلاً محنت کرنا گھر کے سب کام کاج کرنا بیمار اور تکلیف زدہ کی خدمت کرنا موقعہ پڑنے پر اپنی جان تک کی پرواہ نہ کرنا۔ ان باتوں کو وہ بالکل بھلا رہی ہیں۔ ہماری بہنیں فیشن اور بے حیائی میں تو ان سے بھی چار قدم آگے بڑھنا چاہتی ہیں لیکن انکے اوصافِ حسنہ کی طرف توجہ نہیں رہتیں۔ یہ ایک بہت بری لہر چلی ہے جس سے ملک کو خبردار ہونا چاہیئے یہ رویہ ہمارے ملک کے حالات سے موافق نہیں۔ اس کے بد نتائج کا اظہار پہلے ہی ہونا شروع ہو گیا ہے اور اگر اس کا جلد تدارک نہ کیا گیا۔ تو ملک کی مزید تباہی میں کوئی شک نہیں۔

ماں کے بعد باپ ہے وہ بھی نیک خیالات والا بہادر اور فرض شناس ہونا چاہیئے۔ اولاد پیدا کرنے کے متعلق ان تمام اصولوں کو جاننے والا ہونا چاہیئے۔ جو اس بارہ میں ہماری کتبِ مقدسہ اور ہمارے بزرگوں نے بیان فرمائے ہیں۔ ورنہ بے ارادہ کی اولاد ایسی ہی ہوتی ہے جیسے موسم برسات کا گھاس پھوس جو فرق طیاری سے لگائے ہوئے باغیچہ کے پودوں اور برسات کی خود رو گھاس پھوس کا ہوتا ہے۔ وہی ارادہ اور بے ارادہ کی پیدا کی ہوئی اولاد میں ہوتا ہے۔ اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے شیر پیدا ہوتے ہیں۔ اور بلا ارادے سے گھٹیا کے نیچے یا جوئیں ہی پیدا ہوتی ہیں۔

بچہ پیدا ہونے کے بعد اس کی تعلیم و تربیت احتیاط سے ہونا چاہیئے۔ بچوں کو اچھی تعلیم کے زیور سے مزین کرنا چاہیئے۔ اور خود سچائی۔ راست بازی۔ پاکیزگی۔ ایمانداری سادگی اور خوش اخلاقی کا نمونہ بن کر ان کے سامنے رہنا چاہیئے کس طرح سے

ایک باپ جو خود جھوٹ بولتا ہے اپنے بچوں کو اس عادت سے باز رہنے کے لئے کہہ سکتا ہے یا اس کے کہنے کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔ ہم اولاد کو اچھا بنانے کی امید تبھی باندھ سکتے ہیں۔ اگر خود اُن اوصاف کو اپنے اندر رکھتے ہوں جو اپنی اولاد کے اندر لانا چاہتے ہیں۔ ہم کو کیسا بننا چاہیئے ؎

خوش بیاں، خوش لہجہ، خوش اخلاق، خوش خو، خوش ادا
ذی ہنر، ذی علم و فن و حوصلہ زیرک ذکی
پاک باطن، پاک ظاہر، پاک طینت، پاک دِل
کینہ و بُغض و حسد حرص و تعصّب سے بری

اگر ہم خود ایسے بنیں گے تو ہماری اولاد بھی اِن اخلاقِ حسنہ سے مزیّن ہوگی بچپن زندگی کی بنیاد ہوتا ہے اگر بچپن میں نیک عادات بن جائیں اور نیک اطوار حاصل ہو جائیں۔ تو باقی زندگی کی کامیابی کی نیک بنیاد پڑ جاتی ہے۔

جوانی جوانی دیوانی کہی جاتی ہے۔ اس کے اندر بڑے تلاطم آتے ہیں بڑی آندھیاں آتی ہیں جن نوجوانوں کی تربیت شروع سے اچھی ہوتی ہے وہ ان آندھیوں کو برداشت کر جاتے ہیں۔ ورنہ اس کے بگولے میں پھنس کر اپنی تباہی کا باعث بنتے ہیں۔ آجکل کے نوجوان ناپاک محبّت کو بھی اپنا جزوِ زندگی سمجھتے ہیں محبت جوکہ ایک پاک لفظوں سے بنی ہوئی شے ہے اس کے نام کو پلید کر رہے ہیں اگر انکو سمجھایا جائے تو وہ اپنے بزرگوں کو پرانے زمانے کے جانور کہہ کر بحث کرنے لگتے ہیں کہ محبت کے بغیر انسان انسان کہلانے کا مستحق ہی نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ محبّت سے خالی انسان حیوان سے بھی بدتر ہے۔ لیکن وہ کونسی محبّت ہے۔ اپنی بہنوں کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا محبّت نہیں۔ یہ تو پرلے درجے کی رذالت اور بداطواری ہے محبت نام ہے غریبوں، بیکسوں، بے سہارا لوگوں۔ بیماروں مصیبت زدہ بھائیوں سے ہمدردی

کرکے ان کی تکالیف کو دور کرنے کا۔ محبت اس بات کا نام ہے کہ ؎

مصیبت جسکو پیش آئے تو اُسکا آشنا تو ہو   کوئی ماتم زدہ پائے تو دل سے غم رُبا تو ہو
کوئی ہو راہ گم کردہ تو اُسکا رہنما تو ہو   غرض ہر زخم کا مرہم ہر اک دُکھ کی دوا تو ہو
جہاں مشکل کی پڑ جائے گرہ ناخن ترا کھولے   تو ہر اک درد میں شامل ہو ہر آواز پہ بولے

حقیقی محبّت کیا ہے۔ اس کے متعلق ایک علیحدہ باب میں مفصّل تذکرہ ہو چکا ہے جو لوگ سچی محبت سے آشنا ہوتے ہیں۔ وہ تو اپنی اغراض اور اپنے فوائد کو دوسروں کے لئے قربان کر دیتے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ ؎

جو راہِ دوستوں میں لے تیر مر گئے ہیں   مر دینگے لوگ ان کے پاک نشان کے اوپر

جن کو سچی محبت کی لگن لگ جاتی ہے۔ جن کے اندر دوسروں کے درد کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ایک نشے کے اندر سرشار رہتے ہیں۔ حقیقی پریم کی تو ایک رتی بھی انسان کے لئے کافی ہے۔ جیسے کہ کبیر صاحب نے کہا ہے ؎

سب سائن میں کیا پریم سمان نہ کوئے   رتی من میں سنچرے سب تن کنچن ہوئے

ترجمہ:۔ "میں نے سب قسم کی کیمیا آزما کر دیکھ لیں لیکن پریم کے مقابلہ کی کوئی بھی نہیں اگر اس کی ایک رتی بھی دل میں پیدا ہو جائے تو سارا جسم سونے کا بن جاتا ہے۔"

لیکن جس پریم سے ہمارے آجکل کے نوجوان واقف ہیں اسکا نتیجہ کیا ہوتا ہے ؎

پہلے بُتوں کے عشق میں ایمان پہ بنی   پھر ایسی آبنی کہ میری جان پہ بنی

جھوٹا عشق مٹی اور خون کا عشق۔ سفید رنگ اور سیاہ بالوں کا عشق ہرگز ہرگز عشق نہیں یہ تو اخلاق و ایمان کی تباہی اور جوانی کی بربادی ہے۔ اس کے بس میں آکر اسکا شکار ہو کر جہاں انسان اپنی عزت آبرو اور ساکھ کھوتا ہے۔ وہاں اور کیا جاتا ہے ؎

تاب و طاقت، صبر و راحت، جان و ایمان عقل و ہوش،
ہائے کیا کہئے کہ دل کے ساتھ کیا کیا جائے ہے!

اے میرے نوجوان بھائیو! اس مرض میں مبتلا نہ ہونا۔ جوانی بجائے خود ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں۔ لیکن یہ مرض تو جوانی کا بہت جلد خاتمہ کر دیگا۔ جوانی خود زندگی کا ایک عارضی دور ہے۔ اگر اسکو ایسی فضولیات میں کھو بیٹھے تو پھر پچھتاتے ہوئے کہو گے ؎

کچھ قدر نہ کی عہدِ جوانی کی صد افسوس!
ہم رہ گئے غفلت میں یہ آیا بھی گیا بھی

اس مرض سے محفوظ رہنے سے ہی زندگی بن سکتی ہے۔ بزرگوں کو جوانوں کے لئے ہمیشہ یہ دعا کرنی چاہیئے۔ کہ وہ اس سے بچے رہیں ؎

جو دانش مند ہیں وہ یوں دعا دیتے ہیں لڑکوں کو
نہ ہو مکار پیری میں نہ ہو عاشق جواں ہو کر

یہی دن میدانِ عمل میں کام کرنے کے ہیں۔ یہی دن ترقی کے ہیں یہی دن اٹھنے کے ہیں۔ اسی زمانہ میں اپنے آپ کو اونچا اُبھار سکتے ہیں۔ اپنے لئے اپنے والدین کیلئے، اپنے خاندان کیلئے اور اپنے ملک کیلئے نام پیدا کر سکتے ہو۔ اگر بال سنوارنے۔ لونڈر لگانے اور نزاکت کی چالیں چلنے میں ہی یہ وقت گذار دیا۔ تو کفِ افسوس ملتے ہوئے کہنا پڑیگا ؎ کیا یاد کر کے روؤں کہ کیسا شباب تھا
کچھ بھی نہ تھا، ہوا تھی، کہانی تھی خواب تھا

لڑکپن تو کھیل کود یا نادانی میں نکل جاتا ہے بڑھاپے میں سب اعضاء وغیرہ کمزور اور ڈھیلے پڑ جاتے ہیں حقیقی وقت جو ہوتا ہے وہ تو جوانی کا ہی ہوتا ہے اسی وقت اپنی زندگی کا مقصد سامنے رکھ کر اسے حاصل کرنا چاہیئے ؎

زندگی اک تیر ہے جانے نہ پائے رائیگاں
دیکھ لو پہلے نشانہ بعد میں کھینچو کماں

وہی شخص عمر دراز ہے جو اپنی زندگی کے مقصد کو خوب سوچتا ہے پھر دوسروں

کے لیئے بہت زیادہ درد رکھتا ہے اور نہایت اچھے اعمال کا مالک بنتا ہے۔

ہمارے نوجوان اپنی زندگی کا کوئی مفید پروگرام نہیں بناتے۔ ہر صیغہ کی حد کو پار کرتے ہیں۔ اصولوں کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ قانونِ قدرت کو قدم قدم پر توڑتے ہیں نتیجہ کیا ہوگا ؎

جوانی کو ذرا پروا نہیں بے اعتدالی کی
بڑھاپے میں نتیجے اس کے یہ نادان دیکھینگے

ہمارے ہاں نہ کوئی کھانے پینے کا اصول ہے نہ باقی باتوں کا۔ اس لئے زندگی بڑی بے قاعدہ اور بغیر اصول کے ہوتی ہے۔ کھانے کے متعلق تو خصوصاً ہم لوگ بہت ہی لاپروا واقع ہوئے ہیں۔ زیادہ خوری اور غلط خوری سے جتنی بیماریاں و اموات واقع ہوتی ہیں اور کسی سبب سے نہیں۔ پھر ہمیں وقت کی بھی کوئی قدر نہیں۔ فضول باتوں میں اپنی زندگی کے قیمتی لمحات کو ضائع کیا جاتا ہے۔ نیک انسانوں کے جو اصول ہیں وہ یہ ہیں ؎

اصل کارِ صوفیاں کم خوریست ذکر و فکر و خلوت و بیداریست
جز حضورِ دوست نبود دین شاں گنگی و خاموش است آئین شاں

ترجمہ۔ نیک انسان کا پہلا کام کم کھانا ہے۔ پھر مالک کو یاد کرنا اور اپنے اعمال پر نظر کرنا۔ زیادہ لوگوں میں جانے سے پرہیز کرنا اور ہر ایک طرح سے خبردار رہنا۔ سوائے خدائے برتر کی حضوری کے ان کیلئے اور کوئی دین نہیں ہوتا اور سوائے خاموش رہ کر عبادت میں لگنے اور اپنی حالت پر غور کرنے کے ان کا کوئی مدعا نہیں ہوتا۔

سکاٹ لینڈ کا مشہور شاعر اور مصنف آر۔ایل سٹیونسن زندگی کے پروگرام کے متعلق لکھتا ہے کہ انسان اگر اپنی زندگی کو حقیقی طور پر کامیاب بنانا چاہتا ہے تو اُسے واجب ہے کہ ایماندار اور راستباز ہو۔ نیک دل ہو۔ بیشک زیادہ نہ کمائے۔ لیکن کمائی سے زیادہ خرچ نہ کرے۔ اس کی موجودگی لوگوں کے لئے باعثِ خوشی ہو۔ قربانی اور دوسروں کی خدمت کا جذبہ دل میں موجود ہو۔ دوست تھوڑے بنائے

لیکن ہوں سب سچے۔ اور خود بھی ان کا سچا دوست بنکر رہے یہ لائحہ عمل اس کی زندگی کو سارے مصائب سے محفوظ رکھ کر انجام کار باعث راحت ثابت ہوگا۔

ہمارے ہاں اس وقت اس پروگرام کے بالکل برعکس عمل ہو رہا ہے۔ خاص کر راستبازی اور راست شعاری کو تو ہم جانتے ہی نہیں۔ کہ کس بلا کا نام ہے۔ بات بات میں جھوٹ، قدم قدم پر دھوکہ ہمارا شیوہ بن گیا ہے۔ اسی لئے نہ ہماری عزت اپنی نظروں میں ہے نہ دوسروں کی۔ ایک آدمی کوئی چیز طیار کر کے مارکیٹ میں بھیجتا ہے۔ لوگ حُبِّ وطن کے خیال سے اسکو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے ہی دن اس میں روپے میں سے ایک پیسہ اور نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسکی بکری رُک جاتی ہے۔ ایک تو ایمان گیا۔ دوسرے اپنا نقصان ہوا۔ تیسرے ملک کی تجارت اور صنعت کی ترقی رُکی۔ چوتھے بے اعتمادی بڑھی۔ پانچویں دیگر لوگوں کے حوصلے پست ہوئے دیگر ملکوں نے صنعت و حرفت میں کیوں زیادہ ترقی کی۔ کیونکہ وہ حتی الوسع راست بازی سے کام لیتے ہیں۔ کپڑوں کے تھان اور کاغذوں کے تختے تیار کر کے ان کی پڑتال کی جاتی ہے۔ جو ذرا بھی خراب ہو اس کو علیحدہ نکال لیا جاتا ہے اور گھٹیا درجہ کا شمار کر کے کم قیمت پر بیچا جاتا ہے۔ لیکن یہاں کوئی چیز وی پی سے منگواؤ۔ تو کئی حالتوں میں وہ مستعمل۔ میلی۔ پھٹی ہوئی داغدار بھیجی جائے گی۔ چند روز ہوئے مدراس سے میرے ایک دوست نے ایک کتاب منگوائی۔ وہ سیکنڈ ہینڈ آئی۔ جگہ جگہ صفوں اور جلد پر داغ لگے ہوئے تھے۔ وہ میرے پاس بڑے غصے سے آئے اور کہنے لگے "ہندوستانیوں کا بیڑا غرق ہو یہ کبھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ نہ اُٹھ سکتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ان سب کو پکڑ کر یک دم سمندر میں ڈبو دیا جائے۔

ہمارا شیوہ ہے کہ جو کام دوسروں کی نظر سے اوجھل ہو کر کیا جا سکے اس میں دھوکہ کرنا شیرِ مادر سمجھا جاتا ہے۔

عیب کچھ گنتے نہیں اس عیب کو!

جس سے ہوں اپنے سوا سب بے خبر!

بازار کے اندر جاؤ۔ دکاندار گاہک کو لوٹنا چاہتا ہے۔ گاہک دکاندار کی آنکھ میں مٹی ڈالنا چاہتا ہے۔ گھر کے اندر جاؤ۔ باپ کو بیٹے پر، خاوند کو بیوی پر بھائی کو بھائی پر اعتبار نہیں۔ سکول یا کالج کے اندر جاؤ۔ طالب علم کو استاد کا ادب نہیں۔ استاد کو شاگرد سے اُنس نہیں۔ ایک دوسرے کو اُلو بنا کر اپنا وقت نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچہریوں میں جاؤ تو انصاف پیسے اور سفارش سے بک رہا ہے۔ جگہ جگہ پر کم فہم زمیندار کو اہلکار، وکیل، عرائض نویس اور دیگر لوگ دبوچنے کیلئے بیٹھے ہیں۔ زمیندار کا بھی بس چلے۔ تو وہ بھی ان کو اپنی طرف سے دھوکہ دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا۔ غرضیکہ ہر جگہ ہوشیاری، چالاکی۔ فریب اور بے اعتمادی نظر آتی ہے۔ راست بازی ایمانداری کا نام نہیں حتیٰ کہ خدا کے گھر بھی پہنچو۔ تو وہاں بھگت لوگ پجاریوں کو بُدھو بنانا چاہتے ہیں۔ اور پجاری بھگتوں کو ٹھگنا چاہتے ہیں۔ اور یہ دونوں مل کر خدا کو بھی ٹھگنا چاہتے ہیں۔ وہی حالت ہے ؎

نہ عاقبت کا کسی کو ڈر ہے نہ عزت قوم پر نظر ہے

سروں میں سودا سما رہا ہے دلوں سے غیرت نکل رہی ہے

اس حالت میں ملک کیا ترقی کر سکتا ہے لاکھ سرمارو کچھ نہ ہوگا۔ جب تک باہمی اعتماد نہ بڑھے۔ کوآپریشن[1] نہ ہو۔ کسی صیغے میں بھی ترقی کا ہونا ناممکن بلکہ ترقی کا خیال ہی فضول ہے جبتک آپس میں میل ملاپ سے کام کرنے کی عادت پیدا نہ ہو۔ اور دماغ میں صرف یہی سمایا ہوا ہو۔ کہ ہر ایک انسان خود کسی نہ کسی طرح سے پیٹ بھر کر کھالے۔ باقی لوگ خواہ بھاڑ میں جائیں یا چولھے میں تب تک کسی قسم کی ترقی کا خیال ایک وہم اور ایک خواب ہی رہے گا۔ کوآپریشن کے اصول سے اگر ہم واقف ہو جائیں

[1] مل کر کام کرنا۔

تو پتہ لگیگا۔ کہ ؎

محبت سے لیا لیجام ہے کوآپریشن کا محبت دوسرا اک نام ہے کوآپریشن کا
بڑھو اس کی حمایت میں چلو اسکی قیادت میں کہ سیدھی راہ پہ ہر گام ہے کوآپریشن کا
ترقی کامرانی شادمانی فارغ البالی!
برائے تجربہ انجام ہے کوآپریشن کا!

ایک اور مرض جو ہماری ترقی میں رکاوٹ ڈال رہا ہے۔ وہ فضول خرچی کا ہے۔ ہمارے ذرائع آمدنی بہت کم ہیں۔ لیکن بایں ہمہ ہم اپنے خرچ کو آمدنی سے کم رکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ بلکہ بیجا طور پر جھوٹی عزت حاصل کرنے کے لئے اپنا روپیہ برباد کرتے ہیں۔ لٹیروں اور ڈاکوؤں سے انسان مقابلہ کرکے یا بنکوں میں رکھ کر روپیہ بچا سکتا ہے لیکن اسراف یا فضول خرچی کے ڈاکو کے ظاہر ہونے ہی سب ہتھیار ناکارہ ہو جاتے ہیں ؎

چوروں سے زر و مال بچا سکتے ہیں رکھ بیٹھے ہیں تالے بھی لگا سکتے ہیں
بچتی نہیں اسراف سے کوڑی لیکن اس چور پہ قابو نہیں پا سکتے ہیں!

انسان کی آمدنی سے خرچ کا زیادہ ہونا اس کی تباہی کی علامت ہے غریب ہو جاتا ہے امیر۔ جب تک وہ اسراف کی بدعادت پر قابو نہیں پا سکتا اور کفایت شعاری کو اپنا شیوہ نہیں بناتا۔ وہ مصیبت کا شکار رہ کر رہیگا۔ کہا بھی ہے ؎

ہم کہیں گے کبھی نہ اسکو غریب جسکو ملتی ہو اک حقیر رقم
اصل میں وہ غریب ہے جسکا خرچ زائد ہے اور آمد کم

آمدنی سے خرچ زیادہ رکھنے کے بڑے نقصانات ہیں۔ انسان کو پھر کئی ناجائز طریقوں سے روپیہ حاصل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اور اس کے بعض اوقات بہت بُرے نتیجے بھگتنے پڑتے ہیں۔ یعنی انسان قرض میں مبتلا ہو جاتا ہے اور قرض سے

بڑھ کر انسان کی خوشی اور عزت کا کوئی دشمن نہیں ہے

دامِ بلا قرض ہے پھنسے اور ہوئے شکار   ہے پاسِ آبرو تو رہو ہوشیار تم!
گر دُرِ شاہوار ملے کوڑیوں کے مول   زنہار بھول کر بھی نہ لینا اُدھار تم!
مقروض کی نہیں ہے زمانے میں آبرو   یُوں اپنے دل میں بات بناؤ ہزار تم
پھر ہو سکے گا کوئی بھی افسوں نہ کارگر   لُقمہ کو قرض کے نہ کرو زہر مار تم!

خرچ کو بڑھانا گویا مفلسی اور تنگدستی کو خود لبیک کہنا ہے۔ آج کل فضول رسومات میں یعنی بیاہ شادی کے موقعہ پہ یا موت پر جُوں تُوں کر کے قرض اُٹھا کر بھی جھوٹی واہ وا حاصل کرنے کے لئے روپیہ بیدردی سے خرچ کیا جاتا ہے ہماری رسومات ہمارے لئے وبالِ جان ہو رہی ہیں۔ ایک تو اپنے نکماپن کی وجہ سے ہم پہلے ہی کافی تنگدست ہیں پھر شادی اور غمی کی رسوم پر فضول خرچی کر کے ہم اور بھی زیادہ ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ ہمارا اصول یہ ہونا چاہیئے ؎

خرچ کرنا ہو تو کچھ کیسہ میں بھی زر دیکھ لے   پاؤں پھیلانے سے پہلے اپنی چادر دیکھ لے
بے زری جیسی نہیں زیرِ فلک کوئی بلا!   حال کیا ہوتا ہے ہر مفلس کا ابتر دیکھ لے
اس کا لینا بھی بُرا ہے اسکا دینا بھی بُرا!   قرض لیکر آزمالے قرض دیکر دیکھ لے
تجھکو ہو شادی رچانی بیٹے بیٹی کی اگر   بک نہ جائیں گھر کے برتن گھر کا زیور دیکھ لے

بھُول کر بھی ہو نہ پابندِ رسوماتِ قدیم!
ہو گئے مفلس کئی اس میں تو نگر دیکھ لے!

ہمارے دھرم شاستروں میں بھی کفایت شعاری اور قرض نہ اٹھانے کی ہدایت ہے۔ مثلاً سِکھ دھرم کے پریم سمارگ میں لکھا ہے:-

"جو کچھ سر انجام سنجوگ کا کرے سو بنیا شکت کرے سنساری اہنکاریاں دی ریس نہ کرے۔ ایہی گھگت بیٹے والا کرے"

خرچ آمدنی تے کم کرنا۔ جو ودھیک کرلیگا۔ انت نوں حیران ہو ویگا"

ترجمہ:۔ لڑکی کی شادی کا جو شخص بھی انتظام کرے۔ اپنی بساط کے مطابق کرے دنیا کے متکبر انسانوں کی پیروی نہ کرے۔ لڑکے والے کے لئے بھی یہی واجب ہے۔ اپنی آمدنی سے خرچ کم کرے۔ جو زیادہ کریگا پریشان ہوگا۔

قران شریف کی سورت انعام رکوع ۱۷ آیت ۱۴۱ و سورت اعراف رکوع ۳ آیت ۳۱ میں اسراف یعنی فضول خرچی کے خلاف حکم ہے۔

رسول کریمؐ نے فضول خرچی سے لوگوں کو باز رکھنے کے لئے سونے چاندی کے برتنوں میں پینے اور کھانے سے منع فرمایا ہے اور ریشم پہننے اور اس پر بیٹھنے کے بھی خلاف حکم صادر کیا۔ پھر ایک حدیث میں فرمایا۔ کہ جو چاہو کھاؤ پہنو لیکن اس میں دو باتیں نہ ہوں۔ ایک تو فضول خرچی اور دوسرے فخر و تکبر۔

قرض کے متعلق پریم مارگ میں آتا ہے کہ جہاں تک بس چلے قرض نہ لیا جائے۔ کیونکہ قرض لینا بڑا پاپ ہے۔ لیکن اگر قرض لے بھی بیٹھے تو قرض خواہ کے تقاضا کئے بغیر ہی ادا کر دیوے۔ اور جب تک بےباق نہ کرے۔ تب تک نہ لذیذ کھانا کھائے نہ خوشبو لگائے۔

رسول کریمؐ نماز میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔

" یا اللہ تو مجھ کو گناہ اور قرض سے محفوظ رکھ "

ایک دفعہ آپ نے ایک آدمی کی نماز جنازہ اس وجہ سے پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ اپنا قرض ادا کئے بغیر اس دنیا سے رحلت کر گیا تھا۔

مغرب کے مشہور فلاسفر ڈاکٹر جانسن لکھتے ہیں کہ دنیا میں ہمیشہ دو قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ ایک کفایت شعار اور ایک فضول خرچ۔ جتنے عالیشان مکانات، کارخانے۔ جہاز اور دیگر بڑے بڑے کام دنیا میں بنے ہیں جن سے دنیا والوں کو فائدہ اور خوشی

حاصل ہوتے ہیں یہ سب کفایت شعار لوگوں کی مہربانی کا نتیجہ ہیں۔ برخلاف اس کے جنہوں نے فضول خرچی اپنا شیوہ بنا لیا۔ وہ ہمیشہ کفایت شعاروں کے غلام بنتے ہیں۔ قرض کے متعلق فلاسفر بنجمن فرینکلن لکھتے ہیں۔ کہ جس نے قرض اٹھایا۔ وہ رنج میں مبتلا ہوا۔ شیکسپیئر نے لکھا ہے کہ نہ قرض لینے والا بن، نہ دینے والا۔ کیونکہ قرض لینے سے اکثر روپیہ بھی جاتا ہے اور دوستی کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے اور قرض لینے سے زندگی کی کھیتی کا کنارہ ہی ٹوٹ جاتا ہے۔

انسان کا سب سے خطرناک دشمن بیکاری ہے۔ بیکار انسان بیماری کا، مفلسی کا ذلت کا شکار رہتا ہے۔ ہم لوگ زیادہ تر کاہلی اور بیکاری سے واسطہ رکھتے ہیں اور اس لئے میدان ترقی میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ ہم نے اپنی قسمت کو خود سلایا ہوا ہے۔ خود بخود بدقسمت بن رہے ہیں۔ قسمت اور خالق برتر انہی لوگوں کے مددگار ہوتے ہیں۔ کہ جو خود بخود اپنی مدد کے لئے طیار ہوتے ہیں ؎

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی — نہ ہو جسکو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا
خدا ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی خود مدد کریں — وہی دامن میں گل بھرتے ہیں جو دامن میں گل بھر لیں
حقیقت میں انہی کو زندگی کا لطف حاصل ہے — جو اپنی زندگی میں زندہ رہنے کے لئے مرلیں

اس ملک کو سستی اور ناکارہ پن نے دنیا کی نظروں سے گرا دیا ہے جب سے ہم نے قوت بازو سے کام لینا چھوڑ دیا ہے۔ ہم طرح طرح کی بیماریوں کا کھاجا بنے ہوئے ہیں۔ ہماری غریبی دوسرے ملکوں میں ضرب المثل بنی ہوئی ہے۔ ہماری مفلسی اور بدحالی کے ڈرامے اور تماشے دکھائے جاتے ہیں۔ یہ حالت زبوں اس لئے ہے کہ ہم اس درس عمل کو بھلا بیٹھے ہیں ؎

سبھی کچھ قوت بازو سے ملتا ہے زمانے میں — نوید زندگی ہے سعی و کوشش کے ترانے میں
عروس کامیابی ان سے ہم آغوش ہوتی ہے — جو نقد جستجو رکھتے ہیں ہمت کے خزانے میں

وہی بزم عمل میں کامیاب کامراں ہونگے جو ہمت اور استقلال سے دائم رواں ہونگے

فردوسی نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

کہ اندر جہاں سود بے رنج نیست کسے را کہ کاہل بود گنج نیست
زناں را ازاں نام نائید بلند کہ پیوستہ در خفتن و خوردن اند

اور بھی کہا ہے ؎ :

ہر کہ عمل نہ کرد و امید عنایت داشت دانہ نکشت و خرمنے را انتظار کرد
گنجے بے مار و گلے بے خار نیست شادی بے غم در ایں بازار نیست

ترجمہ :- "اس دنیا کے اندر بغیر تکلیف کے کوئی نفع حاصل نہیں ہوتا جو کوئی ناکارہ ہوتا ہے۔ وہ دولت نہیں پا سکتا۔ عورتوں کا نام اس لئے مشہور نہیں ہوتا۔ کہ وہ کھانے اور سونے سے ہی کام رکھتی ہیں۔" "جس کسی نے عمل نہ کیا اور بازیافت کی امید رکھی اسکی مثال وہی ہے کہ بیج تو بویا نہیں اور پیداوار کی انتظار رکھی۔ کوئی خزانہ نہیں جہاں سانپ نہ ہو۔ کوئی پھول نہیں جہاں کانٹا نہ ہو۔ اس دنیا میں بغیر تکلیف اٹھائے کوئی خوشی حاصل نہیں ہو سکتی۔"

عزت کام کرنیوالوں کے ہی حصے میں آتی ہے دولت مردانِ کار کا ہی ورثہ ہوتا ہے کام کرنیوالے بہت قابلِ قدر ہوتے ہیں۔ مسٹر بنجمن فرینکلن کہتے ہیں کہ ایک کسان اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا ایک دوزانو جنٹل مین سے کہیں اونچا درجہ رکھتا ہے۔ مشہور فلاسفر رسکن لکھتا ہے۔ کہ جب میں کسی نوجوان کی لیاقت کا شہرہ سنتا ہوں۔ تو پہلا سوال جو میں پوچھا کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ وہ کیا کچھ کام کرتا ہے؟

پس اگر ہم اپنے ملک کو ذلت سے نکالنا چاہتے ہیں اگر اپنا۔ اپنی قوم کا۔ اپنے ملک کا نام روشن کرنا چاہتے ہیں۔ اگر دنیا میں کچھ بننا چاہتے ہیں۔ اگر چاہتے ہیں۔ کہ کیڑوں مکوڑوں کی موت نہ مریں۔ اور ہمارے مرنے کے بعد بھی کوئی ہمارا نام نیکی سے یاد

کرے تو اس گیت کا مفہوم یاد رکھیں اور اسکو اپنی زندگی میں عملی جامہ پہنائیں ؎

بے کار ہے بیمار ہے — پھر کیا کرے؟ نادار ہے
کر کار پھر آرام کر! — محنت میں صبح و شام کر!
پیدا جہاں میں نام کر — کچھ فکر نیک انجام کر!
ہے صرف محنت مدعا — مطلب تجھے ثمرے سے کیا
ثمرہ تجھے دیگا خدا — بھر جائیگا دامن ترا
بڑھ جائیگی ہمت تری — صحت تری دولت تری
عزت تری عظمت تری — رفعت تری شوکت تری
اے کار تیرا مرتبہ — ممنون ہے کس شخص کا
اللہ ہی ہے مشکل کشا — محنت سے ہو جا خود بڑا

اگر غفلت سے ہم اس وقت تک ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ ہم اپنے لئے نام پیدا نہیں کر سکے۔ نہ ہم نے کچھ اپنا بنایا ہے نہ کسی اور کا۔ تو کم از کم اب نیند سے بیدار ہو جائیں اور اپنے فرض کی پہچان کر کے سستی اور کاہلی میں فضول باتوں میں اور جھگڑوں میں بے فائدہ کشمکش میں اپنا وقت ضائع نہ کریں بلکہ میدانِ عمل میں کود پڑیں ؎

اگر غفلت سے اب تک کچھ نہیں تو نے کیا غافل — تو اس خوابِ گراں سے چونک آئندہ نہ ہو غافل
بڑھے جاتے ہیں ساتھی ہمسفر نزدیک ہے منزل — یہ فرصت بھی غنیمت ہے اگر کرنا ہے کچھ غافل

اولوالعزمانِ دانشمند جب کرنے پہ آتے ہیں
سمندر چیرتے ہیں کوہ سے دریا بہاتے ہیں

نہ صرف اس دنیا کی کامیابی میدانِ عمل میں پورا اترنے سے ملتی ہے بلکہ آخرت اور عاقبت کا مدار بھی عمل پر ہی ہے۔ وہاں پر بھی اعمال کی ہی پرسش ہوگی ؎

ہم جو کچھ بیاں کرتے ہیں ہوتا ہے حساب اسکا — محاسب ساتھ رہتا ہے کیا جو کچھ وہی لکھا،

پہنچتا ہے مرتب ہوکے جب دفتر وہ سیاہا ثمر ملتا ہے اسکا جس شجر کا بیج بو یا تھا
وہاں تو پائے عزت ایسا کچھ ساماں مہیا کر پشیماں ہو گذشتہ غفلتوں سے اب نہ سویا کر

لیکن وہاں کونسے افعال ہیں جو مالک کی نظر میں پسند ہونگے۔ وہ کونسی جنس ہے جسکی کھیپ یہاں سے بھرنے کی ضرورت ہے وہ کونسی پونجی ہے جو ساتھ جائیگی۔ وہ کونسا توشہ ہے جو اس دنیا کو چھوڑنے پر بھی ساتھ جائیگا وہ کونسے اعمال ہیں کہ جن کی وجہ سے وہ مالک اپنے بندوں کو اونچے درجے بخشیگا وہ یہ اعمال ہیں ؎

تیرے آئینے ہوں سب سفیران چمن شاداں چلن تیرا عزیز دل ہو اُن کا او رسرور جاں
تو ہر اک حال میں ان کا شریک ہمنوائی ہو دلوں میں انکے جا ہو تیری سینوں میں سمائی ہو
کریں ہم اپنے ہمجنسوں کی خدمت اسدہ شاداں ہو ہم اپنے بھائیوں سے صاف دل رکھیں وہ فرحاں ہو
جب اس شفقت سے ابر فیضِ یزداں قطرہ افشاں ہو ہمارا مزرعۂ دل کیوں نہ رشکِ صد گلستاں ہو

انسان کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنانے کے لئے مندرجہ ذیل خیالات کو اپنے سامنے رکھنا چاہیئے ؎

غفلت نہ ہو اور کینہ و بغض و حسد نہ ہو جھگڑا نہ ہو لڑائی نہ ہو رد و کد نہ ہو
بھائی کی پیٹھ پیچھے کبھی ذکرِ بد نہ ہو انساں مثالِ صفتِ دام و دد نہ ہو
غفلت سے اس جہاں میں سارا فساد ہے غفلت کو آؤ مار ہٹائیں جہاد ہے!
مخلوق ذی شعور ہے تو ہوشیار رہ مت طالب نگارِ زندگی مستعار رہ!
دنیا کا کاروبار کر اور دیندار رہ امیدوار رحمتِ پروردگار رہ!
کس نے کہا ہے تجھ سے کہ دنیا کو چھوڑ بیٹھ بس ایسی باتیں اپنی طرف سے نہ جوڑ بیٹھ

نیک انسانوں کی خواص اور نیک بننے کے لئے اوصاف ایک فارسی شاعر نے اس طرح سے بیان کئے ہیں ؎

ہر کہ باشد اہلِ ایماں اے عزیز پاک دارد چار چیز از چار چیز

از حسد اوّل تو دل را پاک دار — خویشتن را بعد ازاں مومن شمار
پاک دار از کذب و از غیبت زباں — تا کہ ایمانت نیفتد در زیاں
پاک گردانی عمل را از ریا! — شمعِ ایمانِ ترا باشد ضیا
چوں شکم را پاک داری از حرام — مردِ ایماں دار باشی والسلام
ہر کہ دارد ایں صفت باشد شریف — ورنہ دارد در دِ ایمانِ ضعیف

ترجمہ:۔ اے پیارے جو انسان سچا ایماندار بننا چاہتا ہے اسے چار چیزوں کو چار چیزوں سے پاک رکھنا چاہیئے۔ اول تو اپنے دل کو حسد سے پاک و صاف رکھے۔ کیونکہ اس کے بعد ہی وہ اپنے آپ کو ایماندار کہہ سکتا ہے (یعنی حسد کے رہتے ہوئے انسان ایماندار نہیں بن سکتا) دوم زبان کو جھوٹ اور چغلخوری سے پاک رکھے "تاکہ ایمان گھاٹے میں نہ پڑ جائے" سوئم اپنے اعمال کو مکاری سے پاک رکھے۔ "تاکہ ایمان کی شمع زیادہ روشن ہو۔ چوتھے جب اپنے پیٹ کو حرام کی کمائی سے پاک رکھے گا۔ تو بلا شبہ ایماندار آدمی بن جائے گا۔ جو انسان یہ اوصاف اپنے اندر رکھتا ہے وہی شریف کہلاتا ہے۔ ورنہ اگر وہ کہتا ہے۔ کہ وہ ایماندار ہے تو وہ کچا اور کمزور ایمان ہے۔ اس قسم کے لائحہ عمل سے ہی زندگی کامیاب ہو سکتی ہے۔

تمت بالخیر

صابر پرنٹنگ پریس کپورتھلہ میں چھپوا کر رنگیل پبلشنگ کمپنی نے شائع کیا۔